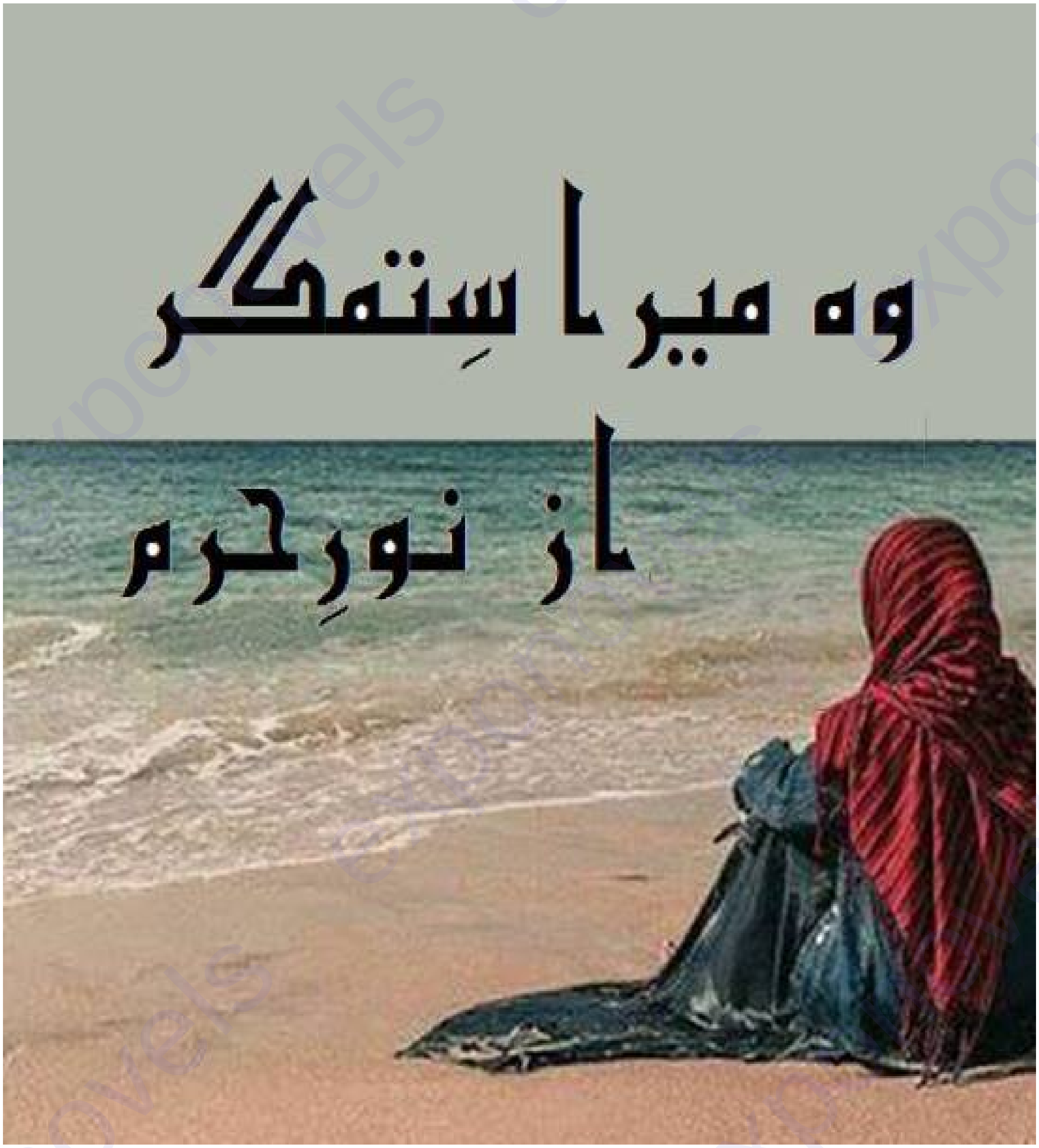
وہ میرا سِتمگر
از نورِحرم

وہ میرا ستمگر

(ناول)

زمر الٰہی (نورِ حرم)

اُففف۔۔۔دیکھو ذرا اس مست کو کس طرح دیوانوں کی طرح بھنگڑا ڈال رہا ہے۔

وہ دونوں اس وقت لاہور کی مشہور شہراہ پہ سخت بارش سے بچنے کے لیے ایک بڑے سے درخت کی چھتری کے نیچے کھڑی ایک سٹوڈنٹ کو بارش میں ناچتے ہوئے دیکھ کر ہنس رہی تھیں۔

تمہاری طرح کا کوئی منچلا لگ رہا ہے۔ماہ نور نے ہنستے ہوئے۔فرح کے پہلو میں چٹکی کاٹی تھی۔اور اس منچلے کے 'ع' عجیب و غیرب ڈانس سے شغف اُٹھاتی فرح نے نہایت غضب میں ماہ نور کو دو ہتھڑ لگائے تھے۔وہ اس آفت پہ محض کندہ سہلا کر رہ گئی تھی

گوری موٹی بھینس۔اب کی بار وہ منہ میں بڑبڑائی تھی۔

کیا مصیبت ہے ماہا۔آخر کب تک اس طرح یہاں کھڑے رہیں گے یار۔وہ دونوں درخت کے نیچے کھڑی ہونے کے باوجود بھی بارش کے منہ زور قطروں سے بچ نہیں پائیں تھیں۔اور اب بالکل بھیگی کھڑی تھیں۔

اب میں کیا کروں بتاؤ مجھے۔اس میں میرا کیا قصور اگر ڈرائیور انکل کی کار خراب ہو گئی تو۔اس نے اپنے چاروں اور لپٹی گیلی سیاہ چادر کے بڑے سے پلو کو نچوڑتے ہوئے اپنے ڈرائیور کو منہ میں ہزاروں کوسنے دیتے ہوئے کہا تھا۔

یار کہو کچھ نہیں بس اللہ کا واسطہ ہے۔ کوئی ٹیکسی، رکشہ یا بس پکڑ لو۔۔۔ پندرہ منٹ سے کھڑی ہوں اب اور ایک منٹ بھی کھڑی ہوئی تو اماں سے گر جاؤں گی۔

گر نہیں جاؤں گی بولو ڈھیے جاؤں گی۔ کندھے کے درد میں ابھی بھی کوکمی نہیں آئی تھی۔ اس لئے جل کر جواب دیا تھا۔ وہ اب بس خاموشی سے ٹانگے سہلاتی رہی۔

ساری غلطی میری ہے۔ جو سودا کے دیوانوں کی طرح۔ تمھارے کہنے پہ کار گھر ہی چھوڑ آئی۔ اتنی جو تمہیں پڑھائی کی فکر کھائے جارہی تھی۔ تو کل اسائینمنٹ جمع کروا دیتی۔ اب مرو اس بارش میں ساتھ مجھ بے وقوف کو بھی مارو جو تمہارے کہنے پہ چل پڑی غصے سے اس کا منہ پھول چکا تھا۔ اور اب رہ رہ کر اسے موٹی فرح پہ غصہ آرہا تھا۔ اوپر سے کوئی سواری مل کے نہیں دے رہی تھی۔ جو گزر رہی تھیں وہ سب بھری ہوئی تھیں۔

بسسس۔۔۔ غضب خدا کا جیسے ساری غلطی ہی میری ہے۔ میرا کام تو تھا ہی پندرہ منٹ کا۔ بعد میں تم ہی تھی جو کینٹین کے سموسے کھانے بیٹھ گئی تھی۔ اور اب سارا نزلہ مجھ غریب پہ نکال رہی ہو۔ نفرت ہے مجھے ایسے لوگوں سے۔ وہ بھی کہاں چپ رہنے والی ہڈی تھی۔

ہاں تم نے بیچاری نے کونسا کبھی سموسے کھا کر دیکھے ہیں۔ خیبر پختونخواہ کی گوری بھینس۔ اسے جب بھی اس پہ غصہ یا پیار آتا تو وہ ہمیشہ اسے ایسے ہی لفظوں سے پکارتی تھی۔ سخت بارش میں بھیگنے کے باوجود بھی وہ دونو چونچ لڑانے سے بعض نہیں آرہی تھیں۔ کجا کہ کوءی حل نکالنا۔

اللہ تمہارا بھلا کرے۔ بچے جو تم مجھے لے آئے۔ اللہ پاک میرے بچے کو ہزاروں کامیاباں دے آمین۔ محبت سے انہوں نے اس کے دائیں کندھے کا بوسہ لے کر چھوڑا تھا۔۔۔ ان کے اس پوتے میں توان کی جان بستی تھی۔ جو ان کی خاطر اپنے قیمتی وقت کی بھی پروا نیں کرتا تھا۔ آج بھی وہ اپنی ضروری میٹنگ چھوڑ کر انہیں ماہوار چیک اپ کے لئے لے آیا تھا۔

For more visit (exponovels.com)

دادی جان میری تو جان بھی آپ پہ قربان وقت نکالنا تو پھر معمولی بات ٹھری۔اس نے کار کا سٹیر نگ گھماتے ساتھ ان کے گرد بازو حمائل کیا تھا۔

اللہ میرے بیٹے کو سلامت رکھے۔ارے بچے آرام سے دیکھو ذرا کتنی تیز بارش ہو رہی ہے۔اُنھوں نے ایک فکر بھری نظر شیشے سے باہر ڈال کر اسے تاکید کی۔اور پھر کچھ یاد آجانے پہ سیدھی اس کی طرف گھوم کر دیکھنے لگیں۔

ذریت۔۔۔ان کی تھکن زدہ آواز پہ وہ چونکا۔

جی۔۔۔ایک نظر ان کی طرف دیکھ کر اس نے اپنی نظروں کو واپس سڑک کی طرف گھما لیا تھا۔

تم آذر کی امی سے دوبارہ ملے تھے۔ان کی بات پہ اس کے چہرے کے تاثرات تن گئے تھے۔نہیں۔۔۔

دادی نے افسردگی سے اپنے وجیہہ سے پوتے کو دیکھا تھا۔

تمھیں ان کے پاس جانا چاہیے بیٹے۔۔۔

میں اس کی ماں کی سسکیاں نہیں سن سکتا۔مجھے لگتا میرا دل پھٹ جائے گا۔اس کے سپاٹ لہجے میں بھی دکھ ہلکورے لے رہا تھا۔

ہاں ٹھیک کہتے ہو۔تھا بھی تو بہت پیارا وہ۔ایک سرد سی آہ نکلی تھی ان کے دل سے۔

انہوں نے اس کو اپنے دانتوں کو بھینچتے دیکھ کر دکھ سے چہرا ونڈو کی طرف موڑ لیا۔ان کے اس پوتے نے زندگی کو بہت بے رحمی سے جیا تھا۔وہ کبھی بھی عام بچوں جیسا نہیں رہا تھا۔اس کی سنجیدگی بچپن سے لڑکپن تک اور پھر جوانی تک ساتھ ساتھ رہی تھی۔اور اب تو یہ حال تھا کہ وہ مسکراتا بھی جیسے عید کے عید تھا۔اور اب یہ واقع جس نے اسے گم سم سا کر دیا تھا۔

ان کی آنکھیں نم ہوءیں تھیں۔انہوں نے اپنی سفید چادر سے آنکھیں رگڑتے یوں ہی سڑک کے گرد جھنڈ کی طرف دیکھا۔اور بے اختیار انہوں نے کار رکوا دی۔

کیا ہوا؟۔۔۔آپ ٹھیک تو ہیں؟ان کے اس طرح کار رکوانے پہ وہ پریشان ہوا تھا۔وہ کھڑکی سے باہر دیکھتے اس کی سمت ہلکا سا موڑی تھیں۔

ارے۔۔۔میری تعبیت تو ٹھیک ہے۔جاؤ تم ان بیچاری بچیوں کو بلا لاؤ۔دیکھو بیچاری کیسے بھیگی کھڑی ہیں۔ہم انہیں لفٹ دے دیتے ہیں۔اس نے ذرا آگے جھک کر اس جانب دیکھا جہاں وہ سیاہ سکارفس اور سیاہ ہی چادروں والی لڑکیاں کھڑی بارش میں بھیگ رہی تھیں۔

رہنے دیں دادی خود ہی چلی جائیں گی۔اور اگر اتنی ہی بیچاری تھیں تو آرام سے گھر میں بیٹھتیں۔اس نے سپاٹ سے انداز میں کہہ کر کار آگے بڑھانی چاہی تھی۔جب وہ ان کی ڈانٹ سن کر محض گہری سانس لے کر رہ گیا تھا۔

ذریت حسن اب اگر تم نے ایک لفظ بھی اور بولا تو۔میں تمہیں گاڑی سے باہر نال دوں گی۔اور یاد رکھنا میں ایسا کر بھی سکتی ہوں۔چلو جاؤ اب۔اور ہاں یہ بولنا کہ آپ دونوں کو میری دادی جان بلا رہی ہیں ذرا بات سُن لیں۔پھر وہ آجائیں گی۔

جی۔۔۔وہ کوفت ذدہ سا باہر نکلا تھا۔دادی جان مسکرا کر ان دونوں لڑکیوں کو دیکھنے لگی۔جو عمر میں ۱۹ سے بمشکل زیادہ لگ رہی تھیں۔

بات سنو۔۔۔وہ دونو اس کی طرف مڑی تھیں۔تم دونو کو میری دادی جان ادھر گاڑی میں بلا رہی ہیں۔جاؤ بات سن لو۔کیا لٹھ مارتا انداز تھا۔وہ دونوں اس کے انداز کو دیکھ کر رہ گئی تھیں۔

یہ ہمیں حکم دے رہا ہے۔ماہ نور کو بُرا لگا۔مگر پھر وہ جوان کا جواب سنے بغیر مڑ گیا تھا۔اس کے پیچھے چل پڑی۔کہ کیا پتہ جاننے والے نہ ہوں۔

اس نے سخت ناگواری سے اپنے سوٹ پہ پڑے بارش کے قطروں کو دیکھا اور پھر دروازہ کھول کر بیٹھ گیا۔اسے سخت نفرت تھی بارش سے۔یعنی اسے برسات کا موسم ہی سخت بُرا لگتا تھا۔جب ہر چیز گیلی اور نم سی ہو جاتی ہے۔

اسلام علیکم۔۔وہ دونو حیرانی سے اس بوڑھی عورت کو پہچاننے کی کوشش میں کھڑکی کے قریب ہوئیں۔چہرہ غیر شناسا تھا۔مگر اس عورت کے چہرے کی نرمی اور لہجے کی نرمی خاصی متاثر کن تھی۔

ارے بچو بارش میں اب اور مت کھڑے ہو آؤ بیٹھ جاؤ میں تمہیں چھوڑ دیتی ہوں۔آؤ بیٹھ جاؤ۔ذریت نے دادی کے اشارے پہ پیچھلا دروازہ بھی کھول دیا تھا۔

نہیں آنٹی جی شکریہ ہم چلے جائیں گے۔وہ دونوں یک زوبان بولی تھیں۔اب چہرے کی نرمی سے متاثر ہو کر وہ کسی کی گاڑی میں بیٹھنے سے تو رہیں۔

ارے بچے تم لوگ مجھے اپنی دادی جان ہی سمجھو۔اور بے فکر ہو کر بیٹھ جاؤ۔چلو شاباش۔انہیں ان کا اس طرح احتیاط کرنا اچھا لگا تھا۔

ذریت نے سخت ناگواری سے ان دونوں کو دیکھا تھا۔جو نہ جانے کیا سوچ رہی تھیں۔

ماہ نور نے اس عورت کے چہرے کو غور سے دیکھا۔جہاں محبت اور نرمی واضح دیکھائی دے رہی تھی۔اور پھر فرح کا ہاتھ پکڑ کر پیچھلے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔مگر بیٹھی وہ اب بھی نہیں تھیں۔

کیا کریں بیٹھ جائیں۔اس نے مڑ کر فرح سے پوچھا تھا۔جس کے چہرے سے تھکاوٹ ٹپک رہی تھی۔

بیٹھ جاؤ یار۔میں نے صبح آیت الکرسی پڑھلی تھی۔تم بھی پڑھلینا۔ماہ نور اس کی بات سن کے دل سے مسکائی تھی۔اور پھر دونو آگے پیچھے گاڑی میں سوار ہو گئیں۔

شکریہ آنٹی جی۔بیٹھتے ہی ٹانگوں کو سکون ملا تھا۔وہ دونو کہیے بنا نہ رہ سکی۔

ارے بچو شکریہ کیسا۔تم لوگ تو میری مریم جیسی ہو۔ذریت نے چونک کر ان کو دیکھا تھا۔وہ کیسے کسی کو مریم آپی سے کمپیر کر سکتی تھیں۔

مریم کون؟۔۔۔فرح کے منہ سے بے ساختہ نکلا تھا۔

For more visit (exponovels.com)

دادی نے مڑ کر ان دونوں معصوم اور شفاف سے گیلے چہرے والی لڑکیوں کو دیکھا تھا۔جو بالکل بھی نروس نہیں دکھ رہیں تھیں۔

وہ میری بڑی پوتی ہے۔آجکل وہ فرانس میں اپنے شوہر کے پاس ہوتی ہے۔ان کے لہجے میں افسردگی عود آئی تھی۔

اچھا۔۔وہ دونو سر ہلا گئیں۔اب وہ اور کیا بولتیں۔

آپ دونوں کا کیا نام ہے۔؟انہیں وہ دونو پُر اعتماد سی اچھی لگی تھیں۔

میرا نام ماہ نور ابتسام اور یہ فرح خان۔ماہ نور نے اپنا اور فرح کا تعارف کروایا تھا۔

ماشاءللّٰہ بہت پیارے نام ہیں۔

کس کلاس میں ہیں میری بچیاں ؟ان کا محبت سے بھرا انداز دیکھ کے وہ دونوں حیران اور متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ پائیں تھیں۔ایسی خالص محبت کہاں ملتی ہے آجکل۔۔۔

ایکچلی آنٹی میں اور فرح بی۔اے کی سٹوڈنٹ ھیں۔اور آجکل اگزمز کی فکر میں ہلکان ہیں۔وہ مسکرائیں تھیں۔

ہاں میں سمجھ سکتی ہوں۔جب بھی ذریت اور مریم کے امتحانات ہوتے تھے۔تب مجھے ان سے زیادہ ٹنشن میں ہوتی تھی۔لیکن شکر اللہ کا اچھا وقت گزرا۔۔۔آنٹی اپنے ڈرائیور سے بولیں یہاں سے لیفٹ لے لے۔۔۔وہ اس قدر تیزی سے بولی تھی۔کہ پہلے تو خاموشی چھا گئی۔اور پھر دادی جان کا ایک بے ساختہ قہقہ تھا۔جس نے فرح کو تو شرمندہ کر دیا تھا۔البتہ وہ ڈھیٹ بنی دیکھتی رہی تھی۔جیسے پتا نہیں کیوں ہنسی ہیں۔اور زریت محض کھول کر رہ گیا تھا۔اس چھٹانک بھر کی لڑکی کی زبان کتنی لمبی تھی۔سر میں درد کر دیا تھا۔سخت زہر لگی تھی اسے یہ لڑکی۔

اور پھر فرح نے باقی کا رستہ اسے چٹکیاں کاٹیں تھیں۔اور اترتے وقت بھی گھور کہ اتری کہ تمہیں تو میں پوچھوں گی۔

دادی کو وہ کوسِ قضاء سی لڑکی بہت دلچسپ لگی تھی۔

For more visit (exponovels.com)

اور پھر اس کو گھر اتارتے وقت اس سفید اور سبز ٹائلوں والی بڑی سی کوٹھی کو ذہین کی یاداشت پہ نقش کر لیا تھا۔ کیا پتہ قسمت ساتھ دے جائے۔ان کی نظریں پُرسوچ تھیں۔ پہلو میں بیٹھے ذریت حسن نے غور نہیں کیا تھا۔ وہ اب بس گھر جا کہ سر درد کی دوا کھانا چاہتا تھا۔

For more visit (exponovels.com)

آج آپ گاڑی گھر چھوڑ گئیں تھیں۔ بابا نے کوفی کا گھونٹ لے کر اس سے پوچھا تھا۔

جی۔۔۔ وہ ٹانگ پہ ٹانگ جمائے اس وقت پاؤں جھلاتے ہوئے ڈرامہ دیکھنے میں خاصی مگن تھی۔ اس لیئے مختصر جواب دیا۔

اور ڈرائیور بتا رہیے تھے کہ گاڑی بھی خراب ہو گئ تھی۔ تو پھر آپ واپس کیسے آئیں؟ انہوں نے ایک اور کافی کا گھونٹ لے کر اس سے پوچھا تھا۔ وہ بھی فوراً سیدھی ہوئی تھی۔ اور ٹی وی کی آواز بھی کم کر دی۔

وہ بابا جب ہم کالج سے نکلے تو خاصی تیز بارش ہو رہی تھی۔ ہم نے سوچا کہ کوئی سواری لے لیتے ھیںؑ۔ لیکن آدھا گھنٹا کھڑے رہنے پہ بھی ہمیں کوئی سواری نہیں ملی تو۔۔۔ وہ رکی۔۔۔

تو؟ وہ کوفی پیتے اسی کی طرف متوجہ تھے۔

تو بابا ایک آنٹی سے ہم نے۔۔۔ لیفٹ لی۔۔۔ تو انہوں نے ہی فرح کو ہوسٹل اور مجھے گھر ڈراپ کیا تھا۔ اس نے بات خاصی تمہید کے بعد پوری کی تھی۔ وہ کافی پی چکے تھے۔ انہوں نے ذرا جھک کر سیاہ مگ شیشے کی شفاف میز پہ نرمی سے رکھا اور پھر سیدھے ہوئے۔

ان کے ساتھ کوئی اور بھی تھا۔ ویسا ہی نرم انداز

جی تھا۔ ان کا ڈرائیور۔۔۔۔ یہاں اس نے کچھ ملاوٹ کی تھی۔

ہم۔۔۔ انہوں نے گلا صاف کیا تھا۔

نیکسٹ ٹائم بیٹا آپ ایسے نہیں کریں گی۔۔۔

وہ بابا وہ آنٹی بہت اچھی تھیں۔ وہ منمنائی۔

اور اسی لیئے آپ بیٹھ گئیں۔ دیکھو بیٹا کسی کے چہرے پہ نہیں لکھا ہوتا وہ کیسا ہے۔ خاص طور پہ جس سے ہم ملے ہی پہلی بار ہوں۔ اور پھر دیکھیں آجکل حالات کتنے سیریس چل رہیے ہیں۔ بس ہم خود کو جتنا بچا لیں بہتر ہے۔

ان کا انداز بہت پیارا تھا۔ وہ ان کے پہلو کے سنگل صوفے سے اُٹھ کر ان کے برابر انکے کندھے پہ سر رکھ کر بیٹھ گئی۔

سمجھ گئی بابا۔۔۔ نیکسٹ ٹائم ایسا نہیں ہو گا۔۔۔ اسنے ان کے کندھے پہ بوسہ لیا تھا۔ ابتسام فاروق نے بھی مسکرا کر اپنی بیٹی کے گرد بازو ہمائل کر لیے۔ ان کی تین اولادیں تھیں۔ بڑا بیٹا ابرار پھر اس سے چھوٹا زبابر اور سب سے چھوٹی انکی جان انکی گڑیا ماہ نور۔ جس کو ہمیشہ انہوں نے سرد گرم سے بچائے رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی تھی۔ اس لیئے نصحیت کرتے تھے۔

بابا۔۔۔ مجھے لگتا میں اس دفعہ فعیل ہو جانا۔ وہ اس کی بات سن کہ مسکرائے تھے۔ آپ ہمیشہ ایسے ہی بولتی ہو۔ پھر اے پلیس گریڈ لے لیتی ہو۔

ماہا بیٹی آپ کا فون۔۔۔ کافی دیر سے کیچن میں بج رہا تھا۔ ملازمہ آنٹی نے فون اس کی طرف بڑہا دیا۔ وہ بھی فوراً سے سیدھی ہوئی۔ بھائی ہوں گے۔۔۔۔ لیکن پھر فرح کی کال نے ساتھ ہی ٹھنڈا بھی کر دیا تھا۔

اس موٹی کو اب کیا مسّلہ ہے۔ اس نے منھ بگاڑ کر کہا تھا۔ بابا سن چکے تھے اس لیئے ٹوکے بغیر نہ رہ سکے

بہت بری بات ہے بیٹا۔۔۔

۔ وہ سوری بابا کہہ کہ بھگتی سیڑھیاں چڑھ گئ۔۔۔

کیا مسّلہ ہے۔ جب سے تم نے فون لیا ہے۔ میری تو ناک میں دم کر دیا ہے۔ لگتا بتانا ہی پڑے گا انکل کو۔۔۔ اینڈ کی بات اس نے مزاق میں کی تھی۔ کہ جانتی تھی کہ اس نے فون چھپ کر لیا تھا۔

رات کب کا اپنا سیاہ آنچل ہٹاتی جا چکی تھی۔ وہ بستر پہ بیٹھی تسبیح پڑھنے کے ساتھ ساتھ ایک افسردہ سی نظر کمرے کے مغرب کی جانب بنی بڑی سی قد آدم کھڑکی سے باہر بنے گیراج کی طرف بھی ڈال رہیں تھیں۔ رات ۱۲ بجے کے قریب وہ آیا تھا۔ اور ۴ بجے پھر دفتر چلا گیا تھا۔ اس پوتے نے انہیں بہت تنگ کر رکھا تھا۔

کیا کروں میں اس بچے کا۔۔۔ بس ہر وقت کام کام اور بس کام۔ مجال ہے جو یہ ذرا وقت پہ کھانا کھا لے۔ اب پتہ نہیں رات کو بھی کچھ کھایا تھا یا نہیں اور صبح منہ اندھیرے بھی ویسے ہی چلا گیا۔ ان کو رہ رہ کر فکر ہو رہی تھی۔

ظفر۔۔۔ ظفر بچے او کدھر ہو۔ انہوں نے ملازم لڑکے کو بلند آواز میں پکارہ تھا۔

جی دادی جی۔ اس نے گیلے ہاتھ صاف کرتے اندر جھانکا۔

یہ ذریت نے رات میں کچھ کھایا تھا۔ یا پھر بھوکا ہی سو گیا میرا بچہ۔ تسبیح پہلو میں رکھ کر انہوں نے اکھٹی کی ٹانگیں بھی دراز کیں۔

پتہ نہیں دادی جی۔ میں تب سو چکا تھا۔ بھائی جی کا پتہ نہیں کب آئے۔ اور پھر کب گئے۔

دادی جان نے محض سر ہلایا تھا۔ وہ اس وقت کچھ سوچنے میں مصروف تھیں۔

دادی جان میں تو کہتا ہوں بھائی جی کی شادی کروا دیتے ھیں۔ پھر دیکھیے گا کیسے وقت پہ گھر بھی آیا کریں گے۔ اور کھانا بھی کھایا کریں گے۔ وہ وہیں پسکڑا مار کر بیٹھ گیا تھا۔

ہاں مجھے بھی یہی لگتا۔ پر تمہارے بھائی جی مانیں تب ناں۔ کچھ لمحے پہلے ان کا چہرا جو کھل گیا تھا۔ یک دم بجھ بھی گیا تھا۔

لیں دادی جان وہ کونسا مسّلہ ہے۔ ظفر نے ناک سے مکھی اُڑائی۔ اپنی مریم باجی ہیں نہ۔ وہ منا لیں گی بھائی جی کو۔۔۔ ظفر ۸ سال سے ان کے ہاں ملازم تھا۔ میٹرک بھی اس نے دادی جان کہ کہنے پہ یہیں سے کیا تھا۔ اور پھر دادی جان ہی تھیں جنہوں نے اس کی مرضی سے اس کی خالہ کی بیٹی سے رشتہ کیا تھا۔ وہ اچھے سے جانتا تھا۔ کہ یہ جو ذریت بھائی جی ہیں ان کو صرف مریم آپی ہی لائن پہ لا سکتی ہیں۔ اس لیئے جھٹ سے مشورہ دے ڈالا۔

لیکن دادی جان بھابی جی ہوں گی تو شادی ہو گی۔ایک اہم بات جسے یاد آنے پہ بولا تھا۔

ارے بھئی وہ بھی اللہ دے دے گا۔۔۔ جاؤ تم مجھے میرا فون لا کر دو۔وہ خاصی پرُجوش ہو کر بولی تھیں۔وہ سر ہلاتا باہر گیا۔اور پھر اگلے ہی لمحے فون پہ نمبر ملا کر وہ انہیں پکڑا چکا تھا۔

گھنٹی جا رہی تھی۔

اچھی بھلی زندگی سکون میں تھی۔ پھر یہ امتحانات پتہ نہیں کہاں سے آ گئے۔ وہ لون میں بیٹھی اس وقت شام میں ڈوبتے نارنجی سورج کو دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔نارنجی سورج سے چھٹنے والی کرنیں بھی نارنجی ہی تھیں۔ جنہوں نے مغرب کی سمت کے آسمان کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔اوراب اس سمت کا دور نگا آسمان خاصا دلکش لگ رہا تھا۔

چند دن رہ گئے تھے امتحانات میں اور پڑھنے کو دل نہیں کرتا تھا۔کتابوں کو دیکھتے ہی جان جانے لگتی تھی۔

اور حال یہ کہ ٹنشن سے اس کا رنگ پیلا پڑ چکا تھا۔ بابا نے اس کے پیلے چہرے کو دیکھتے ہی سمجھ لیا تھا کہ وہ امتحانات کی ٹنشن کو سر پہ سوار کر چکی ہے۔وہ اس کے پاس گھنٹہ بیٹھے سمجھاتے رہیے تھے۔کہ ٹنشن لینے سے کچھ نہیں ہو گا۔میں اپنی بیٹی کے لیئے دُعا بھی کروں گا اور اس کے ساتھ رات میں جاگوں گا بھی۔انہوں نے شفقت سے اس کا ماتھا چوم کر کہا تھا۔لیکن شرط یہ کہ ٹنشن نہیں لینی۔ ورنہ اینڈ میں جو پڑھا لکھا ہو گا سب غائب۔۔۔

نہیں بابا آپ نے صبح آفس بھی تو جانا ہوتا۔کوئی بات نہیں میں ٹھیک ہوں اس نے فکر سے ان کا ہاتھ پکڑ کر کہا تھا۔وہ دل کے مریض تھے اور ان کے لیئے رات جاگنا بلکل بھی ٹھیک نہیں تھا۔

چلو اس بات کا بھی فیصلہ ہو جائے گا۔ لیکن خیر بات وہیں رہی کہ ڈھاک کہ تین پات۔۔۔ ٹنشن بیگم کم کیا ہونی تھی اور بڑھ گئی تھی۔

اس نے گہری سانس لے کر دماغ کو پرُسکون کرنا چاہا۔اور پھر قدم اندر کی جانب بڑھا دیے۔

ابھی وہ لاؤنج کے داخلی دروازے کو دھکیلنے والی تھی۔جب باہر کا گیٹ تیز آواز سے کھولا تھا۔اس نے مڑ کر دیکھا تو فرح کو اندر داخل ہوتے اور پھر اپنی طرف آتا دیکھ کر وہ کھل گئی تھی۔ہفتے بعد جو ملاقات ہو رہی تھی۔

ہائے موٹی تم۔۔۔اگر قارئین کو لگ رہا ہے کہ فرح خان موٹی تھی۔تو ایسا بالکل بھی نہیں تھا۔وہ اتنی ہی خوبصورت اور سمارٹ تھی۔جس طرح کے لڑکیاں فرحت اشتیاق کے ناولز اور ڈراموں میں ہوتی ہیں۔یہ تو محض اس کا نام تھا۔

سلام نہ دُعا اور ملتے ہی شروع۔۔اُس نے بے زاری سے منہ بگاڑ کر کہا تھا۔

اچھا سوری یار۔وہ بڑھ کر اس کے گلے لگی۔

بس اب یہیں کھڑی رکھو گی۔

ہاں چلو آؤ۔۔۔وہ شرمندہ ہوتی اسے ساتھ لیئے اندر کی جانب بڑھ گئی تھی۔اور ملازمہ آنٹی کو جوس کا بول کر اسے لیے کمرے کی طرف بڑھ گئی تھی۔

کمرے میں چار سو نفاست تھی ایک سوائے اس کے بیڈ کے جہاں کتابیں بکھری پڑی اپنی بے حُرمتی پہ اپنے مالک کو کوسنے دے رہیں تھیں۔اس نے بڑھ کر جنوب کی جانب بنی قد آدم کھڑکیوں کے پٹ وا کر دیئے تھے۔فرح نے چادر اُتار کر صوفے کی پشت پہ سلیقے سے لٹکا دی۔اور پھر گہرے سانس سے فضاء میں رچی ایئر فرشنر کی خوبصورت خشبو کو اپنے اندر اُتارہ تھا۔اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ ماہ نور کو خشبو کتنی پسند تھی۔

شکر یار تم آ گئی ورنہ مجھے تو لگ رہا تھا کہ میں نے فکر سے ہی فوت ہو جانا۔وہ اس کے برابر صوفے پہ بیٹھ کر بولی تھی۔

ہمم۔اس نے کوئی خاص جواب نہیں دیا۔جیسے کچھ سوچ رہی ہو جیسے پریشان ہو۔وہ اسے آج چپ سی لگی۔

فری کیا تمہیں بھی پیپرز کی ٹنشن ہے۔اسے حیرت ہوئی تھی۔وہ تو ٹنشن لیتی ہی نہیں تھی۔ضرور کوئی اور وجہ تھی۔

نہیں پیپرز کی کیا ٹنشن لینی۔وہ افسردہ ہوئی۔

پھر کیا مسّلہ منہ کیوں بنا رکھا۔؟

For more visit (exponovels.com)

اس کے پوچھنے کی دیر تھی۔اور وہ گلے ہی لمحے اس کے کندھے کے ساتھ لگ کر پھٹ پڑی تھی۔

فری یار کیا ہوا؟گھر پہ سب ٹھیک ہیں؟

ہاں۔۔۔وہ سب ٹھیک ہیں اس کی بھیگی آواز گونجی۔۔۔

فرح میری جان تم رو کیوں رہی ہو؟

مجھے مجھے دو دن سے کوئی مسلسل فون پہ تنگ کر رہا ہے۔اس نے رونے کے دوران اٹکتے ہوئے کہا تھا۔

اور ماہ نور سے اپنی مسکراہٹ روکنا مشکل ہو گیا تھا۔

جانے دو فری ایسے ہی کوئی فارغ انسان ہو گا۔ایسے ہی تنگ کر رہا ہو گا۔اس نے حوصلہ دیا تھا۔لیکن اسے اس معصومیت پہ حیرت بھی ہوئی تھی۔

آپ کی اطلاع کے لیئے عرض ہے کہ وہ فارغ انسان میرے ابو کا نام۔میرے شہر اور کالج کا نام تک جانتا ہے۔اور یہ بھی کہ میں کس کلاس کی سٹوڈنٹ ہوں۔اسے اس کا ہنسنا بُرا لگا تھا۔ادھر میری جان پہ بنی اور اس کو ہنسی سوجھ رہی۔

اب کی بار ماہ نور سوچ میں پڑی تھی۔اچھا کہتا کیا ہے؟

نہ پوچھو وہ سوچ کر ہی غلابی پڑ گئ تھی۔

بتاؤ بھی۔اسے ہنسی آئی تھی۔

کہتا ہے اسے مجھ سے پہلی نظر کی محبت ہو گئی ہے۔اور۔۔۔اور یہ بھی کہ وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔اور اگر میں اس کو نہ ملی تو وہ خود کشی کر لے گا۔

لو ہو سکتا تمہارا کزن ہو۔کسی خیال کے تحت وہ بولی تھی۔

نہ۔۔۔دونو طرف سے بس چاچو جی کے دو بیٹے ہی ہیں وہ بھی پانچ چھ سال کے۔اور ایک پھوپو جن کی ابھی شادی بھی نہیں ہوئی۔

اچھا رونا بند کرو۔ ہم اس کو بلاک کر دیتے ہیں قصہ ہی ختم۔ بہادر بنو۔

بہادری تو۔۔۔تو گھر والوں کی عزت کا سوچتے ہی ختم ہونے لگتی ہے۔ان کا مان ءعتماد سب اس خوف سے کہ ان دونو میں کمی نہ آجائے بہادری کو کم کر دیتی ہے۔اگر بابا جان یا پھر چچا جان کو خبر بھی ہو گئی تو۔۔۔تو تم جانتی ہو وہ میرا کیا حشر کریں گے۔سب سے پہلے وہ میری تعلیم اور تربیت پہ انگلی اُٹھائیں گے۔اور۔۔۔اور ابھی تو ان کو یہ معلوم نہیں کہ میرے پاس فون بھی ہے۔وہ بولتی چلی گئی تھی۔

تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ لیکن عزت کے محافظوں کو بہادر اور نڈر ہونا پڑتا ہے۔ورنہ عزت کی حفاظت مشکل ہو جاتی ہے۔میں اس کا نمبر بلاک کر چکی ہوں۔ لیکن بہتر تھا کہ رونے کی بجائے حل نکالتی۔

وہ بس خاموشی سے سنتی رہی تھی۔بولی کچھ نہیں تھی۔

یہ نمبر تم نے میرے علاوہ اور کس کس کو دیا تھا۔وہ پوچھ رہی تھی۔کہ جاننا ضروری تھا۔

تمہارے علاوہ یہ نمبر صرف زرعی کے پاس ہے۔اور اس کا کوئی بھائی نہیں ہے۔اس نے سوچ کر بتایا تھا۔

پکّا؟

ہمم۔۔۔اس نے تیزی سے سر اثبات میں ہلایا تھا۔وہ غلط تھی۔اور بھول چکی تھی۔

رات کے سائے گہرے ہو چکے تھے۔جب وہ گھر واپس لوٹا تھا۔دادی جان نے اسے دیکھ کر سکھ کا سانس لیا۔

For more visit (exponovels.com)

آآآ گیا میرا بیٹا۔ کچھ یاد بھی ہے کہ گھر پہ ایک بوڑھی بیٹھی ہے۔ جسے انتظار کی سولی پہ تنہا لٹکا کر چلے جاتے ہو اور پھر مڑ کر دیکھتے ہی نہیں۔ وہ آج اسے ایسے جانے نہیں دینا چاہتی تھیں۔ ورنہ یہ سب نہ جانے کب تک چلے۔ وہ اس کے لیئے اب کی بار حقیقتاً پیشان تھیں۔

تو کون کہتا ہے بوڑھی کو کہ انتظار کرے۔ اس نے تھکاوٹ کے باوجود مسکرا کر اپنی پیاری سی دادی جان کے ماتھے کا بوسہ لیا اور پھر ان کے پاس ہی صوفے پہ بیٹھ گیا۔

کہاں تھے۔؟ آج سارا دن۔۔۔

وہ جو ٹائی ڈھیلی کرتا ان کی گود میں سر رکھنے ہی والا تھا۔ سیدھا۔

کچھ ہو ہے کیا؟

اچھا جب کچھ ہو گا تب ھی گھر وقت پہ آؤ گے۔ انہوں نے اسے سخت افسوس سے دیکھا تھا

نہیں وہ آپ پہلے پوچھتی نہیں نہ اس طرح۔۔۔ تو ٹھیک ہے نہیں پوچھتی۔ میرا کیا ہے پڑی رہیے بوڑھی ایک طرف۔ آج وہ سہی فوم میں تھیں۔

وہ اب سہی پریشان ہوا تھا۔ کچھ ہوا ہے۔ تو بتاتی کیوں نہیں آخر آپ۔ اس نے پریشانی سے کچن میں کام کرتے ظفر کو بھی بلا لیا تھا۔

ظفر۔۔۔ میرے پیچھے سب خریت رہی تھی؟

جی بھائی جی۔ میرے خیال سے تو خریت ہی رہی تھی۔ باقی آپ دادی جی سے پوچھ لیں۔ ظفر فوراً بول کر واپس کیچن میں گم ہو گیا تھا۔

کیا بات ہے دادی کیا ہوا؟ اس نے ان کے سلوٹ زدہ ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھوں میں لے کر پوچھا۔ اور پھر جھک کر ان کے ہاتھ کی پوشت پہ بوسہ بھی لے ڈالا۔

ہونا کیا۔۔۔وہ گہرہ سانس لے کر بولی تھیں۔ان کی آہ میں بھی گہرہ دکھ تھا۔

بس بچے یہ تنہائی ہی ہے۔جو مجھے کھاتی ہے۔تم سارا دن آفس میں ہوتے ہو۔اور میں سارا دن کمرے میں یا کبھی لاؤنج میں۔۔۔لان میں کبھی چلی جاؤں بڑی حد۔میرا دم گھٹتا ہے ایسی تنہائی میں۔سوچتی ہوں۔کہ کہیں دو دن کو چلی جاؤں لیکن پھر تم نہیں جانے دیتے۔اور مریم بھی روز روز نہیں آسکتی۔بول رہی ہے۔کہ اگلے ماہ تک آئے گی۔سن کر مجھے بھی خوشی ہوئی۔کہ چلو احمد سے دل لگ جائے گا۔لیکن پھر سوچتی ہوں کہ کب تک وہ بھی رہے گی۔ہفتہ یا پھر بڑی حد دس دن۔۔۔وہ افسردگی سے بول کر اسے دیکھنے لگیں تھیں۔کہ اب مسّلے کا حل تمہارے پاس ہے۔وہ ان کو دیکھ کر رہ گیا تھا۔شائد غلطی میری ہی ہے۔آپ تو میرے بچوں جیسی ہیں۔پہلے آپ نے مجھے پالا اور اب جب میری باری آئی تو میں نے بزنس کی خاطر آپ کو تنہا کر دیا۔اس کے لہجے میں گہرہ دکھ تھا۔وہ اس کی بات پہ گڑبڑا گئیں تھیں۔

ارے نہیں بچے تم سے کیا گیلہ۔تم نے تو کام کرنا ہی ہے۔ہاں بس اتنا کر لیا کرو کہ گھر وقت پہ آجایا کرو۔انہوں اس کے ماتھے کہ بکھرے بال ہاتھ کی کنگھی سے بائیں سمت موڑے تھے۔نہیّں دادی جان پھر بھی۔

اچھا چھوڑو۔۔۔یہ بتاؤ۔آج سارا دن کہاں تھے۔؟وہ اسے اپنی خاطر زیادہ دیر پریشان نہیں دیکھ سکتیں تھں۔اس لیئے باقی مریم پہ چھوڑ دیا تھا۔جو جلد آنے والی تھی۔انہوں نے ہی تو فون کر کہ سپیشل اسے بلایا تھا۔کہ آکر بھائی کی شادی میں ہاتھ بٹائے۔لڑکی دیکھنے والا کام وہ کر چکی ہیں۔اور صدا کی ہلے گلے کی شُدائی وہ بھی فوراًمان گئی تھی۔کہ ایک ہی تو دو سال کا بیٹا تھا۔جو پڑھائی سے ابھی بچا ہوا تھا۔اور شوہر کا مسلہ نہیں تھا۔ان کی طرف سے اجازت ہی تھی۔

اٹلی سے کچھ گیسٹ آئے ہیں۔صبح انہیں پک کیا۔اور پھر سارا دن میٹنگز میں گزر گیا۔وہ خاصہ تھکا ہوا تھا۔

اور آذر کی امی؟وہ اسے پھر سے یاد دلا گئیں تھیں۔لیکن یہ ضروری تھا۔

صبح جاؤں گا انشاءاللہ۔۔۔اس نے دونو آنکھیں مسل ڈالیں تھیں۔وہ ابھی صرف سو جانا چاہتا تھا۔

اچھا تم کھانا کھائے بغیر مت سونا۔انہوں نے صوفے سے اُٹھتے ہوئے اسے تنبیہہ کی تھی۔

وہ میں گیسٹس کے ساتھ کھا چکا۔بس اب سوئں گا۔

وہ بھی ان کے ساتھ ہی چل پڑا تھا۔

کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کے جانے سے انسان کو ایسا لگتا ہے۔ کہ اب کی بار ایسا گرا کہ اُٹھ نہیں پائے گا۔ اپنے جان سے عزیز بندے کو کھو کر انسان اپنے آپ کو گم نام کر لینے کی خواہش کرتا ہے۔ مگر اللہ کی ذات اپنے بندے کو اتنا کمزور نہیں ہونے دیتی۔ کہ انسان اپنے آپ کو فنا کر لے۔ وہ تو اللہ ہے۔ اگر ساری دنیا بھی چھوڑ دے۔ وہ اپنے بندے کو نہیں چھوڑتے۔۔۔ بس محسوس کرنے کی بات ہے۔ وہ گہرہ سانس لے کر بولیں تھیں۔ وہ پلک جھپکے انہیں ہی سن رہا تھا۔ جن کے جوان اکلوتے بیٹے کی موت نے انہیں مزید کمزور ضعیف اور بے بس کر دیا تھا۔ وہ دو ماہ بعد ان کے پاس آیا تھا۔ اور وہ اسے دیکھتے ہی کھل سی گئیں تھیں۔

آنٹی مومنہ باجی کے جانے کے بعد آپ اکیلے کیسے رہیں گی۔ اس نے کچھ فاصلے پہ بیٹھیں آذر کی بہن کی طرف دیکھ کر کہا تھا۔ جو بھائی کی موت کے بعد سے اپنے سات سال کے بیٹے کے ساتھ سسرال (جو کہ سات والے شہر میں ہی تھا۔) یہاں آکر رہ رہی تھیں۔ اسے اپنے رویے پہ دکھ ہوا تھا۔ صوفیہ آنٹی نے کبھی اس میں اور آذر میں فرق نہیں کیا تھا۔ اور جب وہ زندہ تھا۔ تو دونوں گھنٹوں ایک دوسرے کے گھر بیٹھے رہتے تھے۔ وہ اکثر اس کے لیئے کچھ نہ کچھ بنا کر رکھتی تھیں۔ وہ سب ان کا پیار تھا۔ اس کے لئے۔ اور اب وہ اس لیئے ان کے پاس نہیں آتا تھا۔ کہ ان کے گھر سے اس کی ان کے بیٹے سے یادیں جوڑی تھیں۔ جہاں وہ اپنے دن رات گزارتی تھیں۔ وہ ان سے زیادہ تو اس سے پیار نہیں کرتا تھا نہ۔

ارے بچے میں نے مومنہ کے گھر کے قریب ہی ایک فلیٹ دیکھا ہے۔ سوچ رہی ہوں وہاں شفٹ ہو جاوئں۔ اس طرح میں بھی بچوں کے پاس رہوں گی اور رونک بھی رہیے گی۔ وہ گہرہ سانس لے کر بتا رہی تھیں۔

آنٹی آپ آذر کو ادھر چھوڑ کر چلی جائیں گی۔ اس کی آنکھیں ضبط سے سرخ ہو چکی تھیں۔

کیا کروں۔۔۔ اب تنہا بھی رہا نہیں رہا جاسکتا۔ وہ نم آنکھوں سے اسے دیکھ کر مسکرائیں تھیں۔ وہ ان کی شفاف سی مسکراہٹ جس کا وہ فین تھا۔ آج غم کی زد میں تھی۔

آذرایک لڑکی کی خاطر تم نے کتنے لوگوں کے دل توڑ دیئے۔ تمہیں ایک لمحے کے لئے بھی ہم یاد نہیں آئے۔ کیا ہماری یادیں اتنی کمزور تھیں کہ اس چار دن کی یکطرفہ محبت نے بھلا دیں۔ ایک آنسو بہت خاموشی سے اس کی ہلکی سیاہ داڑھی میں جزب ہو گیا تھا۔ اس نے بے اختیار دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی اور انگوٹھے سے آنکھیں چھپانے کی خاطر آنکھوں کو ڈھامپ لیا۔

آنٹی آپ میرے پاس آکر رہ لیں۔ میں بھی تو آپ کا بیٹا ہی ہوں۔ وہ کچھ سوچ کر ان کے گھٹنوں پہ ہاتھ رکھ کر بولا تھا۔

کیوں نہیں تم تو میرے پیارے بیٹے ہو۔ لیکن اب میرا بھی دل کرتا کہ میں اپنی مونہ کہ پاس رہوں جب تک زندگی ہے۔ وہ اس کے ہاتھ کو سہلا کر بولی تھیں۔ اور تم آیا کرنا نہ میرے پاس وہاں جب دل چاہے۔

وہ سر ہلا کر رہ گیا۔ وہ جانتا تھا وہ کبھی اس کے ساتھ نہیں آئیں گی۔

تمہاری دُلہن کو میں اور امی مل کر تمہارے ساتھ لینے جائیں گے۔ کیوں؟ مومنہ باجی جو کافی دیر سے رنجیدہ سی خاموشی سے بیٹھیں ان دونوں کی باتیں سن رہی تھیں۔ یک دم بولی تھیں۔ آنٹی نے بھی جھٹ اثبات میں سر ہلا یا تھا۔ وہ محض ان دونوں کو دیکھ کر رہ گیا۔ مگر بتا نہیں سکا تھا۔ کہ وہ تو شادی نہ کرنے کی قسم کھا چکا ہے۔ کسی دھوکے کو برداشت کرنا اب اس کے لیئے ممکن نہیں تھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ایک لڑکی ہی کی وجہ سے اس کا دوست اپنی جان دے چکا ہے۔

وہ اس وقت ان لوگوں کی صف میں کھڑا تھا۔ جو کسی دوسرے کی کیئے کی سزا اپنے قریب کے لوگوں کو دیتے ہیں۔ اور سب کو ایک نظر کی ہی عینک سے دیکھتے ہیں۔

مشرق کی جانب سے تیزی سے رات کی سیاہ چادر اکٹھی ہوتی جا رہی تھی۔ اور دور کہیں افق پہ پھیلتی سورج کی کرنیں سارے آسمان کو اپنے ہسار میں لیتی جا ہی تھیں۔ اس سب سے الگ وہ ہوسٹل کی چھت پہ بیٹھی مدھم مدھم آواز میں

For more visit (exponovels.com)

پڑھنے میں اس قدر مشغول تھی۔ کہ اسے دنیا کی طرف سے بیگانگی سی ہو گئی تھی۔ آج اس کا آخری پیپر تھا۔ سب پیپر اچھے ہوئے تھے۔ اب اگر یہ پیپر بھی اچھا ہو گیا۔ تو فرسٹ ڈاویژن پکی۔ اس نے سوچ کر انشاءاللہ بولا اور پھر سے پڑھنے لگی۔ جب کرتے کی جیب میں اس کا موبائل بجا تھا۔ وہ اکثر شوقیا کرتے کی پوکیٹس بنوایا کرتی تھی۔ خاص طور پہ سردیوں کے کپڑوں کی ہوتی تھیں۔ وہ ان میں منگپھلی رکھتی تھی۔ یہ عادت اس نے پھوپو سے لی تھی۔ اس نے جمجھلا کر موبائل کو دیکھا۔ یہ کونسا وقت ہے۔ فون کرنے کا۔ اس نے فون اُٹھا کر امی کو سلام کیا تھا۔

اسلام وعلیکم۔۔۔ اس کا لہجہ نرم اور باادب تھا۔

ہم۔۔۔ وعلیکم۔ وہ ہمیشہ ایسے ہی بولتی تھیں۔ پورے سلام کا جواب رینا وہ کم ہی پسند کرتی تھیں۔

کیا حال ہے؟ کافی دن سے تم نے فون نہیں کیا میں نے سوچا میں خود کر لوں۔ اور پوچھ لوں واپسی کب تک ہو گی۔ انہوں نے بات کے دوران رکنا پسند نہیں کیا تھا۔ یہ بھی ان کا ہی انداز تھا۔ بلکہ ان کے گھر کے سب بڑوں کا بولنے کا یہی انداز تھا۔ مقابل کی بات سننے کا وہ کم ہی تکلف کیا کرتے تھے۔ اس نے گہری سانس لی۔۔۔ آج آخری پیپر ہے۔۔۔ ایک دو دن میں کچھ کام نبٹا کر آجاؤں گی۔ وہ لاہور کو سب فکروں سے آزاد ہو کر دیکھنا چاہتی تھی۔ سوچا تھا کہ دو چار دن خوب موج مستی کے بعد جائے گی۔ لیکن بلاوا آچکا تھا۔

نہیں تم کل ہی آجاؤ۔۔۔ کام بھی ہو جائیں گے۔ ہم آٹھ بجے ڈرائیور کو بھیج دیں گے۔ اور ٹھک سے فون بند۔۔۔

وہ افسوس سے سر ہلا کر رہ گئی تھی۔ گھر والوں کو دو سال بعد بھی اس پہ یقین نہیں تھا۔ وہ سر پہ سیاہ سکارف کو ماتھے پہ سرکاتی پھر سے پڑھنے لگی تھی۔

آج خریت ہے۔ یہ سب کو ہوا کیا ہے؟ وہ دونو آج یونی کے طلبِہ کی رفتار دیکھ کر حیران ہو رہی تھیں۔ وہ دونو ابھی پیپر دے کر ہال سے نکلیں تھیں۔ اور اب بھوک مٹانے کی غرض سے یونی کی کینٹین کی طرف نکل آئیں تھیں۔ اور آج

خلافِ معمول کینٹین کو ویران دیکھ کر انہیں حیرت ہوئی تھی۔ حلانکہ یہ سب سے رش والی جگہ ہو شائد۔اور خاص طور پہ لڑکیوں کی تیاریاں تھیں۔

آج کوئی فنکشن تو نہیں۔۔۔

نہیں شائد کوئی سیمنار ہے۔ بزنس ڈیپارٹمنٹ میں۔ کوئی بزنس مین آرہا ہے۔۔۔ فرح نے لاپرواہی سے کہہ کر وہاں موجود لڑکیوں کو حیرت سے دیکھا تھا۔جو کسی کا نام حسرت سے لے کر لپسٹک لگانے میں مصروف دنیا سے بے خبر کھڑی تھیں۔

حد نہیں ہوگی آج کل کی عوام پہ۔ مطلب اب ایک عمر رسیدہ سے بھلا کیا متاثر ہونا۔اور اسے تو دیکھو کیسے گھسیٹ گھسیٹ کر لپسٹک لگا رہی ہے۔اسے زور سے ہنسی آئی تھی۔

جانے دو فری ہمیں کیا۔ بابا کہتے ہیں کسی کے بارے میں چھپ کر بات نہیں کرتے۔ بات بھی وہ جو بُری ہو۔اس نے ان کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔بس سامنے پڑے بر گر سے انصاف کرنے میں مصروف تھی۔

فرح بھی شرمندگی سے رخ موڑ کر بیٹھ گئی تھی۔اب اس کی ان کی طرف پشت تھی۔اسے بھلا کیا وہ جو بھی کریں۔اس نے اپنے سیاہ سکارف کو ماتھے کی جانب کچھ اور کھینچا اور پھر برگر اور کولڈرنک کی جانب متوجہ ہو گئی۔

یہ کھانے کے بعد یونی گھومیں گے۔اس نے سیاہ مایا کو اپنے اندر انڈیلتے ہوئے اسے کہا تھا۔اس نے کھاتے دوران ہی سر ہلایا تھا۔

برگرز اور کولڈرنکس کی پیمنٹ کر کہ وہ دونوں اب خاصی تروتازہ سی تیز تیز بزنس ڈیپارٹمنٹ کی طرف چل کر آئیں تھیں۔

بہت کم سٹوڈنٹس تھے جو باہر ایسے ہی کھڑے تھے۔یا کچھ جو گراؤنڈ کی سبز سبز گھاس پہ بیٹھے پڑھنے میں مصروف تھے۔اور جو اُپر کے کچھ تھے۔وہ یونی کو ہی گھر کا راج سمجھتے وہیں۔آڑے ترچھے دراض تھے۔وہ دونوں یوں ہی ایک نظر ڈال کہ ہال کی جانب آ گئیں۔جہاں سے سٹوڈنٹس کو اینٹر ہوتے انہونے دیکھا تھا۔

ہال تو ایسے بھرا ہوا تھا۔جیسے وہاں ولیمے کا کھانا کھایا جا رہا ہو۔انہیں زیادہ تر وہاں لڑکیاں ہی نظر آئیں تھیں۔جن میں بہت کم ایسی تھیں جو مائیک کے سامنے کھڑے شخص کو گھورنے سے زیادہ اس کے الفاظ پہ فوکس کر رہی تھیں۔

ماہی یہ بزنس مین تو نہیں لگ رہا۔وہ اس کو کوئی ۵۵ کے قریب کا انکل سمجھیں تھیں۔مگر یہ کوئی ینگ کوئی ۲۷ کے قریب تھا۔یا اس سے کچھ کم۔اور خاصہ جانا پہچانا بھی لگ رہا تھا۔

یہ کیا ٹی وی میں آتا ہے۔فرح کی بات پہ اس نے چونک کر اس کی جانب یکھا تھا۔

مجھے نہیں لگتا۔بس کہیں دیکھا ہوا لگ رہا ہے۔۔۔اور پھر ایک جھماکا ہوا تھا۔

فری یاد ہے۔وہ آنٹی جن کی تم فین ہو گئی تھی۔اور تم بول رہی تھی۔کہ ان کی آواز کسی ریڈیو میں بولنے والی سے کہیں زیادہ اچھی ہے۔وہ اسے اپنی اور اس کی کچھ دن پہلے کی بات یاد دلا رہی تھی۔

ہاں جن کے پوتے کو تم نے جانبوجھ کر ڈرائیور بولا تھا۔ماہ نور پُر جوش ہوئی تھی۔لیکن اگلی بات سن کے جل گئی تھی۔

حلانکہ اتنا ہینڈسم تو وہ تھا۔کہ کوئی بھی اہلِ عقل اسے ڈرائیور نہ سمجھتا۔

اچھا بسس۔۔۔یہ ہی ہے وہ۔خامخواہ دوسروں کے مردوں کے قصیدے پڑھنے شروع کر دیئے۔اسے غیر مردوں کو ڈیسکس کرنا کبھی بھی پسند نہیں رہا تھا۔خاص طور پہ یہ تو کچھ زیادہ ہی شو خا تھا۔

وہ دونو باہر آ گئیں تھیں۔ہماری بلا سے۔۔۔

بات سنو کل شام مجھے مارکٹ جانا ہے۔تو تم تیار رہنا میرے ساتھ تم چل رہی ہو۔میں آ تو لے آؤں گی۔یا تم آ جانا۔۔۔

وہ گاڑی کا دروازہ کھول رہی تھی۔جب فرح نے اُداسی سے کہا۔

For more visit (exponovels.com)

تم جارہی۔۔۔ماہ نور بھی سن کر اُداس ہو گئی تھی۔ کھرے دوست نہ ملیں تب اتنا دکھ نہیں ہوتا جتنا ان کا کھو دینا دکھ دیتا ہے اور وہ اور فرح جتنا بھی لڑتیں۔ تھیں تو ایک جان دو قلب۔

ہاں۔۔۔آج صبح امی جی کا فون آیا تھا۔

تم کچھ دن اور نہیں رک سکتی۔ ہم نے تو مری ٹرپ پلان کیا تھا۔ پھر تم نے تو ابھی لاہور بھی گھومنا تھا۔اس کی آنکھیں نم ہو گئیں تھیں۔جُدائی کا وقت قریب تھا۔وہ اسے کسی طریقے سے روک لینا چاہتی تھی۔

نہیں رک سکتی۔۔۔گھر والے پہلے ہی نہ جانے مجھے کیسے یہاں برداشت کر رہیے ہیں۔ پھوپو کی سپورٹ نہ ہوتی تو میں کبھی لاہور میں نہ ہوتی۔ یہ تو بس ان کی ضد تھی۔ جو ابو جی اور چچا جان کو ماننا پڑا۔ ورنہ آج کل کے لڑکوں پہ۔۔۔یعنی ان کو اپنی بیٹی پہ یقین نہیں ہے۔ان کو لگتا ہے۔میں اتنے ہلکے کردار کی مالک ہوں۔ کہ کوئی بھی مجھے ورغلا سکتا ہے۔اس کے چہرے کے گرد سیاہ سکارف اس کے اندر کی اُداسی کو واضع کر رہا تھا۔

ماہ نور سنتی ہی رہی۔۔۔

ہو سکتا ہے۔فری جیسے تمہیں لگتا ہے۔ویسا نہ ہو۔ ہمارے والدین ہم سے زیادہ ہمارا بھلا جانتے ہیں۔ یہاں جس طرح بچے والدین کا بھلا نہیں کرنا سمجھتے۔اسی طرح بہت کم انسان ہیں۔ جو اللہ اور بندے کے تعلق کو سمجھتے ہیں۔ ہم اللہ کی حکمت کو نہیں سمجھتے بس شکوہ کرتے رہتے ہیں۔ جس طرح تم اب اپنے آپ کو مظلوم سمجھ کر شکوہ کر رہی ہو۔ وہ بردباری سے بولتی کہیں سے بھی۔۱۹سال کی جولی سی ماہا نہیں لگ رہی تھی۔

منفی سوچ کو چھوڑو آج ہم انجوائے کریں گے۔ خوش ہو کر جاؤ۔ ہم پھر ضرور ملیں گے۔اس کے لہجے میں۔یقین تھا۔ویسے بھی میری شادی کی رسمیں تم نے ہی کرنی ہیں۔ آخری اب کی بار وہ کچھ ہنس کر بولی تھی۔اور بات سنو میری شادی پہ نہ آئی تو دوستی ختم۔اس نے ماحول کی کسل مندی ختم کرنے کی کوشش کی اور وہ کامیاب بھی ہوئی تھی

آج آپ کالاسٹ پیپر تھا۔انہوں نے کھانا کھاتے بات شروع کی۔وہ ابھی کچھ دیر پہلے آکر بیٹھی تھی۔جب ان کی بات پہ اس نے محض سر ہلایا۔

ہم تواب نکسٹ کیا پلان ہے۔

ابھی تو کچھ نہیں۔ویسے بھی پڑھائی میرے بس کی بات نہیں۔۔۔اس نے مزے سے کہ کر روٹی کو سالن میں ڈبو کر منہ میں رکھا۔وہ اس کی بات سن کر مسکرائے تھے۔

تو پھر پڑھائی کو خیر باد بول رہی ہو۔؟وہ بھی یہی چاہتے تھے۔زندگی ان کے لے بس لمحوں کی تھی۔کون جانے کس کو کتنا جینا ہے۔

اہمم ابھی کے لئے۔۔۔اور بابا فری جا رہی۔پتہ نہیں اب ہم کب ملیں۔وہ سوچ کر ہی اُداس ہو گئی تھی۔

جب الگ ہوں تو اس اُمید پہ خُدا حافظ خوشی سے بولتے ہیں۔کہ اگر اللہ نے چاہا تو دوبارہ ملنے کا سامان بھی وہ ضرور پیدا کرے گا۔اس لئے خوشی سے رخصت کریں ان کو۔کہ اگر اللہ نے چاہا تو وہ ضروع ملوا دے گا۔وہ نرمی سے کھانے کے دوران اسے سمجھا گئے تھے۔وہی تو تھے۔اس کے روحانی اُستاد۔

بابا میں آپ کے ساتھ آفس چلوں۔وہ پُر جوش ہو کر بولی۔اور اس چکر میں پانی کا گلاس گرا گئی تھی۔لیکن وہاں تو صدا کی لاپرواہی تھی۔اتنی لاپرواہی بس باپ بھائی کہ سامنے ہی ہوتی تھی۔کہ پتا تھا کہ بس وہی ایک تو ہوتے ہیں جو نخرے بھی خوشی سے اُٹھاتے ہیں۔یہ رشتوں کا عتماد اور مان ہی ہوتا ہے۔جو آپ کو پُر عتماد اور بولڈ بناتا ہے۔

نہیں ابھی نہیں۔۔۔ابھی آپ انجوئے کرو۔اور اچھے اچھے کھانے بنا کر اپنے بابا جان کر کھلاؤ۔۔۔وہ اس کو منا کر کے پھر سے کھانے کی جانب متوجہ ہو چکے تھے۔انہوں نے اسے گلاس کے ٹوٹنے پہ سخت نظر تک سے نہیں دیکھا تھا۔

بابا کھانا بنانا تو مجھے آتا ہی نہیں اس نے فکر سے ہونٹ لٹکا کر کہا۔ وہ اس کی معصوم معصوم اسی طرح کی حرکتوں سے محظوظ ہوا کرتے تھے۔

اب بھی وہ اس کی ادا پہ مسکرئے تھے۔

یہ تو میرے ذہین بیٹی کے لیئے مسّلہ ہی نہیں ہو گی۔ سیکھو اور اپنے بابا جان پہ پر ٹیکس کرو۔ ان کی محبت پہ وہ مسکرائی تھی۔

ٹھیک تو کل کا کھانا میں۔۔۔ ابھی جملہ اس کے منہ میں ہی تھے۔ جب اس کو اپنے پیچھے جانی پہچانی آواز آئی تھی۔ وہ اور بابا آواز والے کی طرف بے یقینی سے دیکھ رہیے تھے۔

لگتا میرے گھرے والے مجھے دیکھ کر یا تو بہت حیرت میں ہیں یا پھر بہت دکھ میں۔ بابا سے گلے ملتے وہ پُر وقار انداز میں مسکرا کر بولا تھا۔

ماہ مجھے پتہ ہے میں پہلے سے بہت زیادہ ڈیسنٹ ہو گیا ہوں۔۔۔ لیکن اب اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ تم مجھ معصوم کو گھوری جاؤ۔ وہ بھی اپنے ان بنٹوں سے۔

بابا میرے ہاتھ پہ چٹکی کاٹئے گا پلیز۔۔۔ اسے یقین نہیں تھا کہ بھائی جان اس طرح سے چار سال بعد یک دم واپس آ جائیں گے۔

ہاں تم تو پہلے ہی یہ چاہتی ہو کہ کوئی تمہاری جگہ نہ لے لے۔ لیکن ایک بات یاد رہے ہر عروج کو زوال ہوتا ہے۔۔۔ وہ مسکرا کر کی طرف بڑھے اور پھر اس معصوم سی اپنی گڑیوں جیسی بہن کے ماتھے پہ نرمی سے بوسہ لیا۔ اس میں تو اس کی جان بستی تھی۔ اسے یاد آیا کیسے وہ اور ابرار بھائی بچپن میں ہر وقت اماں کی طرح اس کے آگے پیچھے پھرتے تھے۔ بابا ہمیشہ جانے سے پہلے ان کو رٹوا کر جاتے کہ بھائی بہنوں کے پروائیڈر اور پروٹیکٹر ہوتے ہیں۔ میرے بعد ماہا کا خیال تم دونو نے مل کر رکھنا ہے۔ اور ایسا ہی ہوتا تھا بابا کے آفس جانے کے بعد تین سالہ ماہ نور کا ایسے خیال رکھتے۔ جیسے خود بہت بڑے ہوں چار پانچ سال کا ہی تو فرق تھا۔ سکول سے آنے تک وہ نسرین آنٹی کل وقتی ملازمہ کے پاس ہوتی اور پھر آتے

For more visit (exponovels.com)

ہی وہ دونو اس کے محافظ بن کر کھڑے رہتے۔امی تو جب وہ دو سال کی تھی۔ تبھی بلڈ پریشر کے بڑھ جانے سے منوّں مٹی تلے جا سوئیں تھیں۔بس پھر دس سال کی عمر تک اس کے پہنچنے تک ان دونو نے سرد و گرم سے اسے ایسے بچائے رکھا جیسے کسی نازک کلی کو مالی ہر طرح کے موسم سے بچائے رکھتا ہے۔

بھائی آپ کو میری یاد کیسے آگئی؟ میں اور بابا تو آپ کو بلا بلا کر تھک گئے تب تو آئے نہیں تھے۔اب ایسا کیا ہو گیا جو ایک دم سے ہمیں جھٹکا لگا دیا۔اور یہ ابرار بھائی کدھر ہیں وہ کیوں نہیں آئے۔وہ صوفے پہ ان کے بائیں جانب بیٹھی تھی۔

بابا کو بھی اس کی بات سے اتفاق ہوا تھا۔

آپ کو چاہیئے تھا۔دونو بھائی ساتھ میں ہی آجاتے۔اصل میں تو انہوں نے اسے ہی جلد آنے کو بولا تھا۔لیکن انہوں نے خود آنے کی بجائے بابر کو کیوں بھیج دیا۔

اصل میں بابا جان آنا تو انہوں نے ہی تھا۔لیکن ان کی ایک پیشنٹ سے ضروری میٹنگ تھی۔مسٹر فرینک کی بیٹی کی ان سے اپوائنٹمنٹ تھی۔وہ اب ڈیڈ کو اس کیس کے بارے میں بتا رہا تھا۔

ہمم چلو تم تو آگئے شکر ہے اللہ کا۔

قریباً آدھا گھنٹا مزید بیٹھ کر وہ نماز کے لیئے اُٹھ گئے تھے۔

زیادہ دیر مت باتیں کرنا۔اور ماہا بیٹا بھائی کو سونے سے پہلے کھانے کے لیئے دے دینا۔کچھ دیر پہلے جب اُنہوں نے اس سے پوچھا کے وہ کھانا کھالے۔تو اسنے یہ کہہ کر منا کر دیا تھا۔کہ کچھ دیر پہلے فلائیٹ کے دوران کچھ ہلکا پھُلکا لے چکا تھا۔لیکن وہ پھر بھی بیٹی کو تاکید کرنا نہیں تھے۔بہت چھوٹی چھوٹی باتیں ہوتی ہیں۔جو آپ کے گھر والوں کی نظر میں آپ کی قدر اور اہمیت کو بڑھاتی ہیں۔بہت سے والدین کے لیئے ان کے بچوں کا تعلق محض والدین اور اولاد کا ہی ہوتا ہے۔وہ والدین اپنے اور اپنے اولاد کے رشتے پہ محنت نہیں کرتے۔اور ایک والدین وہ ہوتے ہیں۔جو اپنے بچوں کے لیے اچھے دوست ،روحانی اُستاد اور اپنے بچوں کو عتبار دینے والے ہوتے ہیں۔اگرچہ والدین اور اولاد کا تعلق ویسے ہی مظبوط ہوتا

For more visit (exponovels.com)

ہے۔اس رشتے کو کسی اور احساس کی ضرورت نہیں ہوتی۔ لیکن چمک اس میں بھی ایسے نہیں آتی۔ محنت کرنی پڑتی ہے۔وہ اُنہی والدین میں سے تھے۔ اگرچہ وہ بہت کمگو تھے۔ لیکن پھر بھی۔۔۔ان کی محبت کا اظہار ان کی آنکھیں کر دیا کرتی تھیں۔

جی بابا۔۔۔وہ سر ہلا گئی۔اور پھر سے بھائی سے بات کرنے لگی جو اس کو ادھر اُدھر کی باتوں میں اُلجھا رہے تھے۔

صبح فجر کے نیم اندھیرے میں اس کے کمرے کے مغرب کی جانب بنی دونو کھڑکیوں کے دونو پٹ کھولے ہوئے تھے۔ لون میں اس کے کمرے کی دیوار کے ساتھ پھولوں کی کیاریوں سے چھٹتی خشبو اس کے کمرے کے ماحول کو تازہ ہوا کے جھٹوں کے ساتھ اندر تک لا رہی تھی۔پھولوں کی خشبو نے راحت اور تازگی کا احساس اندر تک بھر دیا تھا۔

اس نے دعا کے لیئے ہاتھ اٹھائے تو سب سے پہلے شکر کے کلمات زبان سے ادا ہوتے سنے تھے۔اور پھر بی اے میں پاس ہونے کی دعا زبان تک آئی تھی۔امتحانات کے بعد یہ وہ اگلی فکر تھی جو آج کل اسے لاحق تھی۔

سفید ملائی جیسے چہرے کے گرد لپٹا دوپٹہ بھی سفید ہی تھا۔دونوں رنگوں کے امتزاج نے اس کے چہرے کو کچھ اور خوبصورت بنا دیا تھا۔غلافی آنکھیں سفید ہالے میں کچھ اور واضع ہو رہی تھیں۔

پشاور میں یہ اس کی چوتھی صبح تھی۔ایک خوشگوار صبح۔۔۔

اگرچہ وہ لاہور میں کچھ عرصہ خود مختار ہو کر رہنا چاہتی تھی۔اب بھی اس کی یہی خواہش تھی۔لیکن گھر والوں کی محبت بھی ایک الگ حقیقت تھی۔وہ انکے بغیر کہاں زیادہ رہ پاتی تھی۔لاہور میں ہوتی تو دس دن بعد گھر چکر لگانا ضروری ہوتا تھا۔ اگرچہ اس کا بی اے مکمل ہو چکا تھا لیکن تھی تو اب بھی وہی معصوم سی۔۔۔بہت بولنے والی باتونی سی ہر چھوٹی چھوٹی بات پہ پریشان ہو جانے والی فرح خان۔جس کی تربیت اس سے پانچ سال بڑی اس کی پھوپو نے کی تھی۔

اسنے دعا مانگ کر ابھی دوپٹہ کھولا ہی تھا۔جب کمرے کا دروازہ ہلکی دستک کے بعد کھلا تھا۔وہ موڑے بغیر بھی جانتی تھی۔ کہ آنے والا کون تھا۔وہ مسکرا کر موڑی تھی۔

پڑھ لی نماز-انہوں نے آنے کے ساتھ دروازہ بھی پورا کھول دیا تھا جس سے روشنی کا داخلہ بڑھ گیا تھا-

پڑھ لی لیکن آج آپ لیٹ-کیوں کیا سوتی رہیں؟

بس ذرا اٹھنے میں دیر ہو گئی-ابھی نماز پڑھ کر فارغ ہوئی-اور یہ بیٹھ کیوں رہی ہو-اسے واپس بستر پہ بیٹھتے دیکھ کر انہوں نے ٹوکا تھا-

اف پھوپو توبہ ہی ہے-آپ کو تو فوجی ہونا چاہیے تھا-ہر روز صبح خیزی- - - کبھی بندہ چھوڑ بھی لیتا ہے-اس کا سونے کو دل چاہ رہا تھا-مگر بھلا ہو پھوپو کا جو ایسا ہونے دیں-

ہائے فری مت پوچھ میں نے تیری یہ ڈانٹ کتنی مس کی-

واہ بہت اچھے آپ کو تو میرے غصے کا کوئی ڈر خوف ہی نہیں ہے-یہ بات اس نے مسکراہٹ دبا کر کی تھی-

فری بی بی مت بھولو کہ مجھے تمہاری پھوپو جان ہونے کا شرف تمہی کو حاصل ہے-اس لیے لحاظ- - -

ہاں پچیس سال کی پھوپو-ویسے آپ کو اپنے آپ کو پھوپو کہلوانے کا اتنا شوق کیوں ہے-

ھیں یہ تم سے کس نے کہا؟

بس مجھے پتا-وہ ہنس کر کندھے اچکا گئی تھی

اس کا کمرہ کوٹھی کے دوسرے پورشن میں تھا-اور لمبی راہداری جس میں پانچ کمرے تھے اور اختتام پہ سیڑھیاں-اس وقت وہ دونو تیز تیز ان سیڑھیوں سے نیچے اتر رہی تھیں-پھوپو آج آپ بہت خوش لگ رہی ہیں خریت جواب وہ جانتی تھی-لیکن پھر بھی پوچھ لیا-

بسس- - -وہ کندہے اچکا گئیں تھیں-

وہ ہمیشہ ایسے ہی چھوٹی چھوٹی باتوں کو لے کر خوش ہوتی تھیں-ان کو کبھی بھی بڑی وجہ کی ضرورت نہیں پڑتی تھی-جیسے اب وہ پھولوں، گیلی ٹھنڈی گھاس کو دیکھ کر خوش ہو رہی تھیں-

For more visit (exponovels.com)

بتائیں نا کیوں خوش ہیں-

اس لیئے میری غلابو کیوں کہ تم میرے ساتھ ہو-اس کے دونو سرخ سفید گالوں کو انہوں نے چٹکی بھر کر چھوڑا تھا-

اہمم پھوپو!اسے انکی اس حرکت سے سخت چڑھ تھی-

لان کی گھاس پہ ہمیشہ کی طرح چہل قدمی کرتے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے وہ دونو کہیں سے بھی پھوپو بھتیجی نہیں لگ رہی تھیں-

آپ کو پتا پھوپو ماہ نور کو میں آپ کی اور اپنی اتنی باتیں تائیں کہ اب تو وہ آپ پہ پورا مضمون لکھ سکتی ہے-

ھیں ں س- - -بتاؤ کیا تعاریفیں کیں میری-

آپ کو کیوں لگتا کہ میں آپ کی محض تعاریف ہی کر سکتی وہ بھی جھوٹی-

وہ اس لی ئے کہ میرے جیسا اچھا کبھی دیکھا نہ سنا-اور یہ جھوٹی والی بات سے مجھے جلنے کی بو آ رہی ہے-وہ تو محض انکو دیکھ کر رہ گئی تھی-

للہ پھوپو آپ تو بہت خود پسند ہو گئیں-اس سے مسکراہٹ چھپانا مشکل تھا-

اس کو خود پسندی نہیں بولا جاتا میری جان-

اچھا موٹی!اس کو کیا بولتے ھیں-وہ اب چڑھ گئی تھی-غضب خدا کا اتنے چکر تو کوئی اسی کلو کے وزن والا بھی نہیں لگاتا ہو گا-جتنے وہ لگا چکی تھیں

اس کو حقیقت بولتے ھیں-اور اپنے آپ کو دیکھو خود کتنی موٹی ہو-سچی فری تمہیں ڈائٹ کی سخت ضرورت ہے-

للہ پھوپو آپ اور ماما میرے پیچھے ہی پڑ گ ئے ہو-اس کا منہ بن گیا تھا-

لو- - -سچ بولو تو تمہیں برا لگتا ہے-

For more visit (exponovels.com)

نہیں سننا مجھے آپ کا سچ۔ ۔ ۔ بھاگنے کا موقع اچھا تھا۔اس نے اندر کی طرف دوڑ لگائی تھی۔

ہو۔ ۔ ۔ دغا باز رکو تو سہی۔فری۔ ۔ دفع۔ ۔ ۔ان کا منہ بن گیا تھا۔

- - - - - - -

لون خوبصورت رنگوں اور قمقموں سے سجا سجانے والے کا کمال بیان کرر ہا تھا۔ماحول میں عجب سحر تھا۔ایسے میں خشبوں میں لپٹے وجود چہروں پہ ڈھیروں مسکراہٹیں لئے یہاں وہاں گھوم رہیے تھے۔

بس ایک وہی تھا۔جو لون کے وسط میں اپنی چھا جانے والی شخصیت کے ساتھ تن تنہا کھڑا موبائل پہ مگن تھا۔

وہ اس وقت منگنی کے تھیم کے لیحاظ سے سیاہ اور سفید سوٹ میں ملبوس تھا۔اگرچہ سیاہ سوٹ وہاں بہت سوں نے پہن رکھے تھے۔لیکن جو بات اس پہنے والے میں تھی۔شائذ ہی کسی میں ہوتی۔

اس کے چہرے کی مسکراہٹ۔۔۔اس کے سنہری رنگ گالوں کو ڈھکتی ہلکی سیاہ داڑھی۔۔۔اس کی آنکھوں کا سردپن۔۔۔اس کے مضبوط کندھے۔مضبوط کلائیاں۔سوٹ میں نمایاں ہوتا اس کا قد۔غرض یہ کہ وہ وہاں پہ موجود ہر چیز سے بے نیاز ہنڈسم بارعب اور پُروقار شخص تھا۔مگر بھلا ہوا سے پرواکب تھی۔

وہ کیا خوب کہتے ہیں کے حسن ہو تو نزاکت آ ہی جاتی ہے۔اکمل جو کہ اس سارے فنکشن کا میزبان تھا۔اس کے قریب آ کر گنگنایا تھا۔اور دونوں ہاتھوں موجود جوس کے گلاسوں میں سے ایک اسے بھی تھمایا۔

یہ بکواس کس لئے؟

جانے بہارا تم اس وقت ان تتلیوں کو نہیں دیکھ رہیے جو تمہاری خوشبو کے گرد منڈلانے کو بے تاب ہیں۔مگر تم ہو کہ لفٹ ہی نہیں کروا رہے۔حقیقت تھی۔

بکومت اکمل۔۔۔دس بل تھے جو ماتھے پہ نمودار ہوئے تھے۔

لو۔۔۔یہ بھی سہی ہے۔پہلے میری ہی بہن کی منگنی میں صاحب بہادر بنے بیٹھے ہو۔اور اب نزلہ بھی مجھ پہ۔

اگر اتنا پرابلم ہے تو چلا جاتا ہوں۔ وہ جانے کس بات پہ غصہ تھا۔

ہاں تو آ کر کونسا احسان کیا۔ بول دے نیشاء کو اور چلا جا۔ ویسے تو بڑا بھائی بنتا ہے۔

بکواس نہیں کر بنا نہیں ہوں۔۔۔ ہوں میں اس کا بھائی۔ اور چل مومنہ باجی اور آنٹی کو لے آئیں۔

انکو ہی لے کر آیا ہوں۔ تو بس اس فون میں گھسا رہ۔

تف۔۔۔ پہلے نہیں بک سکتے تھے۔

یار تو عجیب ہے۔۔۔

لیکن وہ جا چکا تھا۔

اسلام و علیکم آنٹی۔۔۔ سٹیج کے قریب صوفوں پہ وہ دونو دادی جان اور مریم آپی کے پاس بیٹھی ہوئی تھیں۔ مریم آپی کچھ روز پہلے ہی آئیں تھیں۔ اپنے بیٹے کے ساتھ۔

اسے دیکھتے ہی وہ کھل سی گئیں تھیں۔ ذریت میرے بچے کیسے ہو؟ انہوں نے محبت سے اس ک ماتھے پہ پیار کیا تھا۔

ٹھیک آپ بتائیں آپ کیسی ہیں۔ اور آپی آپ احسن کو نہیں لائیں؟

نہیں۔۔۔ اس کے بابا آج ہی لے کر گئے ہیں۔ ویسے بھی ہم لوگ دو دن تک شفٹ ہو رہیے ہیں۔ اب امی ہمارے پاس ہی ہوں گی۔

آنٹی آپ پلیز نہ جائیں میرے پاس رہ لیں اس نے انکا سلوٹوں والا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ وہ آذر کی امی تھیں وہ کیسے جانے دے سکتا تھا انکو۔۔۔

ہاں آنٹی آپ ہماری طرف رہ لیں۔ آپ اور دادی مل کر رہنا اور میری بھابی کو ڈھونڈنا۔۔۔ کیوں دادی جان۔۔۔ مریم آپی بھی پرجوش ہو گئیں تھیں۔

میں تو بول چکی ہوں۔۔۔ دادی نے فورس کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ وجہ وہ جانتی تھیں۔ وہ کبھی نہیں رہ سکتی تھیں۔ کوئی بھی عورت اپنا گھر چھوڑنا پسند کرتی۔

آپ سب کی محبت ہے۔ لیکن اب میں مومو کے پاس رہنا چاہتی ہوں۔

ذریت۔۔۔ اکمل کی آواز پہ اس کے کھولے لب بند ہوئے تھے۔ اس نے مڑ کر آواز کی جانب دیکھا تھا۔ آذر مین اینٹر یس کے قریب کسی جوڑے کے ساتھ کھڑا تھا۔ لڑکی کی اس کی جانب پشت تھی۔ جبکے مرد کا بائیاں حصہ چہرے کا اور باقی دھڑ نظر آرہا تھا۔

وہ اس کی جانب بڑھا تھا۔

ذریت ان سے ملو مسٹر اسفند اکرام اور انکی منگیتر مس نتاشا۔۔۔ وہ مسٹر اسفند کو ذاتی طور پہ نہیں جانتا تھا۔ اکمل ان صاحب کے ساتھ بزنس کرنے کا سوچ رہا تھا۔ جن کی عمر ۲۷ کے قریب تھی اور جب اس نے پہلو میں بے زار سی لڑکی پہ غور کیا تو وہ چکرا کر رہ گیا۔ تیز میک اَپ کی وجہ سے وہ پہلی نظر میں پہچان نہیں پایا تھا۔ وہی تیز تیکھے نکش۔ وہی دوسروں کے لئے بے پروائی۔ پہچانا تو غصے نے اس کے اندر باہر آگ لگادی تھی۔ اس کا دل چاہا وہ اس لڑکی کا چہرا جھلسادے۔ وہ بھی وہی اذیت سہے جو آذر نے اس کے دھوکے، فراڈ اور کھیل تماشے سے واقفیت کے بعد سہی تھی۔

آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔۔۔ اس نے سرد سپاٹ انداز میں کہہ کر سٹیج کی طرف رہ لی تھی۔ لیکن وہ لڑکی نتاشا کا وجود اس کی برداشت سے باہر تھا۔ اس پارٹی میں اس کے سوا کوئی نہیں جانتا تھا۔ کہ یہ نتاشا کونسی نتاشا تھی۔ سٹیج پہ بیٹھے غیر ایرادی طود پہ وہ اس پہ نظر رکھے ہوئے تھا۔ اور یہ بات شائد اس نے محسوس کرلی تھی۔ لیکن حیرت کی بات اس نے اس کے چہرے پہ کوئی پریشانی یا اَضطراب نہیں پایا تھا۔ وہ بس مسکراتی اپنے منگیتر کے ساتھ یہاں وہاں گھومتی رہی تھی۔ اس نے نوٹس کیا تھا کہ وہ اپنے منگیتر سے کچھ خاص خوش نہیں دکھ رہی تھی۔ بس اجنبیت سی تھی۔ اس نے اسے دادی جان کے صوفے کے پاس جاتے اور وہاں بیٹھتے دیکھا۔ اور پھر کسی بات پہ چونک کہ اس کی جانب دیکھا تھا۔ وہ اس کی آنکھوں کا انسر سمجھ نہیں پایا تھا۔ اس نے اسے حقارت سے دیکھ کر نظریں پھیر لی تھیں۔ ذھن آہستہ آہستہ تانے بانے بن رہا تھا۔

آپ کے دوست کو شائد ہم پسند نہیں آئے۔ اکمل بھی ذریت کی حرکتیں دیکھ دیکھ کر پریشان ہو رہا تھا۔ جو ہر بات پہ کاٹ کھانے کو دوڑ رہا تھا۔ پتہ نہیں تو کس کو احسان جتا رہا ہے۔ منگنی پہ آ کے۔ میں اسفند اور اس کی منگیتر کے سامنے بہت شرمندہ ہوا ہوں۔ انہیں لگ رہا ہے کہ تمہیں ان کا آنا پسند نہیں آیا۔

یہ تم سے کس نے کہا۔ وہ اس وقت موبائل پہ شائد اپنے اسسٹنٹ سے بات کر رہا تھا۔ شائد اس کی کوئی میٹنگ تھی۔

اس کی منگیتر نے کئے بار بولا مجھ سے۔۔۔ وہ اس کی بات پہ چونکا تھا۔ وہ اسے نوٹس کر رہی تھی۔ نہیں ایسی بات نہیں ہے۔ کہہ کر وہ دادی جان کی طرف آ گیا تھا۔ جو شائد اب گھر جانا چاہ رہی تھیں۔ اور ملے گلے کی شُدائی مریم آپی رکنے کو بول رہی تھیں۔

دادی آپ نے دیکھا وہاں کتنی پیاری پیاری لڑکیاں تھیں۔ مجھے تو سب ہی ذریت کے لئے اچھی لگ رہی تھیں۔ قسم سے سمجھ ہی نہیں آ رہا تھا کس کو بھابی بناؤں اور کس کو چھوڑ دوں۔ دادی جان سویٹر بننے کے ساتھ ساتھ ان کی باتیں بھی سن رہی تھیں۔ اور مسکرائے جا رہی تھیں۔ توبہ مریم ایک بھائی کی کتنی شادیاں کرو گی۔

لے۔۔۔ میں کیوں کروانے لگی وہ تو میں بس بات کر رہی ہوں۔ کہ سب لڑکیاں ہی اچھی تھیں۔ اور اب آپ کا لاڈلہ چھوٹا نہیں رہا جو میرے کہنے پہ شادی کر لے۔۔۔ اس کے لئے ڈنڈے کی ضرورت ہے۔ وہ اپنے بیٹے کو سلا کر نہایت فرست سے سب منہ پہ بیسن کا پیسٹ لگا رہی تھیں۔

جو میں نے دیکھی ہے نہ۔ وہ تم چلو میرے ساتھ دیکھنے۔ میں نے اس کے ابو سے بات کر لی ہے۔ ظفر نے نمبر لے لیا تھا۔ پتہ نہیں کیسے۔ اور اب کسی سے ذکر مت کرنا ذریت سے تو بالکل بھی نہیں۔ ورنہ وہ منا کر دے گا۔ اور میں چاہتی ہوں کہ تم جانے سے پہلے یہ کام کر جاؤ۔

ہاں میرا ابھی یہی خیال ہے۔ خیر اب آپ مجھے بلا نامت۔ میں بولوں گی نہیں۔ کرسی پہ دونوں پاؤں چڑھا کر انہوں نے آنکھوں پہ کھیرے کے ٹکڑے رکھ لئے تھے۔

For more visit (exponovels.com)

شاباش ہے۔۔۔ یہاں تم مجھے ملنے آئی ہو یا پھر یہ سب کرنے۔ جواب ندارد۔ افسوس ہے بھئی۔

خریت تم ادھر۔۔۔ وہ لون میں نگہت عبداللہ کا ناول پڑھ رہی تھی۔ جب بابر بھائی کی بات پہ گردن موڑ کران کی طرف دیکھا تھا۔

ویسے تم پاکستانیوں نے ہر چیز عجیب ہی ایجاد کی ہے۔ وہ اس کے سامنے والی کرسی پہ بیٹھ گئے تھے۔

چھاااا۔ ہم پاکستانی اور آپ کیا افریقی ہو۔ وہ ان کی بات پہ ہنسی تھی۔

نہیں یار۔۔۔ انہوں نے بالوں میں دائیاں ہاتھ پھیرا اور پھر ہاتھ میں پکڑے موبائل کی سائڈ کے بٹن سے سکرین آن کی تھی۔

کیا ہوا میرے پاکستان نے بور کر دیا۔ اس نے کتاب کو بند کر دیا تھا۔ وہ آج سارا دن انکو ٹائم نہیں دے پائی تھی۔

ہاں بہت زیادہ۔۔۔ کوئی دوست نہیں۔ اور تم بھی بورنگ عورت گھر میں گھوسی ہوئی۔ پلیز چلو کہیں چلتے ہیں۔ وہ خاصے بوریت سے تنگ آئے لگ رہے تھے۔

اللہ بابر بھائی آپ تو بولتے تھے۔ کہ آپ لیمیٹ لیس ہو۔ پھر اب ایسا کیا ہو گیا۔ اور یہ ساتھ والوں کے گھر ہیں تو سہی آپ کی عمر کے لڑکے۔۔۔

کون۔۔۔ وہ سنگل پسلی۔۔۔ رہنے دو ماہا۔۔۔ بہت شوخا ہے وہ۔ دو منٹ کی بات ہوئی تھی میری لیکن اس کے بعد وہ جہاں سے گزرتا تھا اگر مجھے وہ نظر آجاتا تو میں رستہ بدل لیتا۔

کتنی بری بات ہے۔ پتہ وہ آنٹی اتنی اچھی ہیں نا۔ اور تھوڑی لڑاکا بھی۔ اگر انکو پتا چل گیا نہ آپ انکے بیٹے کو شوخا بول رہے تھے۔ پھر وہ بتائیں گی آپ کو۔ اور میں نے تو ماننے سے ہی انکار کر دینا کہ آپ میرے بھائی ہو۔ وہ اب انہیں چھیڑ رہی تھی۔

بہت سیلفش ہو پھر تو تم۔ میں تو سوچ رہا تھا کہ تمہیں کہوں گا کہ اپنے لیئے کوئی بھابی ڈھونڈنے کی فکر کرو۔ تمہارا بھائی بڑا ہو گیا ہے۔ لیکن چلو یوں تو یوں ہی سہی۔۔۔ڈرامہ عروج پہ تھا۔

ہیں ں ں۔۔۔یہ کب ہوا۔ کون ہے؟اور یہ بتائیں کیسی ہے؟ وہ یہ سوچ کر ہی پُر جوش ہو گئی تھی کہ اس کا بھائی کسی لڑکی میں دلچسپی لے رہا ہے۔

دیکھو ذرا۔۔۔ٹیپکل عورت ہی ہو تم بھی۔ میں ڈھونڈنے کی بات کر رہا اور تم۔۔۔توبہ توبہ تمہیں میں ایسا لگتا ہوں۔ میرے لیئے تو سب لڑکیاں ہی بہنیں ہیں۔ بس ایک تمہاری بھابی کے سوا۔ وہ کہیں سے بھی مزاق کرتے نہیں نظر آرہیے تھے۔

میں بابا سے بات کروں؟

کیا۔۔۔نہیں نہیں پگلی تم تو سیریس ہی ہو گئی۔ تم بس اپنی فکر کرو۔

کیا مطلب اپنی فکر کرو؟اس بات کا کیا مطلب تھا۔

او۔۔۔کچھ نہیں تم عورتیں بھی نہ۔۔۔چلو اُٹھو باہر چلتے ہیں۔

نہ میں نے نہیں جانا۔ میرا موڈ نہیں۔ اس نے واپس ناول کھول لیا تھا۔

چلو بھی یار۔۔۔انہوں نے بک جھپٹ کر سائڈ پہ رکھ دی تھی۔

نہیں نہ جب سے فری گی ُمیرا گھر سے نکلنے کو دل نہیں کرتا۔

چلو جی۔ بس ایک فری ہی ہے۔ میں تو تمہارا کچھ لگتا ہی نہیں بھول گئی۔ میں کس طرح تمہارے اس بڑے سے منہ میں چوکلیٹ ڈالتا تھا۔ میرے یہ نازک سے ہاتھ تم چبا ڈالتی تھی۔ اور وہ بھی یاد نہیں کیسے میں اپنے ہوم ورک کے ساتھ ساتھ تمہارا بھی کرتا تھا۔ وہ کہیں سے بھی ماہا کے بڑے بھائی نہیں لگ رہیے تھے۔ اور عمر بھی کو نسا زیادہ تھی۔ بس تئیں سال۔

توبہ ہی ہے۔ چلیں اُٹھیں اس نے اٹھ کر کپڑوں کی سلوٹوں کو ہاتھوں سے ہی سیدھا کیا تھا۔اور سر پہ اوڑھے دوپٹے کو پھیلا لیا تھا۔اس طرح کے ماتھے سے کمر تک وہ رنگین آنچل سے ڈھک گئی تھی۔ لیکن یاد رہیے شاپنگ اور لنچ آپ کی طرف سے۔

اوکے منظور۔ وہ بھی فٹ مان گئے تھے۔

رات گہری ہونے کے قریب تھی۔ جب وہ گھر آیا تھا۔ آپی اور دادی لاؤنج میں سر جوڑے نہ جانے کیا کھسر پھسر کر رہی تھیں۔ کہ اسے دیکھتے ہی دونو سیدھی ہو گئی تھیں۔

خریت ؟آپ دونو کو آج کیا ہوا؟ وہ چونکا تھا۔

کچھ نہیں بس ایسے ہی میں دادی جان کو اپنے سسرالیوں کا بتا رہی تھی۔ آج گئی تھی نہ۔ بس وہی۔۔۔

ہمم۔۔۔احمد ادھر آؤ میرے پیارے بیٹے۔اس نے نیچے کارپیٹ پہ کھیلتے احمد کو اُٹھانا چاہا تھا۔ جو سر ہلا کر انکار کرنے لگا تھا۔ نو۔۔۔ میرا موڈ نہیں ہے۔ واہ کیا شہانہ انداز تھا۔ وہ حیران کھڑا تھا۔

سوچ لو۔ رات میں آیسکریم کھلانے لے کر جاؤں گا۔

واٹ۔۔۔ماموآپ نے کیا مجھے بچہ سمجھ رکھا ہے۔ جو آیسکریم سے بہل جائے گا۔ میں بیٹ مین دیکھتا ہوں۔اور بیٹ مین لورز بچے نہیں ہوتے۔

ذریت سے اپنی ہنسی کنڑول کرنا مشکل ہو رہا تھا۔

اچھا۔۔۔ لیکن میں تو بیٹ مین نہیں دیکھتا۔

تو آپ سے کس نے کہا کہ آپ بڑے ہو۔ ابھی ماما بول رہی تھیں۔ دادی ذریت ابھی بچہ ہے۔ اس نے ویسے ہی نکل اُتاری تھی۔ مریم جو آہستہ آہستہ دادی سے بات کر رہی تھیں فوراً سیدھی ہوئی۔ احمد بُری بات۔ اور پھر سے بات کرنے لگیں تھیں۔ لو اس میں کیا بُرا ہے۔ وہ شائد جھکا کوئی پزل سولو کر رہا تھا۔ سیدھا ہوا۔

کیا میں نے کچھ غلط کہا۔؟

نہیں اس نے جھک کر اس کے ماتھے پہ پیار کیا اور پھر کھانے کا بول کر سیڑھیاں چڑھ گیا تھا۔

ابھی اس نے صوفے پہ بیٹھ کہ جوتوں کو پاؤں سے الگ کیا ہی تھا۔ جب اس کا پہلو میں پڑا موبائل بجا تھا۔ آنے والی کال کا نمبر پہلے ہی اس کے موبائل میں سیو تھا۔ آنے والی کال نے اس کی تھکاوٹ کو دور کر دیا تھا۔ موبائل کو کچھ دیر بجتے ہی رہنے دیا تھا اس نے۔ قریباً پانچ منٹ بعد اس نے کال رسیو کی تھی۔

فون کو کان سے لگا کر دوسرے ہاتھ سے وہ شیشے کے سامنے کھڑا کنگھی کر رہا تھا۔ جبکہ زبان دوسری طرف اپنی لاعلمی کا بیان دے رہی تھی۔ چہرے پہ اگر سرد پن تھا تو شیشے میں آنکھوں میں ہلکورے لیتی نفرت بھی واضح تھی۔۔۔

وہ تو بس آپ سے بات کرنے کی چھوٹی سی خواہش تھی۔ جسے وہ سیریس لے گیا شائد۔ وہ کہہ رہا تھا۔

ہائے بوانہ کرو۔ حیرت سے ان کا منہ کھل گیا ہو جیسے۔

لو مجھے کیا پڑی کہ میں جھوٹ بولتی پھیروں۔ بوڑھی نے سر پہ لپٹی چادر کے پلو کو کہنے کے ساتھ چہرے سے کچھ اوپر ماتھے پہ جمایا جو بار بار سر ملنے پہ سرک رہا تھا۔

پڑی تو خیر آپ کو بہت گہری ہے۔ تخت پہ لیٹے رسالے کی ورک گردانی کرتے۔ اس کی آواز اتنی بلند ضرور تھی کہ بوڑھی سن لیتی۔

ارے بھئی بڑی بیگم سچ پو چھو تو تمہاری یہ لونڈیا بہت شریر ہے۔امی جی کا ذکر سن کہ اس نے مڑ کر دیکھا تو فوراً سے سر جھکا بھی لیا کہ کہیں پتھر کی نہ ہو جائے۔وہ تو سمجھی تھی کہ اس کے اور پھوپو کے سوااور کوئی نہیں ہے وہاں پر امی جی بھی وہاں تھیں اور ملازمہ سے اچار بنوا رہی تھیں۔

چھوڑو بوا تم بتاؤ تم کیا کہہ رہی تھی۔انہوں نے فوراً بات کو اس کے عنوان کی طرف موڑا۔

ہاں تو میں کہہ رہی تھی۔کہ اس کی بہو نے گھر کی ساری شکل ہی بدل دی۔۔۔اچھا ہوا۔آپ کی بیٹی نے میٹرک کر لیا۔

اسے اب غصہ آ رہا تھا۔آخر دوسرے کی بہو بیوی کے بارے میں بات کرتے لوگ کیوں نہیں سوچتے۔وہ جس کا ذکر کر رہی تھی۔وہ اس کو اچھے سے جانتی تھی۔سسرال کو جوڑ کر رکھنے کے لیئے اپنا آپ قربان والی ایک نیک عورت۔۔۔بس اس کی خامی دنیا والوں کی نظر میں یہ تھی۔کہ ایک تو میکہ نہ تھا۔بیچاری کا اور دوسرا اولاد۔۔۔بس ایک یہ دو باتیں تھیں جو اسے بُرا بنا رہی تھیں۔عجیب معاشرہ ہے۔کیا اتنے بے عقل ہو گئے ہیں سب کہ اللہ کی قدرت اور طاقت کو ہی نہیں سمجھتے۔کوئی اس کی خدمات کو نہیں دیکھتا۔بس سب لگے ہوئے ہیں۔ایک ہی انسان کی ٹانگ کھینچنے۔۔۔

آآآ بس لگی ہی ہوئی ہے۔۔۔اپنی بار جواب دینا مشکل تھا۔

پیچھلے سال بھی تو وہ میٹرک میں ہی تھی نہ۔۔۔کیوں پھوپو؟ پھوپو جو ہنسی چھپانے کو چہرا گھٹنوں میں چھپا گئی تھیں۔محض سر ہلا کر تائید کی۔

کیا فیل ہو گئی تھی بوا؟۔معصومیت سے پوچھا گیا ایک اور سوال۔

بوڑھی اب کی بار گڑ بڑائی تھی۔اے لو اب بھلا لڑکیوں نے پڑھ کر کیا کرنا۔گھر جو سنبھالتی ہے میری لڑکی۔۔۔

لیکن بوا اگر پڑھے گی نہیں تو۔۔۔فرح خان اُٹھو اور جا کر بابا صاحب کے لئے تازہ مکھن بناؤ۔امی جی نے اس کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی اسے اُٹھا دیا تھا۔وہ اور پھوپو مسکراہٹ چھپاتی اُٹھ گئی تھیں۔

میری بات تو سنو۔اپنی لڑکی کو اپنی اس نند سے دور ہی رکھو۔ پھر مت کہنا۔اسی کا اثر ہو رہا ہے۔یاد نہیں کیسی تھی یہ۔وہ بوا کی بات کا مطلب سمجھ نہیں پائیں تھیں۔

کیا مطلب بوا؟

لو کیا اب لڑکی کی ماں ہو کر بھی مطلب پوچھو گی۔وہ چادر سنبھالتی اُٹھ گئی تھی۔جبکہ فساد کی ہلکی چنگاری چھوڑ گئی تھی۔شائد اسی لیئے سب سے زیادہ عورتیں جہنم میں ہوں گی۔کیوں کہ کسی کو خوش اور خوش حال دیکھ کر اس جیسی عورت سے کہاں برداشت ہوتا ہے۔جل اُٹھتی ہیں فوراً حسد میں۔بوا نامی یہ عورت پاکستان کے ہر محلّے میں پائی جاتی ہے۔جو اپنی کمیوں کو دوسروں کے گھروں میں آگ لگا کر پورا کرتی ہیں۔

دیکھا پھوپو پھر میرا کمال۔اس نے مصنوئی کالر جھاڑا تھا۔

ہاں دیکھ لیا۔اب رات میں تمہاری امی جی کا جلال بھی دیکھوں گی۔بلکہ رات میں کیوں۔ابھی کیوں نہیں۔وہ ہنس پڑی تھیں۔

خریت آج بڑا ہنسا جا رہا ہے۔چچی جی شائد اپنے بیٹے کے لیئے فریج سے دودھ لینے آئی تھیں۔

جی وہ میں بس لاہور کا بتا رہی تھی پھوپو کو۔اس نے مسکراہٹ چھپا کر جھوٹ بولا تھا۔ابھی اگر ماہا ہوتی تو کہتی فری تمہاری ناک لمبی ہو چکی ہے۔اب جھوٹ مت بولنا ورنہ پکڑی جاؤ گی۔ماہ نور یاد آئی تو ساتھ ہی اس کو فون کرنا بھی یاد آیا تھا۔اور جب اس کو فون کرنا یاد آیا تو وہ بیگ میں چھپایا فون بھی۔ذیہن کے نقشے پہ اُبھرا تھا۔جس کے ساتھ ہی فکر ہوئی تھی۔پتہ نہیں گھر والے کیا سوچیں۔

اچھا ایسا کیا خاص واقعہ ہے کہ اتنی ہنسی کے فوارے پھوٹ رہے۔ہمیں بھی تو پتہ چلے تا کہ ہم بھی تھوڑا ہنس لیں۔

جی بس وہ ایسے ہی کالج کی شرارتیں۔

ہاں تو میں نے کب کہا کچھ اور۔۔۔ کہہ کر وہ فیڈر بھر کر باہر نکل گئی تھیں جبکہ وہ دونوان کی بات میں اُلجھ گئی تھیں۔ بات اتنی بڑی نہیں تھی۔ جتنا بُرا انداز تھا۔

یہ چچی جی کی کیا چاچو جی سے لڑائی ہوئی ہے۔؟ اسے ان کی کچھ سمجھ نہیں آئی تھی۔

مجھے کیا پتہ۔۔۔ لیکن یہ بات کیا کہہ کر گئی ہیں؟

پتہ نہیں۔۔۔ چلیں بن گیا مکھن۔ آئیں ہم میرے کمرے میں چلتے ہیں۔ مکھن کو فریج میں رکھ کے وہ دونو سیڑھیاں چڑھ گئی تھیں۔ جبکہ ملازمہ سے اچار کے مرتبان کیچن میں رکھواتے ہوئے۔ امی جی کی نظریں ان دونو پہ تھیں۔

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

بابا جان آج ایک عجیب بات ہوئی۔ پوچھیں کیا۔ وہ تینوں میز کے گرد بیٹھے رات کا کھانا کھا رہے تھے۔ جب اس نے ہنستے ہوئے بابا جان کو سارے دن کی روداد سنانا شروع کی تھی۔

اچھا چلیں پھر بتائیں کیا۔۔۔ وہ بھی اسی کے انداز میں بولے تھے۔

آج بابر بھائی نے فراخ دلی کا مظاہرا کرتے ہوئے مجھے بہت سی شوپنگ اور لنچ اپنی جیب سے کروایا۔

واہ بھائی ہو تو ایسا۔ اینڈ پہ لقمہ بابر نے خود دیا تھا۔

اچھا تو پھر کیا کیا لیا میری بیٹی نے؟ ان دونو کی باتیں سن کر وہ اپنی بیماری بھول جایا کرتے تھے۔ جس کے بارے میں خُدا کے بعد وہ اور انکا ڈاکٹر جانتا تھا۔۔۔

اس نے۔۔۔ اس نے ندیدے پن کے سارے ریکاڈ توڑ کر بے شرمی کی انتہا پہ شوپنگ کی۔ اور جب مال سے باہر آ گئے تب محترمہ کو اپنے اس معصوم سے بھائی کا خیال آیا۔

اللہ بابر بھائی آپ کو تو ایکٹر ہونا چاہیے تھا۔ کیسے دو منٹ میں مجھے ظالم اور اپنے آپ کو مظلوم بنا ڈالا۔ وہ حیران رہ گئی تھی۔ حلانکہ سب شوپنگ انہوں نے خود کروائی تھی۔

For more visit (exponovels.com)

بس اس ملک میں ٹیلنٹ کی قدر نہیں ہے نہ اس لئے ورنہ آج میں بھی کسی فلم کی شوٹ کے لئے بڑے سے سیٹ پہ ہوتا۔

اور میرے چاروں اور میرے مداح ہوتے۔۔۔بس بیٹا خوابوں سے باہر آجاؤ۔۔۔ بابا نے ہنستے ہوئے ٹوکا تھا۔ورنہ شیخ چیلی پتہ نہیں کہاں جاکر رکتا۔اور کہاں انڈے ٹوٹتے۔

مجھے بتاؤ ابرار کب تک آئے گا؟اب ذرا اہم باتیں بھی کر لیتے ہیں۔ماہ نور نے بھی بھائی کا ذکر سن کے چمچ روک دیا تھا۔وہ بے تابی سے انکا انتظار کر رہی تھی۔

جی۔۔۔ باباجان آج صبح میری بھائی سے بات ہوئی تھی۔کل کا بولا ہے۔شام تک آجائیں گے۔

ابرار بھائی آرہیے۔وہ سن کر پُر جوش ہو گئی تھی۔لیکن پھر شرمندہ بھی ہوئی۔کیونکہ ابھی بات چل رہی تھی۔

ٹھیک ہے۔گیسٹس بھی صبح ہی آرہیے ہیں۔انکو اب منا نہیں کیا جاسکتا۔مناسب نہیں لگے گا۔ورنہ میں۔بول دیتا۔اور ابرار کا انتظار کر لیتے۔نیپکن سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے وہ کیہہ رہے تھے۔

بابر انکو ہی دیکھ رہا تھا۔اسے وہ پہلے سے کمزور لگے تھے۔نہیں باباجان آپ نے ٹھیک کیا۔ویسے بھی آنا جانا لگا ہی رہیے گا۔

ہم۔۔۔اور ماہا بیٹا صبح کچھ اہم مہمان آرہیے ہیں تو آپ نے خیال رکھنا ہے۔آنٹی بتول سے اچھا سا کھانا بھی بنوا لینا آپ۔۔۔اُٹھنے سے پہلے اسے بھی تاکید کی تھیں۔وہ سر ہلا گئی۔

کون آرہاہے۔۔۔ایک منٹ۔وہ بابر بھائی سے پوچھ ہی رہی تھی۔جب وہ ایک منٹ کا اشارہ کر کے بابا کے پیچھے سیڑھیاں چڑھ گئے تھے۔شائد کچھ باقی

رہ گیا تھا۔

نیلی عمارت کے نیلے شیشوں سے سورج کی تیز کرنیں ٹکرا ٹکرا کر سیدھ میں پھیل رہی تھیں۔

اس نے گاڑی سے نکلنے کے ساتھ ہی عادت سے مجبور سفید شکنوں سے پاک ڈریس شرٹ کے بازو فولڈ کیے۔ چہرے پہ موجود سیاہ چشمہ ہر طرح کے تاثرات ڈھکنے میں کامیاب رہا تھا۔ ایک آخری نظر مضبوط کلائی پہ بندھی گھڑی پہ ڈالتے ہی اس کے قدم میکینکی انداز میں عمارت کی جانب بڑھے تھے۔ سڑک کے پار ریستوران کا دروازہ بڑے ٹھہرے ہوئے انداز میں کھولا گیا تھا۔

باہر اور اندر کا ماحول ایک دوسرے سے یکسر مختلف تھے۔ باہر کا ماحول تند و مزاج عورت کی طرح تھا۔ تو اندر کا ماحول کسی الھڑ بالی کی طرح، جس کے مزاج کی ٹھنڈک نے سب کو تروتازہ کر رکھا تھا۔ مگر آنے والا اس سب سے انجان وہاں موجود ہر شخص کو تولتی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ وہاں موجود ہر ایک کی میز کا طواف کرتی اس کی نظریں ایک جگہ رک گئی تھیں۔ قریب آتے مینیجر کو اہم احکامات دیتے میزوں کے قریب سے رستہ بناتے۔ اس کا رخ میٹنگ ایریا کی طرف تھا۔ ایک میز کے قریب سے گزرتے اس نے وہاں موجود لڑکیوں کو پہلے چونکتے اور پھر پر جوش ہوتے محسوس کیا تھا۔ مگر پھر انجان بنتا آگے بڑھ گیا۔۔۔

تاشہ۔۔۔ نوین کی آواز پہ نتاشا کا سکتہ ٹوٹا تھا۔ وہ سیڑھیاں چڑھتا دوسرے فلور پہ جا رہا تھا۔ شائید کسی میٹنگ کے سلسلے میں وہاں موجود تھا۔

کیا قسمت ہے تاشو۔۔۔ بڑی لمبی عمر ہے محترم کی۔ ابھی اسی کی بات کر رہے تھے۔ اور دیکھو کیسے سامنے آیا۔ زرناب بھی اس کے سحر میں مبتلا نظر آتی تھی۔ ان تینوں نے مل کے اسے سوشل میڈیا پہ ڈھونڈا تھا۔ چونکہ نتاشا نے اسے پارٹی میں دیکھ رکھا تھا۔ اسی لیے ڈھونڈنے میں پریشانی نہیں ہوئی تھی۔ ان دونوں نے وہیں دیکھا تھا۔ نتاشا سہی کہتی ہے۔ وہ سچ میں کسی سلطنت کا شہزادہ معلوم ہوتا ہے جیسے ہی الفاظ ہو سکتے تھے جو انہوں نے کہے تھے۔

میں اس سے ملنے جا رہی ہوں۔ سیڑھیوں کی طرف دیکھتی۔ وہ لمحوں میں فیصلہ کر چکی تھی۔ لیکن پھر ان دونوں کے واپس کھینچ کے بیٹھانے پہ انہیں گھورتی واپس بیٹھی تھی۔۔۔

کیا تکلیف ہے؟۔۔۔ روکا کیوں؟

کیا بولو گی جا کے۔۔۔ ہو سکتا ہے اسے تمہارا یاد ہی نہ ہو۔ یا پھر پہچانتا نہ ہو۔ خامخواہ بے عزت ہو گی۔

اسے اس کی بات میں دم لگا تھا۔ لیکن دل اندر سے مچل رہا تھا۔ دل چاہ رہا تھا۔ اڑ کر پہنچ جاتی۔ اس خوبصورت انسان کے پاس جو اس کے لیے رات کے اندھیرے میں روشنی کا ستارہ بن چکا تھا۔ جس نے اس کی راتوں کی نیند کو کہیں گہری نیند سلا دیا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ ایک سو دس دفعہ اسفند اکرام کو چھوڑنے کے بارے میں سوچ چکی تھی۔ چاہے اس کے بعد اسے جو بھی خسارہ ہوتا۔۔۔ اب ذریت حسن کے لیے وہ اتنی سی قربانی تو دے ہی سکتی تھی۔ ویسے بھی یہ وہ پہلا شخص تھا۔ جس سے وہ دل لگی نہیں کر رہی تھی۔ اس شخص کا سحر ہی ایسا تھا۔ جو لمحوں میں غرور کی اونچی عمارت کو ملیامیٹ کر گیا تھا۔۔۔

حقیقت تھی وہ ناک کے بل گری تھی۔ اور اب اٹھنا بھی نہیں چاھتی تھی۔

کوئی بات نہیں میں اپنا تعارف خود دے دوں گی۔ ویسے ممکن ہے اسے اپنے دوست کی وجہ سے یاد ہو۔ اب میں بھی ایسی کوئی معمولی چیز نہیں ہوں۔ جو ایسے بھول دی جاؤں۔ انسان اپنی فطرت سے کب باز آیا ہے۔ اور غرور کرنا اس کی فطرت بن چکا تھا۔ وہ ایک ہفتے بعد نظر آیا تھا۔ اور اس موقع کو وہ کیوں جانے دیتی۔

فرض کرو اسے نہ یاد ہوا تو۔۔۔؟

تو بھی میں اسے یاد دلا دوں گی۔ وہ یکدم جھنجلا گئی تھی۔ اس سے صبر کرنا مشکل تھا۔ اور یہ دونو تاویلیں گھڑنے میں مصروف تھیں۔

اوہو۔۔۔ بخیر بخیر۔۔۔ ویسے تاشو۔۔۔ اس کا دوست سنگل ہے نہ۔۔۔ زرناب کی رگِ شرارت پھڑکی تھی۔ مگر اس کا سارا دھیان اس وقت سیڑھیوں کیطرف تھا۔ ڈر تھا کہ موقع ہاتھ سے نہ نکل جائے۔

اونچی ناک والی، کسی کو کچھ نہ سمجھنے والی نتاشا۔ جس کو اس کی خوبصورتی نے آسمان پہ چڑھا رکھا تھا۔ کیسے ماہی بے آب کی طرح مچل رہی تھی۔ یہ ان دونو کہ لیے باعثِ حیرت تھا۔

اوہو۔۔۔ محترمہ ایسا سحر ہے محترم کی وجاہت میں کہ ساری اکڑ، غرور لمحوں میں ڈھیر ہو گیا۔ کبھی کبھی تو موقع ملتا تھا اس کا ریکاڈ لگانے کا۔ اب وہ اس کی حالت کو انجوائے کر رہی تھیں۔ ورنہ آج سے پہلے وہی کرتی آئی تھی۔ ایسا کم ہی ہوا جب وہ کسی سے متاثر ہوئی ہو۔ آج ہی تو سہی موقع تھا۔

اس کی آواز کا سحر ایسا ہے۔ کہ مقابل بات کرنا بھول جائے۔ بولتا ایسے گویا۔۔۔ گویا۔۔۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کس چیز سے تشبیہ دے۔۔۔

اہم۔۔۔ وہ دونوا یک دوسرے کو دیکھ کہ مسکرائیں تھیں۔۔۔ مگر وہ بول رہی تھی۔

اس کی شخصیت کا کمال ایسا۔۔۔ کہ اس پارٹی میں کوئی شخص اس سے میل کھاتا نظر نہیں آیا تھا۔ اور اس کے بعد جب میری نظر پہلو میں پڑی۔۔۔ آدھا جملہ وہ چھوڑ گئی تھی۔ سوچ کر ہی اس کا چہرہ سرخ پڑ گیا تھا۔

اسفند اکرام جیسے کم شکل انسان سے بھلا میرا کیا جوڑ؟۔۔۔ لیکن نہیں جی۔۔۔ بابا کو تو اس کی صرف دھن دولت نظر آتی ہے۔ بیٹی چاہے جائے بھاڑ میں۔۔۔ دکھ سے چہرہ سرخ پڑ چکا تھا۔ کچھ دیر پہلے کی تازگی بھی مفقود تھی۔

چہرے کی خوبصورتی میں حقارت اور تکبر کی ملاوٹ نے اس کے اندر کی بدصورتی کو باہر ابھارنا شروع کر دیا تھا۔ اور وہ اس سے ناواقف تھی۔

اب ایسی بھی بات نہیں نتاشا اسفند اکرام کی شخصیت بھی بری نہیں ہے۔ کیوں زرناب؟ نوین نے معصومیت اوڑھتے ہوئے زرناب سے پوچھا تھا۔ زرناب مسکراہٹ دباتی سر ہلا گئی تھی۔ وہ دونو اس کی حالت سے لطف اٹھا رہی تھیں۔

اچھا اگر اتنا ہی اچھا ہے۔ تو تم کر لو نا اس سے شادی۔۔۔ میری تو جان چھوٹے۔ وہ جل کر بولی تھی۔

واہ کیا بات ہے۔ میں اندھی نہیں ہوں۔ نوین نے ناک سے مکھی اڑائی۔

ہاں لیکن میرے گھر والے ضرور ہیں۔ وہ کہہ رہی تھی۔

For more visit (exponovels.com)

شکل اور عقل کا خاصہ فقدان ہے۔ محترم کے پاس بس دولت کی چمک ہی ہے۔ زرناب کی بات کے اختتام پہ تینوں کا نیم قہقہ ریستوران کی فضا میں اپنا عکس چھوڑ گیا تھا۔

غرور اور تکبر سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ ان دونو چیزوں نے ان کی عقل پہ پردا ڈال دیا تھا۔ جو یہ سوچ ہی نہیں پار ہی تھیں کہ بات کس کے بارے میں کر رہی ہیں۔ اس انسان کے بارے میں جس کی کم شکلی میں اس کا اپنا اختیار تھا۔ اور نہ ان کی اچھی شکل میں ان کا اپنا۔

ذریت نے دور سے ان تینوں کو ہنستے دیکھا۔ اور ہاتھ میں پکڑے موبائل پہ کچھ لکھ کر کمال کو سنڈ کر دیا۔ وہ ایسی جگہ بیٹھا تھا۔ جہاں سے وہ نیچے کا منظر واضع دیکھ سکتا تھا۔ اسے ابھی اس کو اپنا انتظار کروانا تھا۔ بازی شروع ہو چکی تھی۔

....

تیز دھوپ پشاور میں کب کی اتر چکی تھی۔ اور دن کے اجالے میں زندگی پورے عروج کے ساتھ رواں دواں تھی۔

خان وِلا میں اس وقت ہو کا عالم تھا۔ گھر کے مرد کام کاج کے لیے نکل چکے تھے۔ اور اب رات سے پہلے واپس نہ آتے۔ اور عورتوں میں چچی جان اور امی جی تھیں جو دوبارہ سونے کے لئے لیٹ چکی تھیں۔ اب فرح اور پھوپو کیچن میں بیٹھی تھیں۔ آج کھانا ان دونو کو بنانا تھا۔ اس گھر میں چاہے جتنے بھی ملازم تھے۔ مگر کھانا عورتیں خود بناتی تھیں۔

پھوپو یار پلیز اچھے سے گولڈن کرنا فرائیز کو۔۔۔ میز کو ہلکے سے بجاتے ہوئے ایک بار پھر اس کی آواز کیچن کی شلفوں سے ٹکرا کر چھت سے ٹکراتی باہر نکل گئی تھی۔

دو پلیٹس موٹی تم کھا چکی ہو۔ اب بس۔۔۔ یہ میری ہے۔۔۔ زہرہ نے مڑے بغیر کہہ کر کام جاری رکھا تھا۔

توبہ ہے پھوپو۔۔۔ آپ کا خون تو سفید ہوتا جا رہا ہے۔ نظر نہ آنے والے آنسوں کو اس نے انگلی کی پوروں سے صاف کیا تھا۔

For more visit (exponovels.com)

بولتی رہو۔۔۔ صدا کی ناشکری۔ایک ماہ سے اوپر ہو چکا تمہیں آئے۔اور کوئی ایک دن بتاؤ جس دن میں نے فرائیز بنانے سے انکار کیا ہو۔ لیکن اب تمہارا مٹاپا مجھے نظر آ رہا ہے۔اس سے پہلے کہ تمہاری ماں تمہاری وجہ سے میری شادی جلدی کروائے۔ تم کچھ شرم کر لو۔۔۔

جانے دیں پھوپو۔۔۔ میری ماں آپ سے بہت ڈرتی ہے۔ سر ہلا کر کہہ گئی تھی۔اسے اپنی ناک لمبی ہوتی محسوس ہوئی تھی۔

ہائے میں صدقے جاؤں۔۔۔ میں ڈائن ہوں۔ جو خامخواہ بھابی کو ڈراؤں۔۔۔اور خاندان کی سیاست سے تمہارا، میرا کیا لینا دینا۔ ہم نے کونسا ساری زندگی ادھر رہنا ہے۔ فرائیز بن چکے تھے۔اور اب وہ انکو نکال نکال کر پلیٹ میں رکھ رہی تھیں۔

میرا تو پتا نہیں۔۔۔ ہاں آپ ضرور کراچی چلی جائیں گی۔اس نے ان کی پلیٹ سے گرم گرم تلے آلو کے ٹکڑے کو منہ میں رکھا۔اور جلد ہی نکال بھی دیا۔ منہ جل اٹھا تھا۔

کیوں ساری زندگی ماں کے گھٹنے سے لگنے کا ارادہ ہے؟اس کے سامنے کی کرسی انہوں نے بیٹھنے کے لیئے گھسیٹ لی تھی۔

ہاں۔۔۔ میری ماں تو جیسے میرے پیار میں دیوانی ہے۔۔۔اس نے تاسف سے سر ہلایا تھا۔

ناشکری۔۔۔ جتنا پیار بھابی تم سے کرتی ہیں۔اتنا چھوٹی بھابی بھی اپنے بچوں سے نہیں کرتی ہوں گی۔ بس تم ہی ماں کے بارے میں غلط فہمی کا شکار ہو۔ وہ اسے سمجھا رہی تھیں۔ماضی، ماضی تھا۔ جو گزر گیا۔

جانے دیں پھوپو۔۔۔ آپ یہ بات خود بھی جانتی ہیں کہ امی جی آج بھی رضا کے مرنے کی وجہ مجھے سمجھتی ہیں۔

نہیں میری جان۔۔۔ تم تو خود تب محض چودہ سال کی تھی۔۔۔اور حادثے تو زندگی کا حصہ ہیں۔اگر رضا تب اس حادثے میں نہ مارا جاتا۔ تو شائد کوئی اور وجہ بن جاتی۔

نہیں پھوپو۔۔۔اس نے نفی میں سر ہلایا تھا۔

رضا مجھے بچاتے مرا۔ تب بڑی میں تھی۔ اس کا تحافظ میری ذمہ داری تھی۔ لیکن مجھے سمجھ نہیں آئی۔ کیسے اس نے مجھے بچھانے کے لیئے خود کو بس کے آگے دے دیا۔ مجھے وہاں سے ہٹنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ اسے میری ضرورت تھی۔ وہ خود بھی تو محض تیرہ سال کا ہی تھا نا۔ امی، اور باقی سب کا سہارا تھا وہ۔ میری تو پھر خیر تھی۔ وہ میز کی سطح کو اپنے ناخن کی نوک سے کھرچ رہی تھی۔ ایک بھی آنسو اس کی آنکھ سے باہر نہیں نکلا تھا۔ آنسوں کے بغیر بھی تو رویا جاتا ہے نا۔

رضا فرح سے ایک سال چھوٹا تھا۔ دونو کی خوب بنتی تھی۔ ایک ہی سکول میں پڑھتے تھے۔ تب ابھی وہ سوات میں رہ رہیے تھے۔ اور دادی زندہ تھیں۔ دادی ہی کی وجہ سے وہ لوگ پشاور نہیں آرہیے تھے۔ وہ آخری دم تک اپنے شوہر کے گھر میں رہنا چاہتی تھیں۔ جہان رضا کی موت نے اس کی ماں کو اس سے چھیں لیا تھا۔ وہیں دادی بھی لاڈلے پوتے کی موت کو سہار نہ پائیں تھیں۔ اور رضا کے جانے کے تیسرے روز ہی وہ بھی اس کا ساتھ چھوڑ گئ تھیں۔ اور اس کے بعد تو جیسے امی جی نے اس سے بات کرنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ اپنے تمام حقوق سے اسے آزادی دے دی تھی۔ وہ سمجھ سکتی تھی۔ بیٹے کی موت کی وجہ بننے والی لڑکی کے لیئے ان کے دل میں جگہ بن بھی کیسے سکتی تھی۔ اب تو ویسے ہی صبر آ گیا تھا۔

فری۔۔۔ اپنے اندر کی اس گھٹن کو باہر نکال دو۔۔۔ تم میری بیٹی ہو۔ انہوں نے اپنے سامنے کی پلیٹ کو اس کے سامنے کر دیا تھا۔ وہ ان کی اس حرکت پہ مسکرائی تھی۔

اس نے ہاتھ بڑھا کر ایک پیس اٹھایا تھا۔ جب ان کی بات سن کے اس کا منہ کھل گیا تھا۔

اے ے ے۔۔۔ کس کی اجازت سے لی۔ یہ میری ہے۔ انہوں نے دی پلیٹ واپس کھینچ لی تھی۔

لیکن ابھی تو دی آپ نے۔۔۔ اس کا منہ لٹک گیا تھا۔ چند لمحے پھوپو اس کی جانب دیکھتی رہی تھیں۔ جہاں صدیوں کی مسکینیت ٹپک رہی تھی۔

دفعہ ہو لو۔۔۔ چڑھ کر پلیٹ ہی پٹخ دی۔ فرح کی ہنسی کا فوارہ یک دم پھوٹا تھا۔ جس کا حصہ زہرہ خود بھی تھیں۔ وہ اس کو ہنسانے میں کامیاب ٹھری تھیں۔

....

لان کے خوبصورت رنگ برنگے پھولوں نے ماحول پہ اچھا اثر چھوڑ تھا۔لاہور میں آج موسم خوب اٹھکیلیاں کرتا معلوم ہو رہا تھا۔خوش رنگ پھولوں نے اس کی تعبیت کو خاصی تازگی بخشی تھی۔۔۔

باجی۔۔۔کیاریوں میں کونسے پودے لگاؤں۔نئے مالی لڑکے سے اس نے آج ہی کیاریان بناوائی تھیں۔اور اب وہ پادوں کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔

سارے صدا بہار کے پودے لگادیں۔اور جو پیچھلی جانب کیاریاں ہیں۔وہاں امرود۔۔۔ابھی بات اس کے منہ میں ہی تھی۔جب کسی انجانی گاڑی کا ہارن بجا تھا۔اور پھر گارڈ نے گیٹ چوپٹ کر دیا تھا۔

گاڑی کی آواز پہ بابا اور بابر بھائی بھی باہر چلے آئے تھے۔اس نے تیزی سے ملازم کو احکامات دے کر اپنا رخ بھی مہمانوں کی جانب کر لیا تھا۔دور سے آنے والی خاتون جانی پہچانی معلوم ہوئی تھیں۔اور جب پاس گئی۔تو حیرت سے اس کا منہ کھلا رہ گیا تھا۔

یہ تو وہی خوبصورت آواز والی آنٹی تھیں۔جن کی آواز کسی بھی ریڈیو میں بولنے والی سے کہیں خوبصورت تھی۔

وہ بھی جیسے اس کی حیرت بھامپ گئی۔آگے بڑھ کر اسے ایک کندھے سے ساتھ لگاتے گویا ہوئی تھیں۔

ماہ نور بچے کیسے ہو؟وہی حلاوت بھرا انداز۔

میں ٹھیک آنٹی۔وہ شاک میں تھی۔

آپ تو مجھے بھول ہی گئی تھی۔میں آپ کو یاد ہوں بھی یا نہیں۔وہ اس سے پوچھ رہی تھیں۔

سوچنے والی بات ہے۔میں بھلا آپ سے رابطہ کیسے کرتی۔اس نے محض سوچا تھا۔

نہیں ایسی بات نہیں ہے۔

دادی میں مفت میں تو نہیں آئی۔ مریم آپی کی آواز پہ وہ مڑی تھی۔ دادی نے مسکرا کر اس سے مریم اور احمد کا تعارف کر وایا۔ تو اسے بے اختیار وہ سڑیل مزاج سا ان کا پوتا یاد آیا تھا۔ جو کہیں سے بھی ان نرم اور خوش مزاج عورتوں کا بھائی اور پوتا نہیں لگتا تھا۔

باتوں کے دوران مہمانوں کو ڈرائینگ روم میں لایا گیا تھا۔

مہمانوں کے آتے ہی کیچن کے کاموں میں تیزی آگئی تھی۔

ماہا بیٹا جاؤ۔ بتول آنٹی سے بولو ریفریشمنٹ کا انتظام کریں۔ وہ جو وہیں بیٹھنے لگی تھی۔ بابا کے حکم پہ بابر بھائی کو اشارہ کرتی باہر نکل آئی تھی۔

آنٹی سب ریڈی ہے؟ اس نے ایک نظر ٹرالی پہ سجی چیزوں پہ ڈال کر پوچھا۔ چائے ابھی کپوں میں انڈھیلی جا رہی تھی۔

جی بچے بس ہو گیا۔۔۔ وہ مطمئن سی ہو کر نمکو کھانے لگی تھی۔ جب بابر بھائی کیچن میں داخل ہوئے اور اسے شلف پہ چڑھ کر نمکو کھاتا دیکھ کر کانوں کو ہاتھ لگایا۔ پہلی لڑکی ہے جو اپنے سسرالیوں کے آنے پہ اتنی خوش ہے۔

ہیں۔۔۔ کونسے سسرالی؟ وہ جیسے سمجھی نہ ہو۔ لیکن اندر سے حیرت کے سمندر میں ابال اٹھا تھا۔

وہی جو آئے ہیں۔ منصوبے کے مطابق اسے بالکل وقت پہ بتانا تھا۔ اور وہ اب بتا رہیے تھا۔

نہیں۔۔۔ جائیں بھائی۔ آپ کو نہیں پتا۔ یہ تو لفٹ والی آنٹی ہیں۔ اسے ان کی بات مزاق لگی تھی۔ بھلا ایسے کیسے ہو سکتا تھا۔ حقیقی زندگی اور اس طرح کی کہانیوں میں بڑا فرق ہوتا ہے۔

نہیں گڑیا میں سچ بول رہا ہوں۔ بابا نے منا کیا تھا۔ کہ تمہیں ابھی نا بتایا جائے۔ اس کی شائد کوئی وجہ ہو۔ وہ جو سوچ رہا تھا کہ اس کو چھیڑے گا۔ اس کا اڑتا رنگ دیکھ کر ڈھیلا پڑ گیا تھا۔

بھائی صاحب میرے پوتے کو آپ جان ہی چکے ہوں گے۔ میرا آپ سے رابطہ کرنے کا مقصد بھی یہی تھا۔ کہ اس سے پہلے کے ہم آپ سے رشتہ لانے کی اجازت چاہیں۔ آپ ایک دفعہ ذریت کے بارے میں جان لیں۔ پھر ہی ہم بات کو آگے بڑھائیں۔ دادی جان کا وہی اندازِ گفتگو تھا۔ جو مقابل کو ڈھیر کر جاتا تھا۔

جی۔۔۔انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔ وقت اور حالات کا پتا نہیں ہوتا۔ کون جانے کتنی زندگی ہو۔ میں جلد از جلد ماہ نور کو اس کے گھر کا کر دینا چاہتا ہوں۔ آپ کا پوتا بہت اچھا ہے۔

میں مل چکا ہوں۔ بزنس میں سب ایک دوسرے کو جانتے ہی ہوتے ہیں۔ بس میں اپنے بڑے بیٹے کے ساتھ ذرا مشورہ کر لینا چاہتا ہوں۔

چلیں آپ مشورہ کر لیجیئے۔ ویسے اگر سچ پوچھیں تو۔ مجھے آپ کی بچی اول روز سے اچھی لگتی ہے۔ میں نے خاص طور پہ مریم کو فرانس سے بلایا تھا۔ کہ آئے تو ہم آپ کی طرف آ سکیں۔

ویسے انکل ہمیں بھی ذرا جلدی ہی ہے۔ کچھ عرصے کے لئے میں بھی آئی ہوں۔ پھر نہ جانے کب آیا جائے۔ اس لئیے سوچا کہ لگے ہاتھ یہ بھی ہو جائے۔

ماہ نور بابر بھائی کے ساتھ ٹرالی دھکیلتی اندر لا رہی تھی۔ جب اس نے آخری فقرہ سنا۔ دل چاہا وہیں سب چھوڑ کر بھاگ جائے۔ لیکن بابا کی مسکراہٹ نے قدم روک لئے تھے۔

مریم جاؤ بچی کے ساتھ۔۔۔ وہ دادی کے حکم پہ مسکراتی اٹھ گئی تھیں۔

ہلو چیمپین۔۔۔ بابر بھائی جو کافی دیر سے اس شرارتی بچے کو نوٹ کر رہا تھا۔ آخر اس کی امی کے اٹھتے ہی متوجہ ہوا۔

ہائے۔۔۔ وہ شائد بور ہو رہا تھا۔ اسی لیئے ذرا اکتا کر جواب دیا۔

اگر مما نے سمجھایا نہ ہوتا۔ وہ اب تک دھما چوکڑی ضرور مچا چکا ہوتا۔ ایک ماں تھی جو اس طوفان کو روکے ہوئے تھی۔

کس کلاس میں ہو؟ وہ اس کے برابر صوفے پہ بیٹھ کر پوچھ رہا تھا۔

میں نی ءں پڑھتا۔اس نے اٹک اٹک کر جواب دیا۔اور پھر پاؤں جھلانے لگا۔

اچھا کیوں نہیں پڑھتے ؟ مسکراہٹ دبا کر پوچھا گیا۔

مما جی۔۔۔بھائی پوچھ رے می۔۔۔پڑھتا کوں نی ءں۔اس نے ڈائریکٹ ہی ماں سے پوچھ لیا تھا۔

مریم جو مسکراتے ہوئے ماہ نور سے کچھ کہہ رہی تھیں رکی۔دوسری طرف بابر شرمندہ ہوا۔

کیونکہ کہ آپ ابھی چھوٹے ہو۔سلجھے انداز میں جواب دے کر وہ واپس ماہ نور کی طرف متوجہ ہو چکی تھیں۔

مریم آپی کو ماہ نور بہت اچھی لگی تھی۔اس کا مسکرانا، نظریں جھکانا،ان کی شرارتوں کے جواب میں گھبرانا۔۔۔ملتے ہی دونو کی اچھی دوستی ہو گئی تھی۔

رات کے کھانے تک۔۔۔وہ لوگ ادھر رکے تھے۔اس دوران بابا کو ماہ نور ناراض ناراض سی لگی تھی۔وہ ان سے سچ میں ناراض تھی۔

مہمانوں کے جانے کے بعد،وہ بابا سے بات کئے بغیر ہی سیڑھیاں چڑھتی،اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔اسے اس وقت بابا سے سخت شکایت تھی۔اور وہ دونو بھی جیسے اس کی ناراضگی سمجھ گئے تھے۔اسی لئے بابا اور بابر بھائی دروازے پہ دستک دیتے اندر آئے۔تو ناراضگی کے اظہار کے طور پہ،بیڈ پہ بیٹھی چہرے کا روخ موڑ گئی۔ان دونوں نے اس کی یہ حرکت نوٹ کی تھی۔

ماہا۔۔۔گڑیا ناراض ہو؟ بابا اس کے قریب بیٹھتے دستِ شفقت رکھ کر پوچھ رہیے تھے۔

وہ بھی جیسے بھری بیٹھی تھی۔آنسو اس کا چہرہ بھگونے لگے۔وہ ان کے سینے سے لگی۔بے اختیار روتی چلی گئی تھی۔ابتسام صاحب کی پریشانی بڑھی۔

بابا میں آپ کو اور بھائی لوگوں کو نہیں چھوڑنا چاہتی۔میں آپ کے بغیر کیسے رہوں گی بابا۔وہ روتے ہوئے بال رہی تھی۔بابر بھائی بھی آ بیٹھا تھا۔اس نے ماہ نور کو دائیں جانب سے پکڑ رکھا تھا۔

میری گڑیا۔ بابا کی جان۔۔۔رومت میں آپ کو ابھی تھوڑی بھیج رہاہوں۔ابھی تو ابرار بھی نہیں آیا۔

مانو۔دیکھو رومت ہم ہیں نا۔ بابر بھائی کا دل بھی پگھلا تھا۔

لیکن میں آپ کو کبھی چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔وہ اب فرمائش کر رہی تھی۔ابتیسام صاحب مسکرائے تھے۔

اچھا میری جان۔ابھی تو وہ لوگ گئے ہی ہیں۔اب آپ روگی تو مجھے ساری رات نیند نہیں آئے گی۔اور پھر کچھ دیر میں ابرار بھی آنے والا ہے۔اس چہرے کے ساتھ بھائی کا ویلکم کریں گی آپ؟

اسنے بھی ان کی نیند کا سن کے آنسو جھٹ سے صاف کئے تھے۔کہ اپنے عزیز از جان بابا کی بے آرامی وہ کیسے برداشت کر سکتی تھی۔

وہ لوگ ابھی انہیں باتوں میں مگن تھے۔جب گیٹ پہ گاڑی کا ہارن بجا۔اور گویا تینوں افراد کے پاؤں کے نیچے ٹائیر لگ گئے ہوں۔گھر کا بڑا بیٹا آیا تھا۔ابرار آیا تھا۔

سورج کی روشنی نے ہر چیز کو روشن کرر کھا تھا۔مطلع صاف تھا۔موسمِ بہار کا وسط چل رہا تھا۔ہلکی ہوا کے دوش پہ اس کی کمرے کی کھڑکی پہ موجود پردے پھڑ پھڑا رہے تھے، گویا بے چین تھے۔اس نے قد آدم شیشے کے سامنے کھڑے ہو کر گیلے بالوں کو سدھارا۔اور پھر پھڑ پھڑاتے پردے ہٹادئے۔لیکن پھر پھولوں کی تیز خوشبو کی وجہ سے اسے ان کو برابر کرنا پڑا۔اسے گلاب کی خشبو پسند نہ تھی۔

وہ اس وقت نیلے ٹراؤزر کے ساتھ، سفید ٹی شرٹ میں اچھا دکھ رہا تھا۔آج اتور ہونے کی وجہ سے وہ اپنے روٹین کے حولیئے سے الگ دکھ رہا تھا۔

اس نے موبائل کی سکرین کو دائیں جانب کے بٹن سے آن کیا۔اور ساتھ ہی بڑھ کر دروازہ کھولتا باہر آگیا۔

موبائل کی سکرین روشن ہوتے ہی اس نے ان بوکس کھولا۔اور پھر ایک دلفریب مسکراہٹ اس کے ہونٹوں کو چھوتی چلی گئی تھی۔وہ جو چاہ رہا تھا وہی ہوا تھا۔وہ اسے اپنے دوستوں کے ساتھ پارٹی پہ بلا رہی تھی۔ایک ہفتے کے دوران ان کی دوستی اتنی گہری ہو ہی چکی تھی۔کہ وہ اب اس سے فرمائشیں کرنے لگی تھی۔

اس کی انگلیاں سکرین پہ تھرکنے لگیں۔

سوری ڈیئر میں کچھ بزی ہوں۔

آج بھی بزی؟وہ پوچھ رہی تھی۔جواب کچھ لمحوں بعد آیا۔وہ گلاس ڈور کھولتا ڈائینگ روم میں آچکا تھا۔جہاں بیٹھی دادی نے مسرور ہو کر اسے دیکھا۔آگیا میرا لال۔ادھر آ۔ادھر آکر بیٹھ۔انہوں نے بائیں جانب کی کرسی کو اس کے لئیے گھسیٹا تھا۔

کیسی ہیں میری جان۔اس نے بیٹھنے سے قبل انکے ماتھے کا بوسہ لیا۔

ٹھیک ہوں اگر گھٹنوں کا درد ساتھ نہ ہو تو۔وہ اس وقت تسبیحات کا ورد کیا کرتی تھیں۔سو اسی میں مصروف بولی تھیں۔مگر نظریں اس کے چہرے کے ایک ایک نقش کو چھو رہی تھیں۔وہ جو موبائل پہ جھکا کچھ ٹائپ کر رہا تھا،ان کے اس طرح دیکھنے پہ سیدھا ہو تھا۔

کیا دیکھ رہی ہیں؟

میں دیکھ رہی ہوں۔کہ آج جو تو اتفاق سے گھر ہے ہی۔تو بیٹا ذرا اس بیماری (موبائل) سے بھی صبر کر لے۔اور مجھ بوڑھی کی بھی سن لے۔

وہ سن کر شرمندہ ہوتا موبائل رکھ چکا تھا۔جی بولیں۔میں سن رہا ہوں۔

مریم بیٹا ذرا بھائی کے لیئے بھی ناشتہ بنادو۔ ڈائینگ روم اور کیچن کو شیشے کی شفاف دیوار سے الگ کیا گیا تھا۔ جہاں مریم آپی کھڑی اس وقت ناشتہ بنانے کے ساتھ ساتھ گاہے بگاہے شفاف دیوار کے پار بھی دیکھ رہی تھیں۔ ہاتھوں میں پہلے سے تیزی آچکی تھی۔

میں کہہ رہی ہوں کہ میری ٹانگ کا درد بڑھتا جارہا ہے۔ اور دوماہ بعد سردی آگئی۔ تو چلنا پھرنا محال ہوجائے گا۔ تکلیف کا احساس ان کی جھریوں زدہ چہرے پہ واضح تھا۔

وہ یک دم فکر مندی سے اٹھ کر ان کے گھٹنوں پہ ہاتھ رکھ کر آگے کو جھکا۔

کیا درد میں کمی نہیں آئی؟ میڈیسن کا فائدہ نہیں ہو رہا؟ لہجہ پریشانی لیئے ہوئے تھا۔

کرتی ہے مگر وقتی۔ آرام آنے لگتا ہے تو پھر سے اگر ذرا چل پھر لوں تو پھر وہی حال۔ وہ اسے بتا رہی تھیں۔ اور نظریں گاہے بگاہے شفاف دیوار کے پار بھی اٹھ رہی تھیں۔

یہ سب آپنے مجھے کیوں نہیں بتایا۔ میں ابھی کال کرتا ہوں ڈاکٹر کو۔ آپ کا سفر کرنا مناسب نہیں ہے۔ کچھ دیر پہلے کی تازگی مفقود تھی۔

بتاتی کیسے؟ تم تو گھر پہ ہی نہیں ٹکتے۔ اتوار والے دن اب اللہ پاک جانے کیا کھودنے آفس چلے جاتے ہو۔ جب سارے ملازمین چھوٹی پہ ہوتے ہیں۔ انداز نرم مگر شکایت کرتا تھا۔ اس کی اٹھی گردن شرمندگی میں جھکی تھی۔

میں شرمندہ ہوں دادی جان۔ آپ کہیں گی تو ہی آفس جاؤں گا ورنہ نہیں جاؤں گا۔ ہمیشہ کی طرح وہ ان کی شکایت پہ شرمندہ ہوا۔

میری جان تم کیوں شرمندہ ہوتے ہو۔ میں نے تو بس ایسے ہی بات کردہ تھی۔ انہوں نے جھک کر اس کے ہاتھ کا بوسہ لے کر شفقت سے چھوڑا۔

آپ کہہ رہی تھیں چلنے پھرنے کی وجہ سے تکلیف ہوتی ہے۔ تو پھر مت اٹھا کریں۔ میں ہوں نا! جو کام ہو مجھے بتا دیا کریں۔ یا پھر ظفر، آپی کو۔ لیکن آپ خود زحمت نہ کیا کریں۔ آپ کو تکلیف میں دیکھ کہ مجھے تکلیف ہوتی ہے۔ لوہا گرم ہو چکا تھا۔ یہی سہی وقت ہے بات منوانے کا۔

اب ہر وقت تو ایک جگہ بیٹھا نہیں جا سکتا نا ذریت۔ آپی بھی کھانے کی چیزیں لاتی بات میں حصہ لے کر واپس کیچن کی طرف بڑھ گئیں۔

چلیں میں ڈاکٹر کو کال کرتا ہوں۔ اب سے وہ ہر دو دن بعد آیا کرے گا۔ بول دوں گا میں۔ پھر چاہے جیسے مرضی گھومئے پھرئے گا۔ کوئی نہیں روکے گا۔ لیکن تب تک کے لئے محض آرام۔ وہ اس کی محبت اور تاکید پہ مسکرا کر رہ گئیں۔ وہ آذر کے جانے بعد بالکل ہی ہنسنا بھول گیا تھا۔

دادی کو ڈاکٹر کے ساتھ ساتھ بہو کی بھی ضرورت ہے۔ کیوں دادی؟ مریم آپی کی بات پہ وہ چونکا تھا۔ اور دادی کی طرف بھی دیکھا۔ جو آس بھری نظروں سے اسے ہی دیکھ رہی تھیں۔ اسے یاد آیا تھا کہ کس طرح سے اسے پیچھلے ایک سال سے وہ شادی کے لیئے منا رہی تھیں اور وہ مان کے نہیں دے رہا تھا۔

وہ ان کی آس بھری نظریں دیکھ کر انہیں بتا نہیں سکا تھا۔ کہ اسے باہر کی عورت پہ بھروسہ نہیں تھا۔ عورت نام کی چیز سے اسے حقارت و نفرت محسوس ہونے لگی تھی۔ جس کی وجہ سے، آج ایک ماں در در کی ٹھوکریں کھانے پہ مجبور تھی۔ جس کی وجہ سے بھائی جیسے بچپن کے دوست سے اس کا تعلق ہمیشہ کے لئے ختم ہو چکا تھا۔ عورت نام کے دھوکے کو وہ اپنے ارد گرد کیسے برداشت کرتا۔ جو ازل سے فساد کی جڑ رہی ہے۔

بہو کی کیا ضرورت ہے جب میں ہوں تو۔ وہ ٹال جانا چاہتا تھا۔ لیکن سامنے بیٹھی خواتین بھی اس کے انداز اتوار خوب جانتی تھیں۔

اچھا تم تو جیسے بڑا ٹکتے ہو گھر۔ اب یہ مت کہنا کہ اب رہ لوگے۔ کیونکہ ہی تم بھی جانتے ہو کہ یہ ممکن نہیں ہے۔ وہ اس کا منہ کھولتا دیکھ کو جھٹ بولی تھیں۔ وہ دادی کو دیکھ کر رہ گیا۔ جو خاموشی سے چائے کے گھونٹ لے رہی تھیں

باہر والی سے زیادہ آپ کو مجھ پہ بھروسہ ہونا چاہے۔ وہ ناراض نظر آیا۔ عام حالات میں بھائی کی ناراضگی وہ کبھی برداشت نہ کرتیں۔ مگر اب عام حالات نہیں تھے۔ یہ اسی کی زبان تھی۔ جو اسے سمجھ آتی تھی۔

کر کے دیکھا تم پہ بھی اعتبار۔ معمولی سی گھوٹنوں کی درد تک کا علاج تم کروا نہ سکے۔ وہ اس سے سخت نالاں تھیں۔ وہ یک دم گڑ بڑا گیا۔

دادی جھٹ مدد کے لئے پہنچیں۔ چھوڑو بھی مریم۔ تم تو صدا کی لڑاکا صفت ہی رہنا۔ پل میں میرے بچے کو ظالم بنا دیا۔

بات ظلم کی نہیں ہے دادی جان۔۔۔ اور بات سنو ذریت حسن اگر تم نہیں دادی جان کی کیئر کر سکتے تو بتا دو۔ میں لے جاؤں گی اپنی بوڑھی ماں کو اپنے ساتھ فرانس۔ آنکھوں میں نمی در آئی۔

وہ جو دادی کی سائڈ لینے پر پُر سکون ہو تھا۔ یک دم بکھلا گیا۔ نہیں دادی کو میں کہیں نہیں جانے دوں گا۔ اس نے تیزی سے ان کا ہاتھ بھی پکڑا آآآ جیسے ابھی وہ اسے تنہا چھوڑ کر چلی جائیں گی۔

دادی کے دل کو بھی کچھ ہوا۔ تو پوتی کو آنکھیں دیکھانے لگیں کہ اب بس اتنا کافی ہے۔ مگر مریم آپی خوب سمجھ رہی تھیں وقت کی نزاکت کو۔ اس لئے ان کی ایک نہ سنی اور بات جاری رکھی۔ میں سچ بول ہی ہوں۔ میں ایسا ہی کروں گی۔ اس سے پہلے تم فیصلہ کر لو۔ اتنا بول کر وہ ناشتے کی طرف ہاتھ بڑھا چکی تھیں۔

آپی غصہ مت کریں، اور آرام سے بات سنیں۔ میں ابھی شادی نہیں کر سکتا۔ بزنس میں۔۔۔

بزنس کا بہانا مت گھڑنا۔ جتنی تیزی سے تم ترقی کر رہے ہو مجھے سب معلوم ہے۔ تیزے سے انہوں نے اس کی بات کاٹی تھی۔ وہ گہرا سانس لے کر رہ گیا۔ سمجھ چکا تھا۔ انکو اب ہٹانا اس کے لیے ممکن نہ تھا۔ اس لئے ایک بار پھر سے دادی جان کو دیکھا۔ جو نہایت غم لے عالم میں چائے پینے کے دوران اس سے لا تعلق نظر آ رہی تھیں۔ مگر وہ افسردہ تھیں۔ وہ سمجھ چکا تھا۔

دادی جان آپ کے ساتھ کہیں نہیں جائیں گی۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔ کہہ کر وہ غصے میں پاؤں سے کرسی کو اٹھنے کے بعد ٹھوکر لگا کر گیا تھا۔

تو میں ہاں سمجھوں ؟ وہ آواز کی چہکار کو دبا کر بولی تھیں۔

جو مرضی کریں۔ وہ لاؤنج میں داخل ہوتے ہوئے بلند آواز سے کہہ کر ٹی وی آن کر چکا تھا۔

وہ دونو ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائیں تھیں۔ مشن پورا ہوا۔

ذریت بچے ناشتہ تو کرلو۔ اسے دادی جان کی آواز میں جوش اور خوشی محسوس ہوئی تھی۔ وہ گہرا سانس لے کر رہ گیا۔ آپ کی خاطر یہ بھی سہی۔ وہ سوچ کر رہ گیا۔

اس سب کے دوران نتاشا کہیں بہت پیچھے رہ گئی تھی۔ جو آج کل ذریت حسن کو شکار بنانے کے اونچے خواب دیکھ رہی تھی۔ لیکن شائد وہ یہ نہیں جانتی تھی، جہاں تک ذریت حسن کی پہنچ تھی۔ وہاں تک اسکا خیال بھی نہ تھا۔ وہ کاٹھ کا اولو بننے والا مرد نہیں تھا۔

....

امی جی کی اجازت اور چچی جان کے فون کو فارغ کرتے ہی وہ آ بیٹھی تھی۔ جھٹ پٹ ماہ نور کے گھر کا نمبر ملا ڈالا۔ وقفے وقفے سے بیل جاتی رہنے کے بعد فون اٹھا لیا گیا

اسلام وعلیکم! بھاری مردانہ آواز سنتے ہی اس پہ شادیِ مرگ کی سی کیفیت چھا گئی۔

ہلو۔۔۔؟ دوسری طرف سے بولنے کے لیے بولا جا رہا تھا۔ فرح خان کا رنگ دوسری طرف سفید پڑ چکا تھا۔ اس نے تیزی سے لائن کاٹ دی۔

دوسری طرف فون پہ موجود ابرار ابتسام نے تاسف سے سر ہلا کر ابھی فون رکھا ہی تھا۔ جب گھنٹی ایک بار پھر سے بج اٹھی۔

For more visit (exponovels.com)

جی؟ بتائیں محترم۔ میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟ماؤتھ پیس سے گونجنے والی اسی آواز کو سن کی اس کا دماغ سن ہونے لگا۔آخر یہ نمبر بار بار غلط کیوں مل رہا ہے۔وہ سخت پریشان ہوئی تھی۔لیکن اس بار پھر سے اس نے کال کاٹنے میں منٹ نہیں لگایا تھا۔

شاباش ہے بھئی۔وہ بڑبڑا کر واپس فون کو رکھ کر کچھ فاصلے پہ پڑے اخبار کی طرف بڑھ گیا۔آج پاکستان میں یہ اس کی تیسری شام تھی۔اور ابھی ابھی وہ بابا کو آفس سے لے کر گھر آیا تھا۔اور اب ماہ نور کو کافی کا بول کر بیٹھا ہی تھا جب فون کی آواز پہ اسے اٹھ کر جانا پڑا تھا۔مگر عجیب مسلا تھا۔مقابل تھا کہ بول ہی نہیں رہا تھا۔اور اس کے صبر کا امتحان لینا چاہتا تھا۔

دوسری طرف فرح خان کی جان سوکھ کر رہ گئی تھی۔نمبرت وہ سہی ملا ہی تھی۔مگر آدمی پتہ نہیں کون تھا۔

ہائے اللہ یہ کون ہے۔پتہ نہیں کون پاگل انسان ہے۔آواز سے ہی جاہل لگ رہا ہے۔وہ خود سے بڑبڑائی گے کچھ فاصلے سے آتی چچی جان نے سنا نہیں تھا۔مگر فون ہاتھ میں پکڑے پریشان بیٹھی فرح کو دیکھ کر ایک طنزیہ مسکراہٹ ضرور نمودار ہوئی تھی۔جس سے وہ ناواقف ہی رہی تھی۔

یہ لیں کافی۔۔۔اس نے مسکرا کر ابرار بھائی کر کافی تھمائی۔جو اخبار کی سرخیاں دیکھنے میں مصروف تھے۔

ابرار بھائی کیسا لگا آپ کو پاکستان؟دائیں گھٹنے پہ ٹھوڑی جمائے وہ دلچسپی سے اپنے خوبرو بھائی سے پوچھ رہی تھی۔جس کے چہرے پہ سیاہ فریم والے چشمے نے اس کے وجاہت کو بڑھا دیا تھا۔جو اس وقت شلوار قمیض میں خاصہ بردبار دکھائی دے رہا تھا۔

کیسا دیکھنا گڑیا۔۔۔جیسا ہے ویسا ہی دیکھے گا۔وہ اس کے سوال پہ مسکرا کر گویا ہوئے۔اور کچھ آگے جھک کر اخبار میز کی شفاف سطح پر رکھا۔

لے یہ کیا جواب ہوا۔۔۔وہ خوب بدمزہ ہوئی تھی۔اور مدلے میں بُرا سا منہ بنایا تو۔وہ جو اپنی نازک سی کلیوں جیسی بہن کی جدائی کا سوچ کر افسردہ ہو رہے تھے۔اس کے چہرے کے تاثرات نے انہیں قہقہ لگانے پہ مجبور کر دیا تھا۔

یہ۔۔۔یہ ابھی کیا کیا تم نے؟وہ ان کی بات کا مطلب سمجھ نہ پائی تھی۔

کیا؟

یہ ابھی جو تم نے منہ بگاڑا تھا۔ یہ دوبارہ کرنا۔ اسے ان کا ہنسنا اچھا لگا تھا۔

کیوں؟ وہ ہنس پڑی۔

ماہا کرونا۔ وہ اسے ابھی بھی وہی دو سال کی ماہا ہی سمجھتے تھے۔ اور وہ ایکٹ بھی تو ایسے ہی کر رہی تھی۔

میں جوکر نہیں ہوں۔۔۔

کرو تو۔۔۔ تم جب چار سال کی تھی تب یہی تمہاری عادت تھی۔ اب بھی یہی عادت ہے۔ بہت کچھ یاد آنے لگا تھا۔

ہاں سچی۔ بس ایک یہ عادت نہیں جاتی میری ناک چڑھانے والی۔ وہ بھی انکی ہنسی میں انکا ساتھ دی رہی تھی۔ جب فون کی گھنٹی نے تیسری آواز پیدا کی تھی۔

ابرار بھائی کو اٹھتے اور پھر فون کی جانب جاتے۔ اور پھر کال نہ اٹھاتے دیکھ کر اسے حیرت ہوئی تھی۔

کیا ہوا کال کیوں نہیں پِک کی؟۔ وہ اٹھ کر برابر کھڑی پوچھ رہی تھی۔

ایسے ہی کوئی فارغ انسان ہے۔ بار بار کال کرتا ہے۔ اور جب میں بولتا ہوں تو جواب ندارد۔

کال اب بھی آ رہی تھی۔ اس نے آنے والے نمبر کو دیکھا۔ اور منہ پہ ہاتھ رکھ کر ہنسی کے فوارے کو پھوٹنے سے روکا۔

کیا ہوا؟ وہ معصومیت سے اس سے پوچھ رہے تھے۔ جو آنے والی کال سننے کی غرض سے جانبوجھ کر سپیکر کھول چکی تھی۔

اسلام و علیکم فری۔۔۔ اس نے مسکراہٹ روک کر سلام میں پہل کی تو دوسری طرف لمبی سانس لی گئی۔ جیسے لمبی تھکاوٹ زدہ محنت کے بعد لی جاتی ہے۔

مرو یہ کونسا واہیات سا نمبر دے دیا ہے۔ جو تیسری بار ملانے پہ سہی جگہ ملا ہے۔ اس کی آواز میں خوف اور غصہ ایک ساتھ تھے۔

For more visit (exponovels.com)

ماہ نور اور ساتھ کھڑا ابرار اس کی بات پہ نہ جانے کیسے اپنی ہنسی کو روک سکے تھے۔

کیا بول رہی ہو۔ میں سمجھی نہیں؟ وہ اس سے استفسار کر رہی تھی۔

مت پوچھو۔۔۔ میں نے تم کو یہ تیسری بار کال کی ہے۔ ہر بار پتہ نہیں کون۔ عجیب سی کھردری سی آواز والا آدمی میں فون اٹھا رہا تھا۔ میری تو مانو جان ہی نکل گئی۔ آواز سے وہ خاصی پریشان لگی تھی۔ جبکہ دا سری طرف وہ دونو ہنسی روکنے کے چکر میں سرخ ہو چکے تھے۔

اچھا کیا بول رہے تھے وہ؟ کون تھے تم نے پوچھا؟

نہیں یار میں نے نہیں پوچھا۔ آواز سے تو جاہل سا آدمی لگ رہا تھا۔ موٹا سا۔۔۔ اس کی بات اس کے ماہ نور اور ابرار بھائی کا قہقہ ایک ساتھ گونجا تھا۔ ماہ نور نے تیزی سے کال کاٹ دی۔ تا کہ وہ سن نہ سکے۔ اسے دکھ ہوتا۔ جبکہ دوسری طرف وہ دونو موٹا اور نہ جانے کیا کیا، عجیب و غریب الفاظ سن کے ہنستے چلے گئے تھے۔

یہ کون تھی اس قدر دور اندیش خاتون۔ وہ ہنسنے کے بعد گہرے گہرے سانس لے کر پوچھ رہے تھے۔

جواب میں اس نے ہنستے ہوئے فرح خان کا مختصر تعارف کروا دیا۔

....

ہلو بیوٹی کوئین۔۔۔ وہ جو بے تابی سے ہوٹل میں بیٹھی انتظار کی تکلیف سے دوچار تھی۔ اس کی آواز اپنی پشت پہ سن کے چونک کے سیدھی ہوئی۔

ہلو۔۔۔ اس نے پُرجوش انداز میں اس سے ہاتھ ملایا۔ اس کے ہاتھ کی سختی اور آنکھوں میں موجود سرد مہری نے چند لمحوں کے لئے ساکت کیا تھا۔ مگر پھر وہ اگنور کر گئی۔

آپ نے دیر کیوں کی؟ آدھا گھنٹہ جناب آپ لیٹ ہیں۔ وہ ناراضگی سے کہہ رہی تھی۔ ذریت جو موبائل پہ تیزی سے ٹائپ کر رہا تھا۔ اس کی سکرین پہ تھرکتی انگلیاں چند پل کو رکی تھیں۔

میں اپنی مرضی کا مالک ہوں۔ میں نے تو نہیں کہا تھا۔ کہ انتظار کرو۔ چلی جاتی۔ وہ رکھائی سے کہہ کے فون رکھتا سامنے کی جانب دیکھنے لگا۔ اس وقت مین ڈور اس کی پشت پہ تھا۔

نہ۔۔۔ نہیں میرا مطلب ٹائم کی پابندی بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ وہ یک دم گڑبڑا گئی تھی۔

ہاں تو محترمہ میں فارغ انسان تھوڑی ہوں۔ اب میں اپنے اتنے ضروری کام چھوڑ کر تو نہیں آسکتا نا۔ انداز اب بھی سخت تھا۔ خفت سے یک دم اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آئی تھی۔ کہ وہ اس انسان کی خاطر خود کو کیوں اتنا ذلیل کروا رہی تھی۔ اس نے جھوکے سر کو اٹھا کر اس کی جانب دیکھا۔ اور پھر اسے اپنے اندر کا سوال خود بخود جواب دیتا محسوس ہوا۔ نتاشا سمجھ سکتی تھی۔ حسین لوگوں کا نخرہ بھی ادا ہی کہلاتا ہے۔

اچھا آپ ناراض مت ہوں۔ میں تو بس یوں ہی پوچھ رہی تھی۔ چلیں آڈر کرتے ہیں۔ وہ مسکرا کر اس کا غصہ کم کرنے کی کوشش کرنے لگی تھی۔ وہ بھی اس کی مسکراہٹ دیکھ کر ٹھنڈا ہوا تھا۔

ہاں۔۔۔ مگر لنچ میری طرف سے ہو گا۔ اس نے مینیو کارڈ اٹھاتے ہوئے۔ کہا تو ایک بار پھر اُلجھی۔

مگر پر امس تھا۔ کہ آج کا لنچ میری طرف سے ہو گا۔ آج دوسری بار وہ لنچ اس کے ساتھ کر رہی تھی۔ پیچھلی بار بھی اسی نے لنچ کروایا تھا۔ اور وعدے کے مطابق اب کی باریہ لنچ اس کی طرف سے تھا۔ مگر وہ پھر ضد پہ تھا۔

لو۔۔۔ ڈئیر۔۔۔ ذریت حسن کی آواز کو اسی کے فون نے کاٹا تھا۔ اس نے مینیو کارڈ ایک جانب رکھ کر آنے والی کال کو کاٹا۔ اور پھر میز پہ موجود اس کے سفید ہاتھ کو اپنی آہنی گرفت میں کرتے ہوئے نہایت جزبے کے عالم میں خود کو کہتے سنا تھا۔

وہ ہک دک اسی کو دیکھ رہی تھی۔ اور وہ کہہ رہا تھا۔

اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ لنچ تم کرواؤ یا میں۔ بات تو ایک ہی ہے۔ ہم کونسا غیر ہیں۔ میں تمہارا دوست ہوں۔ اور دوستوں میں سب چلتا ہے۔ مسکرا کر اس نے اس کے ہاتھ کو چھوڑ دیا۔ اور پھر واپس مینو کارڈ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ جبکہ دوسری طرف موجود ہستی کچھ دیر پہلے واقع ہونے والے لمحے کے سحر میں مقید ہو کر رہ گئی تھی۔

مگر نیکسٹ ٹائم یہ چیٹنگ نہیں چلے گی۔وہ مسکرا کر کہہ رہی تھی۔

زریت نے ایک بھرپور قہقہ لگایا تھا۔گو یا مقابل کی بات کو خوب انجوائے کیا ہو۔کل کس نے دیکھی ہے ڈئیر نتاشا۔نتاشا جو اس کے چہرے کی مسکراہٹ کے سحر میں میں تھی چونکی۔

میں۔۔۔جانتی ہوں۔ہم کل ضرور ملیں گے۔وہ یقین سے کہہ رہی تھی۔

اچھا۔۔۔تم کیسے جانتی ہو؟۔وہ اس کی بات پہ ہنسا۔اور ساتھ ہی کچھ فاصلے پہ کھڑے ویٹر کو آڈر بھی نوٹ کروادیا۔

کیا خوبصورتی کا سحر ہی کافی نہیں ہوتا۔کسی بھی انسان کو بے بس کر دینے کے لیے۔ایک ادا سے وہ کہہ رہی تھی۔ساتھ ہی گال پہ جھولتی لٹ کو بھی شہادت کی انگلی سے بل دے رہی تھی۔

اچھاااا۔۔۔۔اس نے اچھا کو خاصا لمبا کیا تھا۔

بالکل۔۔۔حسن ایک ایسا سحر ہے۔جو انسان کی عقل کو دیمک کی طرح چاٹ جاتا ہے۔پھر اس سحر سے نکلنا آسان نہیں رہتا۔

ہر سحر کا توڑ ہے۔مادام۔۔۔تبھی کھانا بھی آ گیا۔تو دونو کو چپ ہونا پڑا۔

دیکھتے ہیں۔آپ نکال پاتے ہیں اس سحر کا توڑ یا نہیں۔اس کی بات پہ ایک عجیب سی مسکراہٹ نے زریت حسن کے چہرے پہ عکس چھوڑا تھا۔مگر وہ چپ ہی رہا۔

کھانا کھانے کے بعد وہ اہم میٹنگ کا کہہ کے اٹھ آیا تھا۔مگر اُٹھنے سے پہلے اس نے دوبارہ ملنے کی کوئی بات نہیں کی تھی۔ہمیشہ کی طرح۔

گاڑی کا ڈور کھولنے کے بعد اس نے بیٹھتے ساتھ ہی موبائل کی سکرین کو سائڈ کے بٹن سے آن کر کے کمال کو مسج کیا تھا۔

کام ہوا؟

For more visit (exponovels.com)

ہاں۔۔۔چند لمحوں بعد ہی جواب آگیا۔ جسے پڑھ کر اس کے چہرے کو خوبصورت مگر خطرناک مسکراہٹ نے اپنے ہصار میں لیا تھا۔

کمال اور بھی کچھ کہہ رہا تھا۔ جسے پڑھنے کے بعد اس نے رات کے ڈنر کی دعوت دے کر فون کو آف کر دیا تھا۔ ابھی اسے آفس جانا تھا

مہمانوں کے جانے کے بعد، وہ بابا سے بات کئے بغیر ہی سیڑھیاں چڑھتی، اپنے کمرے میں آگئی تھی۔ اسے اس وقت بابا سے سخت شکایت تھی۔ اور وہ دونو بھی جیسے اس کی ناراضگی سمجھ گئے تھے۔ اسی لئے بابا اور بابر بھائی دروازے پہ دستک دیتے اندر آئے۔ تو ناراضگی کے اظہار کے طور پہ، بیڈ پہ بیٹھی چہرے کا روخ موڑ گئی۔ ان دونوں نے اس کی یہ حرکت نوٹ کی تھی۔

ماہا۔۔۔ گڑیا ناراض ہو؟ بابا اس کے قریب بیٹھتے دستِ شفقت رکھ کر پوچھ رہیے تھے۔

وہ بھی جیسے بھری بیٹھی تھی۔ آنسو اس کا چہرہ بھگونے لگے۔ وہ ان کے سینے سے لگی۔ بے اختیار روتی چلی گئی تھی۔ ابتیسام صاحب کی پریشانی بڑھی۔

بابا میں آپ کو اور بھائی لوگوں کو نہیں چھوڑنا چاہتی۔ میں آپ کے بغیر کیسے رہوں گی بابا۔ وہ روتے ہوئے بول رہی تھی۔ بابر بھی آ بیٹھا۔ اس نے ماہ نور کو دائیں جانب سے پکڑ رکھا تھا۔

میری گڑیا۔ بابا کی جان۔۔۔ رومت میں آپ کو ابھی تھوڑی بھیج رہا ہوں۔ ابھی تو ابرار بھی نہیں آیا۔

مانو۔ دیکھو رومت ہم ہیں نا۔ بابر بھائی کا دل بھی پگھلا تھا۔

لیکن میں آپ کو کبھی چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔ وہ اب فرمائش کر رہی تھی۔ ابتیسام صاحب مسکرائے تھے۔

اچھا میری جان۔ ابھی تو وہ لوگ گئے ہی ہیں۔ اب آپ روگی تو مجھے ساری رات نیند نہیں آئے گی۔ اور پھر کچھ دیر میں ابرار بھی آنے والا ہے۔ اس چہرے کے ساتھ بھائی کا ویلکم کریں گی آپ؟

اسنے بھی ان کی نیند کا سن کے آنسو جھٹ سے صاف کئے تھے۔ کہ اپنے عزیز از جان بابا کی بے آرامی وہ کیسے برداشت کر سکتی تھی۔

وہ لوگ ابھی انہیں باتوں میں مگن تھے۔ جب گیٹ پہ گاڑی کا ہارن بجا۔ اور گویا تینوں افراد کے پاؤں کے نیچے ٹائیر لگ گئے ہوں۔ گھر کا بڑا بیٹا آیا تھا۔ ابرار آیا تھا۔

....

سورج کی روشنی نے ہر چیز کو روشن کرر کھا تھا۔ موسم صاف تھا۔ موسمِ بہار کا وسط چل رہا تھا۔ ہلکی ہوا کے دوش پہ اس کے کمرے کی کھڑکی پہ

موجود پردے پھڑ پھڑا رہیے تھے، گویا بے چین تھے۔ اس نے قد آدم شیشے کے سامنے کھڑے ہو کر گیلے بالوں کو سدھارا۔ اور پھر پھڑ پھڑاتے پردے ہٹادئے۔ لیکن پھر پھولوں کی تیز خوشبو کی وجہ سے اسے ان کو برابر کرنا پڑا۔ اسے گلاب کی خشبو پسند نہ تھی۔

وہ اس وقت نیلے ٹراوزر کے ساتھ، سفید ٹی شرٹ میں اچھا دکھ رہا تھا۔ آج اتور ہونے کی وجہ سے وہ اپنے روٹین کے حولیئے سے الگ دکھ رہا تھا۔

اس نے موبائل کی سکرین کو دائیں جانب کے بٹن سے آن کیا۔ اور ساتھ ہی بڑھ کر دروازہ کھولتا باہر آگیا۔

موبائل کی سکرین روشن ہوتے ہی اس نے ان بوکس کھولا۔ اور پھر ایک دلفریب مسکرہٹ اس کے ہونٹوں کو چھوتی چلی گئی۔ وہ جو چاہ رہا تھا وہی ہوا تھا۔ وہ اسے اپنے دوستوں کے ساتھ پارٹی پہ بلا رہی تھی۔ ایک ہفتے کے دوران ان کی دوستی اتنی گہری ہو ہی چکی تھی۔ کہ وہ اب اس سے فرمائشیں کرنے لگی تھی۔

اس کی انگلیاں سکرین پہ تھر کنے لگیں۔

سوری ڈیئر میں کچھ بزی ہوں۔

For more visit (exponovels.com)

آج بھی بزی؟ وہ پوچھ رہی تھی۔ جواب کچھ لمحوں بعد آیا۔ وہ گلاس ڈور کھولتا ڈائننگ روم میں آ چکا تھا۔ جہاں بیٹھی دادی نے مسرور ہو کر اسے دیکھا۔ آ گیا میرا لال۔ ادھر آؤ۔ ادھر آ کر بیٹھو۔ انہوں نے بائیں جانب کی کرسی کو اس کے لیئے گھسیٹا تھا۔

کیسی ہیں میری جان۔ اس نے بیٹھنے سے قبل انکے کے ماتھے کا بوسہ لیا۔

ٹھیک ہوں اگر گھٹنوں کا درد ساتھ نہ ہو تو۔ وہ اس وقت تسبیحات کا ورد کیا کرتی تھیں۔ سواسی میں مصروف بولی تھیں۔ مگر نظریں اس کے چہرے کے ایک ایک نقش کو چھو رہی تھیں۔ وہ جو موبائل پہ جھکا کچھ ٹائپ کر رہا تھا، ان کے اس طرح دیکھنے پہ سیدھا ہوا۔

کیا دیکھ رہی ہیں؟

میں دیکھ رہی ہوں۔ کہ آج جو اتفاق سے گھر ہو ہی۔ تو بیٹا ذرا اس بیماری (موبائل) سے بھی صبر کر لو۔ اور مجھ بوڑھی کی بھی سن لو۔

وہ سن کر شرمندہ ہوتا موبائل رکھ چکا تھا۔ جی بولیں۔ میں سن رہا ہوں۔

مریم بیٹا ذرا بھائی کے لیئے بھی ناشتہ بنا دو۔ ڈائننگ روم اور کیچن کو شیشے کی شفاف دیوار سے الگ کیا گیا تھا۔ جہاں مریم آپی کھڑی اس وقت ناشتہ بنانے کے ساتھ ساتھ گاہے بگاہے شفاف دیوار کے پار بھی دیکھ رہی تھیں۔ ہاتھوں میں پہلے سے تیزی آ چکی تھی۔

میں کہہ رہی ہوں کہ میری ٹانگ کا درد بڑھتا جا رہا ہے۔ اور دو ماہ بعد سردی آ گئی۔ تو چلنا پھرنا محال ہو جائے گا۔ تکلیف کا احساس ان کی جھریوں زدہ چہرے پہ واضح تھا۔

وہ یک دم فکرمندی سے اٹھ کر ان کے گھٹنوں پہ ہاتھ رکھ کر آگے کو جھکا۔

کیا درد میں کمی نہیں آئی؟ میڈیسن کا فائدہ نہیں ہو رہا؟ لہجہ پریشانی لیئے ہوئے تھا۔

کرتی ہے مگر وقتی۔ آرام آنے لگتا ہے تو پھر سے اگر ذرا چل پھر لوں تو پھر وہی حال۔ وہ اسے بتا رہی تھیں۔ اور نظریں گاہے بگاہے شفاف

دیوار کے پار بھی اٹھ رہی تھیں۔

یہ سب آپ نے مجھے کیوں نہیں بتایا۔ میں ابھی کال کرتا ہوں ڈاکٹر کو۔ آپ کا سفر کرنا مناسب نہیں ہے۔ کچھ دیر پہلے کی تازگی مفقود تھی۔

بتاتی کیسے ؟ تم تو گھر پہ ہی نہیں ٹکتے۔ اتوار والے دن اب اللہ پاک جانے کیا کھو دنے آفس چلے جاتے ہو۔ جب سارے ملازمین چھوٹی پہ ہوتے ہیں۔ انداز نرم مگر شکایت کرتا تھا۔ اس کی اٹھی گردن شرمندگی میں جھکی تھی۔

میں شرمندہ ہوں دادی جان۔ آپ کہیں گی تو ہی آفس جاؤں گا ورنہ نہیں جاؤں گا۔ ہمیشہ کی طرح وہ ان کی شکایت پہ شرمندہ ہوا۔

میری جان تم کیوں شرمندہ ہوتے ہو۔ میں نے تو بس ایسے ہی بات کر دہ تھی۔ انہوں نے جھک کر اس کے ہاتھ کا بوسہ لے کر شفقت سے چھوڑا۔

آپ کہہ رہی تھیں چلنے پھرنے کی وجہ سے تکلیف ہوتی ہے۔ تو پھر مت اٹھا کریں۔ میں ہوں نا! جو کام ہو مجھے بتا دیا کریں۔ یا پھر ظفر، آپی کو۔ لیکن آپ خود زحمت نہ کیا کریں۔ آپ کو تکلیف میں دیکھ کہ مجھے تکلیف ہوتی ہے۔ لوہا گرم ہو چکا تھا۔ یہی سہی وقت ہے بات منوانے کا۔

اب ہر وقت تو ایک جگہ بیٹھا نہیں جا سکتا نا ذریت۔ آپی بھی کھانے کی چیزیں لاتی بات میں حصہ لے کر واپس کیچن کی طرف بڑھ گئیں۔

چلیں میں ڈاکٹر کو کال کرتا ہوں۔ اب سے وہ ہر دو دن بعد آیا کرے گا۔ بول دوں گا میں۔ پھر چاہے جیسے مرضی گھومئے پھرئے گا۔ کوئی نہیں روکے گا۔ لیکن تب تک کے لئے محض آرام۔ وہ اس کی محبت اور تاکید پہ مسکرا کر رہ گئیں۔ وہ آذر کے جانے بعد بالکل ہی ہنسنا بھول گیا تھا۔

For more visit (exponovels.com)

دادی کو ڈاکٹر کے ساتھ ساتھ بہو کی بھی ضرورت ہے۔ کیوں دادی؟ مریم آپی کی بات پہ وہ چونکا تھا۔ اور دادی کی طرف بھی دیکھا۔ جو آس بھری نظروں سے اسے ہی دیکھ رہی تھیں۔ اسے یاد آیا تھا کہ کس طرح سے اسے پچھلے ایک سال سے وہ شادی کے لیئے منا رہی تھیں اور وہ مان کے نہیں دے رہا تھا۔

وہ ان کی آس بھری نظریں دیکھ کر انہیں بتا نہیں سکا تھا۔ کہ اسے باہر کی عورت پہ بھروسہ نہیں تھا۔ عورت نام کی چیز سے اسے حقارت و نفرت محسوس ہونے لگی تھی۔ جس کی وجہ سے، آج ایک ماں در در کی ٹھوکریں کھانے پہ مجبور تھی۔ جس کی وجہ سے بھائی جیسے بچپن کے دوست سے اس کا تعلق ہمیشہ کے لئے ختم ہو چکا تھا۔ عورت نام کے دھوکے کو وہ اپنے ارد گرد کیسے برداشت کرتا۔ جو ازل سے فساد کی جڑ رہی ہے۔

بہو کی کیا ضرورت ہے جب میں ہوں تو۔ وہ ٹال جانا چاہتا تھا۔ لیکن سامنے بیٹھی خواتین بھی اس کے انداز واطوار خوب جانتی تھیں۔

اچھا تم تو جیسے بڑا ٹکتے ہو گھر۔ اب یہ مت کہنا کہ اب رہ لو گے۔ کیونکہ تم بھی جانتے ہو کہ یہ ممکن نہیں ہے۔ وہ اس کا منہ کھولتا دیکھ کو جھٹ بولی تھیں۔ وہ دادی کو دیکھ کر رہ گیا۔ جو خاموشی سے چائے کے گھونٹ لے رہی تھیں

باہر والی سے زیادہ آپ کو مجھ پہ بھروسہ ہونا چاہے۔ وہ ناراض نظر آیا۔ عام حالات میں بھائی کی ناراضگی وہ کبھی برداشت نہ کرتیں۔ مگر اب عام حالات نہیں تھے۔ یہ اسی کی زبان تھی۔ جو اسے سمجھ آتی تھی۔

کر کے دیکھا تم پہ بھی اعتبار۔ معمولی سی گھوٹنوں کی درد تک کا علاج تم کروا نہ سکے۔ وہ اس سے سخت نالاں تھیں۔ وہ یک دم گڑبڑا گیا۔

دادی جھٹ مدد کے لئے پہنچیں۔ چھوڑو بھی مریم۔ تم تو سدا کی لڑاکا صفت ہی رہنا۔ پل میں میرے بچے کو ظالم بنا دیا۔

بات ظلم کی نہیں ہے دادی جان۔۔۔ اور بات سنو ذریت حسن اگر تم نہیں دادی جان کی کئیر نہیں کر سکتے تو بتا دو۔ میں لے جاؤں گی اپنی بوڑھی ماں کو اپنے ساتھ فرانس۔ آنکھوں میں نمی در آئی۔

وہ جو دادی کی سائڈ لینے پر پُر سکون ہوا تھا۔ یک دم بکھلا گیا۔ نہیں دادی کو میں کہیں نہیں جانے دوں گا۔ اس نے تیزی سے ان کا ہاتھ بھی پکڑا جیسے ابھی وہ اسے تنہا چھوڑ کر چلی جائیں گی۔

دادی کے دل کو بھی کچھ ہوا۔ تو پوتی کو آنکھیں دیکھانے لگیں کہ اب بس اتنا کافی ہے۔ مگر مریم آپی خوب سمجھ رہی تھیں وقت کی نزاکت کو۔ اس لئے ان کی ایک نہ سنی اور بات جاری رکھی۔ میں سچ بول ہی ہوں۔ میں ایسا ہی کروں گی۔ اس سے پہلے تم فیصلہ کر لو۔ اتنا بول کر وہ ناشتے کی طرف ہاتھ بڑھا چکی تھیں۔

آپی غصہ مت کریں، اور آرام سے بات سنیں۔ میں ابھی شادی نہیں کر سکتا۔ بزنس میں۔۔۔

بزنس کا بہانا مت گھڑنا۔ جتنی تیزی سے تم ترقی کر رہے ہو مجھے سب معلوم ہے۔ تیزی سے انہوں نے اس کی بات کاٹی تھی۔ وہ گہرا سانس لے کر رہ گیا۔ سمجھ چکا تھا۔ انکو اب ہٹانا اس کے لیے ممکن نہ تھا۔ اس لئے ایک بار پھر سے دادی جان کو دیکھا۔ جو نہایت غم کے عالم میں چائے پینے کے دوران اس سے لاتعلق نظر آرہی تھیں۔ مگر وہ افسردہ تھیں۔ وہ سمجھ چکا تھا۔

دادی جان آپ کے ساتھ کہیں نہیں جائیں گی۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔ کہہ کر وہ غصے میں پاؤں سے کرسی کو اٹھنے کے بعد ٹھوکر لگا کر گیا تھا۔

تو میں ہاں سمجھوں؟ وہ آواز کی چہکار کو دبا کر بولی تھیں۔

جو مرضی کریں۔ وہ لاؤنج میں داخل ہوتے ہوئے بلند آواز سے کہہ کر ٹی وی آن کر چکا تھا۔

وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائیں تھیں۔ مشن پورا ہوا۔

ذریت بچے ناشتہ تو کر لو۔ اسے دادی جان کی آواز میں جوش اور خوشی محسوس ہوئی تھی۔ وہ گہرا سانس لے کر رہ گیا۔ آپ کی خاطر یہ بھی سہی۔ وہ سوچ کر رہ گیا۔

اس سب کے دوران نتاشا کہیں بہت پیچھے رہ گئی تھی۔ جو آج کل ذریت حسن کو شکار بنانے کے اونچے خواب دیکھ رہی تھی۔ لیکن شائذ وہ یہ نہیں جانتی تھی، جہاں تک ذریت حسن کی پہنچ تھی۔ وہاں تک اسکا خیال بھی نہ تھا۔ وہ کاٹھ کا اولو بننے والا مرد نہیں تھا۔

....

امی جی کی اجازت اور چچی جان کے فون کو فارغ کرتے ہی وہ آ بیٹھی تھی۔ جھٹ پٹ ماہ نور کے گھر کا نمبر ملا ڈالا۔ وقفے وقفے سے بیل جاتی رہنے کے بعد فون اٹھالیا گیا

اسلام وعلیکم! بھاری مردانہ آواز سنتے ہی اس پہ شادیِ مرگ کی سی کیفیت چھا گئی۔

ہلو۔۔؟ دوسری طرف سے بولنے کے لیے اکسایا جا رہا تھا۔ فرح خان کا رنگ دوسری طرف سفید پڑ چکا تھا۔ اس نے تیزی سے لائن کاٹ

دی۔

دوسری طرف فون پہ موجود ابرار ابتسام نے تاسف سے سر ہلا کر ابھی فون رکھا ہی تھا۔ جب گھنٹی ایک بار پھر سے بج اٹھی۔

جی؟ بتائیں محترم۔ میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟ ماؤتھ پیس سے گونجنے والی اسی آواز کو سن کی اس کا دماغ سن ہونے لگا۔ آخر یہ نمبر بار بار غلط کیوں مل رہا ہے۔ وہ سخت پریشان ہوئی تھی۔ لیکن اس بار پھر سے اس نے کال کاٹنے میں منٹ نہیں لگایا تھا۔

شاباش ہے بھئی۔ وہ بڑبڑا کر واپس فون کو رکھ کر کچھ فاصلے پہ پڑے اخبار کی طرف بڑھ گیا۔ آج پاکستان میں یہ اس کی تیسری شام تھی۔ اور ابھی ابھی وہ بابا کو آفس سے لے کر گھر آیا تھا۔ اور اب ماہ نور کو کافی کا بول کر بیٹھا ہی تھا جب فون کی آواز پہ اسے اٹھ کر جانا پڑا تھا۔ مگر عجیب مسلہ تھا۔ مقابل تھا کہ بول ہی نہیں رہا تھا۔ اور اس کے صبر کا امتحان لینا چاہتا تھا۔

دوسری طرف فرح خان کی جان سوکھ کر رہ گئی تھی۔ نمبرت وہ سہی ملا ہی تھی۔ مگر آدمی غلط تھا۔

ہائے اللہ یہ کون ہے۔ پتہ نہیں کون پاگل انسان ہے۔ آواز سے ہی جاہل لگ رہا ہے۔ وہ خود سے بڑبڑائی کہ کچھ فاصلے سے آتی چچی جان نے سنا نہیں تھا۔ مگر فون ہاتھ میں پکڑے پریشان بیٹھی فرح کو دیکھ کر ایک طنزیہ مسکراہٹ ضرور نمودار ہوئی تھی۔ جس سے وہ ناواقف ہی رہی۔

یہ لیں کافی۔۔۔اس نے مسکرا کر ابرار بھائی کر کافی تھمائی۔ جو اخبار کی سرخیاں دیکھنے میں مصروف تھے۔

ابرار بھائی کیسا لگا آپ کو پاکستان؟ دائیں گھٹنے پہ ٹھوڑی جمائے وہ دلچسپی سے اپنے خوبرو بھائی سے پوچھ رہی تھی۔ جس کے چہرے پہ سیاہ فریم والے چشمے نے اس کے وجاہت کو بڑھا دیا تھا۔ جو اس وقت شلوار قمیض میں خاصہ بردبار دیکھائی دے رہا تھا۔

کیسا دکھنا گڑیا۔۔۔ جیسا ہے ویسا ہی دکھے گا۔ وہ اس کے سوال پہ مسکرا کر گویا ہوئے۔ اور کچھ آگے جھک کر اخبار میز کی شفاف سطح پر رکھا۔

لے یہ کیا جواب ہوا۔۔۔ وہ خوب بدمزہ ہوئی تھی۔ اور جواب میں بُرا سا منہ بنایا تو۔ وہ جو اپنی نازک سی کلیوں جیسی بہن کی جدائی کا سوچ کر افسردہ ہو رہے تھے۔ اس کے چہرے کے تاثرات نے انہیں قہقہہ لگانے پہ مجبور کر دیا تھا۔

یہ۔۔۔ یہ ابھی کیا کیا تم نے؟ وہ ان کی بات کا مطلب سمجھ نہ پائی تھی۔

کیا؟

یہ ابھی جو تم نے منہ بگاڑا تھا۔ یہ دوبارہ کرنا۔ اسے ان کا ہنسنا اچھا لگا تھا۔

کیوں؟ وہ ہنس پڑی۔

ماہا کرونا۔ وہ اسے ابھی بھی وہی دو سال کی ماہا ہی سمجھتے تھے۔ اور وہ ایکٹ بھی تو ایسے ہی کر رہی تھی۔

میں جوکر نہیں ہوں۔۔۔

For more visit (exponovels.com)

کرو تو۔۔۔ تم جب چار سال کی تھی تب یہی تمہاری عادت تھی۔اب بھی یہی عادت ہے۔بہت کچھ یاد آنے لگا تھا۔

ہاں سچی۔بس ایک یہ عادت نہیں جاتی میری ناک چڑھانے والی۔وہ بھی انکی ہنسی میں انکا ساتھ دی رہی تھی۔جب فون کی گھنٹی نے تیسری

آواز پیدا کی تھی۔

ابرار بھائی کو اٹھتے اور پھر فون کی جانب جاتے۔اور پھر کال نہ اٹھاتے دیکھ کر اسے حیرت ہوئی تھی۔

کیا ہوا کال کیوں نہیں پِک کی؟۔وہ اٹھ کر برابر کھڑی پوچھ رہی تھی۔

ایسے ہی کوئی فارغ انسان ہے۔بار بار کال کرتا ہے۔اور جب میں بولتا ہوں تو جواب ندارد۔

کال اب بھی آرہی تھی۔اس نے آنے والے نمبر کو دیکھا۔اور منہ پہ ہاتھ رکھ کر ہنسی کے فوارے کو پھوٹنے سے روکا۔

کیا ہوا؟وہ معصومیت سے اس سے پوچھ رہے تھے۔جو آنے والی کال سننے کی غرض سے جانبوجھ کر سپیکر کھول چکی تھی۔

اسلام وعلیکم فری۔۔۔اس نے مسکراہٹ روک کر سلام میں پہل کی تو دوسری طرف لمبی سانس لی گئی۔جیسے لمبی تھکاوٹ زدہ محنت کے بعد لی جاتی ہے۔

مرو یہ کونسا واہیات سا نمبر دے دیا ہے۔جو تیسری بار ملانے پہ سہی جگہ ملا ہے۔اس کی آواز میں خوف اور غصہ ایک ساتھ تھے۔

ماہ نور اور ساتھ کھڑا ابرار اس کی بات پہ نہ جانے کیسے اپنی ہنسی کو روک سکے تھے۔

کیا بول رہی ہو۔میں سمجھی نہیں؟وہ اس سے استفسار کر رہی تھی۔

مت پوچھو۔۔۔میں نے تم کو یہ تیسری بار کال کی ہے۔ہر بار پتہ نہیں کون۔عجیب سی کھردری سی آواز والا آدمی فون اٹھا رہا تھا۔میری تو مانو جان ہی نکل گئی۔آواز سے وہ خاصی پریشان لگی تھی۔جبکہ دا سری طرف وہ دونو ہنسی روکنے کے چکر میں سرخ ہو چکے تھے۔

اچھا کیا بول رہے تھے وہ؟ کون تھے تم نے پوچھا؟

نہیں یار میں نے نہیں پوچھا۔ آواز سے تو جاہل سا آدمی لگ رہا تھا۔ موٹا سا۔۔۔اس کی بات اس کے ماہ نور اور ابرار بھائی کا قہقہہ ایک ساتھ گونجا تھا۔ ماہ نور نے تیزی سے کال کاٹ دی۔ تا کہ وہ سن نہ سکے۔ اسے دکھ ہوتا۔ جبکہ دوسری طرف وہ دونو موٹا اور نہ جانے کیا کیا، عجیب و غریب الفاظ سن کے ہنستے چلے گئے تھے۔

یہ کون تھی اس قدر دور اندیش خاتون۔ وہ ہنسنے کے بعد گہرے گہرے سانس لے کر پوچھ رہے تھے۔

جواب میں اس نے ہنستے ہوئے فرح خان کا مختصر تعارف کروا دیا۔

....

ہلو بیوٹی کوئین۔۔۔وہ جو بے تابی سے ہوٹل میں بیٹھی انتظار کی تکلیف سے دوچار تھی۔ اس کی آواز اپنی پشت پہ سن کے چونک کے سیدھی ہوئی۔

ہلو۔۔۔اس نے پُر جوش انداز میں اس سے ہاتھ ملایا۔ اس کے ہاتھ کی سختی اور آنکھوں میں موجود سرد مہری نے چند لمحوں کے لئے ساکت کیا تھا۔ مگر پھر وہ اگنور کر گئی۔

آپ نے دیر کیوں کی؟ آدھا گھنٹہ جناب آپ لیٹ ہیں۔ وہ ناراضگی سے کہہ رہی تھی۔ ذریت جو موبائل پہ تیزی سے ٹائپ کر رہا تھا۔ اس

کی سکرین پہ تھرکتی انگلیاں چند پل کو رکی تھیں۔

میں اپنی مرضی کا مالک ہوں۔ میں نے تو نہیں کہا تھا۔ کہ انتظار کرو۔ چلی جاتی۔ وہ رکھائی سے کہہ کے فون رکھتا سامنے کی جانب دیکھنے لگا۔ اس وقت مین ڈور اس کی پشت پہ تھا۔

نہ۔۔۔نہیں میرا مطلب ٹائم کی پابندی بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ وہ یک دم گڑبڑا گئی تھی۔

ہاں تو محترمہ میں فارغ انسان تھوڑی ہوں۔اب میں اپنے اتنے ضروری کام چھوڑ کر تو نہیں آسکتا نا۔انداز اب بھی سخت تھا۔خفت سے یک دم اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔اسے سمجھ نہیں آئی تھی۔ کہ وہ اس انسان کی خاطر خود کو کیوں اتنا ذلیل کروا رہی تھی۔اس نے جھوکے سر کو اٹھا کر اس کی جانب دیکھا۔اور پھر اسے اپنے اندر کا سوال خود بخود جواب دیتا محسوس ہوا۔نتاشا سمجھ سکتی تھی۔ حسین لوگوں کا نخرہ بھی ادا ہی کہلاتا ہے۔

اچھا آپ ناراض مت ہوں۔میں تو بس یوں ہی پوچھ رہی تھی۔ چلیں آڈر کرتے ہیں۔وہ مسکرا کر اس کا غصہ کم کرنے کی کوشش کرنے لگی تھی۔وہ بھی اس کی مسکراہٹ دیکھ کر ٹھنڈا ہو تھا۔

ہاں۔۔۔ مگر لنچ میری طرف سے ہو گا۔اس نے مینو کارڈ اٹھاتے ہوئے۔کہا تو ایک بار پھر اُلجھی۔

مگر پر امس تھا۔کہ آج کا لنچ میری طرف سے ہو گا۔آج دوسری بار وہ لنچ اس کے ساتھ کر رہی تھی۔ پیچھلی بار بھی اسی نے لنچ کروایا تھا۔اور وعدے کے مطابق اب کی بار یہ لنچ اس کی طرف سے تھا۔مگر وہ پھر ضد پہ تھا۔

لو۔۔۔ ڈیئر۔۔۔ذریت حسن کی آواز کو اسی کے فون نے کاٹا تھا۔اس نے مینیو کارڈ ایک جانب رکھ کر آنے والی کال کو کاٹا۔اور پھر میز پہ موجود اس کے سفید ہاتھ کو اپنی آہنی گرفت میں کرتے ہوئے نہایت جزبے کے عالم میں خود کو کہتے سنا تھا۔

وہ ہک دک اسی کو دیکھ رہی تھی۔اور وہ کہہ رہا تھا۔

اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ لنچ تم کرواؤ یا میں۔بات تو ایک ہی ہے۔ہم کونسا غیر ہیں۔میں تمہارا دوست ہوں۔اور دوستوں میں سب چلتا ہے۔ مسکرا کر اس نے اس کے ہاتھ کو چھوڑ دیا۔اور پھر واپس مینو کارڈ کی طرف متوجہ ہو گیا۔جبکہ دوسری طرف موجود ہستی کچھ دیر پہلے واقع ہونے والے لمحے کے سحر میں مقید ہو کر رہ گئی تھی۔

مگر نیکسٹ ٹائم یہ چیٹنگ نہیں چلے گی۔وہ مسکرا کر کہہ رہی تھی۔

ذریت نے ایک بھرپور قہقہ لگایا تھا۔گویا مقابل کی بات کو خوب انجوائے کیا ہو۔کل کس نے دیکھی ہے ڈیئر نتاشا۔نتاشا جو اس کے چہرے کی مسکراہٹ کے سحر میں میں تھی چونکی۔

For more visit (exponovels.com)

میں۔۔۔جانتی ہوں۔ہم کل ضرور ملیں گے۔وہ یقین سے کہہ رہی تھی۔

اچھا۔۔۔تم کیسے جانتی ہو؟۔وہ اس کی بات پہ ہنسا۔اور ساتھ ہی کچھ فاصلے پہ کھڑے ویٹر کو آڈر بھی نوٹ کروادیا۔

کیا خوبصورتی کا سحر ہی کافی نہیں ہوتا۔کسی بھی انسان کو بے بس کر دینے کے لیے۔ایک ادا سے وہ کہہ رہی تھی۔ساتھ ہی گال پہ جھولتی لٹ کو

بھی شہادت کی انگلی سے بل دے رہی تھی۔

اچھاااا۔۔۔اس نے اچھا کو خاصا لمبا کیا تھا۔

بالکل۔۔۔حسن ایک ایسا سحر ہے۔جو انسان کی عقل کو دیمک کی طرح چاٹ جاتا ہے۔پھر اس سحر سے نکلنا آسان نہیں رہتا۔

ہر سحر کا توڑ ہے۔مادام۔۔۔تبھی کھانا بھی آگیا۔تو دونو کو چپ ہونا پڑا۔

دیکھتے ہیں۔آپ نکال پاتے ہیں اس سحر کا توڑ یا نہیں۔اس کی بات پہ ایک عجیب سی مسکراہٹ نے ذریت حسن کے چہرے پہ عکس چھوڑا تھا۔مگر وہ چپ ہی رہا۔

کھانا کھانے کے بعد وہ اہم میٹنگ کا کہہ کے اٹھ آیا تھا۔مگر اُٹھنے سے پہلے اس نے دوبارہ ملنے کی کوئی بات نہیں کی تھی۔ہمیشہ کی طرح۔

گاڑی کا ڈور کھولنے کے بعد اس نے بیٹھتے ساتھ ہی موبائل کی سکرین کو سائڈ کے بٹن سے آن کر کے کمال کو مسج کیا تھا۔

کام ہوا؟

ہاں۔۔۔چند لمحوں بعد ہی جواب آگیا۔جسے پڑھ کر اس کے چہرے کو خوبصورت مگر خطرناک مسکراہٹ نے اپنے حصار میں لیا تھا۔

کمال اور بھی کچھ کہہ رہا تھا۔ جسے پڑھنے کے بعد اس نے رات کے ڈنر کی دعوت دے کر فون کو آف کر دیا۔ ابھی اسے آفس جانا تھا۔

....

صبح کی خوبصورت کرنیں پھوٹنے کے قریب تھیں۔ اندھیرا سارے آسمان کو حصار میں لیئے ہوئے تھا۔ چرند پرند غرض یہ کہ ہر چیز اس وقت سجدے میں جھک چکی تھی۔ اور اس خالق کی شکر گزار تھی۔ جس نے بنایا۔

وہی ہے جو تعریف کے لائق ہے۔

بس وہی ہے جس پہ تعریف سجتی ہے۔

وہی بس مالک ہے۔

وہی جو احد ہے۔

وہی واحد ہے۔

کمرہ اس سمیں نیم تاریکی کا شکار تھا۔ اور کمرے میں موجود واحد وجود اس وقت نماز کی نیت کیئے ہوئے تھی۔ ہلکے نیلے دوپٹے نے اس کے چہرے کو اپنے حصار میں کر رکھا تھا۔ کچی نیند سے جاگنے کی وجہ سے چہرہ ہلکا سرخ تھا۔ آنکھوں میں بھی سرخی کے ڈورے دیکھنے سے نظر آتے تھے۔

نماز کے کلمات ادا کرتے اس کے گلابی ہونٹ بغیر آواز پیدا کیئے بغیر رکے دھیرے دھیرے ہل رہے تھے۔ جو دیکھنے میں بھلے لگتے۔

فجر کی نماز ادا کر کے اس نے سلام پھیرا اور دعا کے لئے ہاتھ اُٹھا دئے۔ چہرے پہ خوبصورت ٹھہراؤ تھا۔

دُعیہ کلمات ابھی وہ ادا کر ہی رہی تھی۔ جب کسی چیز کی چنگھاڑتی آواز نے اسے جھٹکا دیا تھا۔

وہ یقیناً اس کا موبائل فون تھا جسے اس نے گھر والوں سے چھپ کر لیا تھا۔ اور کسی کو بتایا بھی نہ تھا۔

For more visit (exponovels.com)

اس نے ہاتھوں کو تیزی سے چہرے پہ پھیرا،اور مڑ کر بیڈ کے پہلو کا دراز کھولا۔ کل رات وہ شائد اسے آف کر کے رکھنا بھول گئی تھی۔اس نے آنے والی کال پک کر کے تیزی سے باتھ روم کا رخ کیا تھا۔ نمبر انجان تھا۔ مگر ممکن تھا۔ کہ ماہ نور یا پھر زری میں سے کسی کا ہوتا۔

کال پک کر کے سہمے ہوئے انداز میں ابھی اس نے سلام کیا ہی تھا۔ جب دوسری طرف کی بھاری مردانہ آواز سن کے اس کا چہرہ لٹھے کی مانند سفید ہوا تھا۔

!اسلام وعلیکم

ک کون۔۔۔اسے اپنی آواز گلے میں اٹکتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔

شکر۔۔۔آپ نے کال تو اُٹھائی۔ میں تو سمجھا تھا۔ آج کا دن پھر سے غارت جائے گا۔اس نے موبائل ہٹا کر نمبر غور سے دیکھا تو بے اختیار اپنا ماتھ پیٹنے کا دل چاہا۔ وہی تو نمبر تھا۔ جسے کل رات اس نے فون آن کرنے پہ سب سے پہلے سکرین پہ چمکتے دیکھا تھا۔اور اب اسے ہی بھول کر اُٹھا لیا تھا۔

محترمہ بولیں تو سہی۔ آواز مسکراہٹ میں ڈوبی ہوئی تھی۔

ت تم۔۔۔ک کون ہو۔ وہ اس وقت خوف کا شکار تھی۔ کچھ دیر تک پھوپو کو آ جانا تھا۔

میں وہی ہوں جس کا پیچھلا نمبر آپ نے بلاک کر دیا۔ کوئی ایسے بھی کرتا ہے۔لوگ تو اپنے چاہنے والوں کی قدر کرتے ہیں۔اور ایک آپ ہیں۔ وہ اس سے شکوہ کر رہا تھا۔ گویا بہت پُرانا یارانہ ہو۔

دیکھیں میں آپ کو نہیں جانتی مہربانی کریں۔ مجھے دوبارہ فون مت کیجئے گا۔ کیونکہ اب میں نے نمبر بدل لیا ہے۔اسے اب اور کوئی چارہ نظر نہیں آرہا تھا۔

اچھا کیا گھر والوں نے فون رکھنے کی اجازت دے دی۔ مقابل کی بات تھی۔ یا منہ سے نکلی آگ جس سے وہ راکھ کا ڈھیر ہوئی تھی۔ جبکہ دوسری طرف اسے واضح محسوس ہو رہا تھا۔ کہ مسکرایا جا رہا ہے۔

اچھا خیر چھوڑیں۔۔۔ مجھ سے میرا حال تو پوچھیں۔ پوچھیں تو سہی آپ کے بغیر میں کیسا ہوں۔ آپ جانتی ہیں اگر آپ میری کال پک نہ کرتیں تو میں پشاور آ جاتا۔

بکواس بند۔۔۔ وہ یکدم دھاڑی تھی۔ تم آنا پشاور۔ آؤ گے سواری پر مگر میں بھی قسم کھاتی ہوں۔ واپسی تمہاری اخبار پہ ہو گی۔ اور یاد رکھنا۔ اب کی بار فون کیا تو۔۔۔ اپنی بد تر حالت کے ذمہ دار تم خود ہو گے۔

اوہ نازک سی چڑیا کو غصہ آرہا؟ دیکھ کر اچھا لگا۔ انداز خاصا جلانے والا تھا۔ ویسے میرا گزارہ تمہاری اس سہمی سی آواز سے بھی ہو سکتا ہے۔ اگر روز رات کو بات کرنے کا وعدہ کرو تو۔ اس کی فرمائش۔۔۔ وہ اش اش کر اٹھی تھی۔

میں تمہاری ساری بکواس سن ہی کیوں رہی ہوں۔۔۔ کہہ کر اس نے فون بند کرنا چاہا تھا۔ جب دوسری طرف کی آواز نے اسے سکتے کا شکار

کیا تھا۔

فرح خان میڈم ۷ سٹریٹ پہ موجود پارک کے سامنے کی سفید اور نیلی کوٹھی تمہاری ہی ہے نا۔ اب کی با واضح دھمکی دی گئی تھی۔

لعنت ہو تم پہ۔۔۔ کہہ کر اس نے تیزی سے فون کاٹ دیا تھا۔ خوف سے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ بہت سے آنسو اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہی دیکھتے جمع ہوئے اور پھر سفید اور فرخ گالوں کو بھگونے لگے۔

اسے اندازہ نہیں تھا۔ کہ زندگی میں ٹھیک مقصد کے لئے چھپ کر کئے جانے والا کام اسے اس موڑ پر لا سکتا تھا۔

وہ واش بیسن پہ جھک کر چہرہ دھونے لگی۔ اس نے باہر پھوپو زہرہ کی آواز سنی تھی۔ وہ آچکی تھیں۔

کرتے کی جیب میں ڈالا گیا فون وائبریٹ ہوا تھا۔ اس نے تیزی سے آنے والے میسج کو کھولا۔

فون کو بند کرنے کی غلطی دوبارہ مت کرنا۔۔۔ بس یہی تھا۔

آنسو ایک بار پھر سے بار اُمڈنے لگے تھے جنہیں دھکیلتی باہر نکل آئی۔ فون وہ واش روم میں ہی چھپا چکی تھی۔

....

ہم م م۔۔۔اتنی خوبصورت خوشبو۔۔۔ابرار بھائی کی آواز پہ اس نے مڑ کر ان کی جانب دیکھا۔وہ مسکرا کر اندر کمرے میں ارد گرد کا جائزہ لے رہے تھے۔

ائیر فریشنر کی خوبصورت خوشبو نے کمرے کے ماحول کو تازہ کر دیا تھا۔اس نے سپرے کی بوتل ریک میں رکھ دی جہاں اور بھی بہت سی اسی طرح کی بوتلیں پڑی تھیں۔

ماہا تمہارا کمرا۔۔۔کمرا کم خوشبو کی دُکان زیادہ لگ رہا ہے۔

ہائے کاش۔۔۔قسم سے بھائی میرا بس چلے تو میں دنیا بھر کے پھولوں کی خوشبو لا کر رکھ لوں۔انداز میں بچپنا تھا۔

چلو کوئی نئیں۔ہم تمہیں گفٹ کر دیں گے۔

ہائے سچی بھائی۔۔۔اسے یقین نہیں تھا۔

ہاں اس میں کونسی بڑی بات ہے۔میں اپنی گڑیا کو سب لا دوں گا۔انہیں اس کا اس طرح سے مسکرانا اچھا لگا تھا۔

تھینکیو بھائی۔وہ بڑھ کر انکے کندھے جا لگی۔بھائی بھی عجیب کردار ہوتے ہیں۔

ماہا۔۔۔ایک بات پوچھنی تھی۔۔۔اس سر تھپتھپاتے وہ کام کی بات پہ آئے۔

جی بھائی حکم۔۔۔اس کے انداز پہ وہ مسکرا کر اسے صوفے کی طرف لے گئے۔گڑیا بابا کچھ پریشان ہیں۔جانتی ہو آج کل ان کی طعبیت خاصی خراب رہنے لگی ہے۔کل آفس میں انکا بلڈ پریشر شوٹ کر گیا۔وہ کافی پریشان تھا۔ماتھے پہ تفکر کی لکیریں تھیں۔

بھائی بابا ٹھیک کیوں نہیں ہیں۔میں ہر روز ان کی ڈائٹ اور میڈیسن کا خیال رکھتی ہوں۔میں اور بابر بھائی آپ کے آنے سے پہلے یہ بات کر چکے ہیں۔میں نے بابا سے پوچھا بھی لیکن مسکراتے رہے۔اور میرے فورس کرنے پر بھی بار بار بولتے رہے کہ میرا وہم ہے۔مجھے کوئی

پریشانی نہیں۔

لیکن بھائی میں جانتی تھی کہ وہ سچ میں پریشان ہیں۔اس نے انہیں ایک لمحے میں اپنی پریشانی سے آگاہ کر دیا۔

ہم میں جانتا ہوں کہ وہ کیوں ہریشان ہیں۔اس نے ان کے کندھے سے سر ہٹا کر حیرت کا اظہار کیا تھا۔کیا سچ میں ؟

وہ سر ہلا گیا۔

بتائیں پھر۔۔۔ہم مل کر انکی پریشانی ختم کریں گے۔ابرار کو چند لمحے لگے تھے سوچنے میں۔

ماہ نور بابا چاہتے تھے۔کہ تمہاری شادی کر دی جائے۔جس کے لئے انہوں نے ذریت حسن کی فیملی کو گھر بلایا۔انہیں اپنی گرتی صحت نے پریشان کرر کھا ہے۔اسی لئے انہوں نے چاہا تھا۔کہ وہ تمہاری خوشی دیکھ لیں۔مگر۔۔۔وہ جانبوجھ کر رک گیا۔اور ایک نظر اسے دیکھا۔جو اسے ہی سن رہی تھی۔

مگر تم نے انکار کر دیا۔جس کی وجہ سے ان کی امید ٹوٹ گئی۔انکو یقین تھا کہ تم انکار نہیں کرو گی۔اس لئے تمہیں بتائے بغیر انہوں نے ذریت کی فیملی کو بلالیا۔چندا میں یہ نہیں کہہ رہا کہ ان کی پریشانی کی وجہ تم ہو۔بس ان کی ایک خواہش ہے۔جو تم پورا نہیں کرنا چاہتی۔جس نے انہیں ہرٹ کیا ہے۔دوسرا انہیں لگتا ہے کہ اللہ نہ کرے کہیں ان کی زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔کب بلاوا آجائے۔اور انہیں دنیا پہ یقین نہیں۔بس وہ اپنے ہاتھوں سے کسی مضبوط ہاتھ کے حوالے تمہیں کر دینا چاہتے ہیں۔اس کا ہر گز یہ مطلب نہیں کہ ہم تمہیں گھر سے نکالنا چاہتے ہیں۔میں جانتا ہوں۔تم بابا سے یہ سب بول چکی ہو۔اب تم بولو کیا خیال ہے۔اس کے ہاتھ کو انہوں نے نرمی سے پکڑ رکھا تھا۔

وہ سر جھکا چکی تھی۔بھائی بابا کو اللہ پاک پہ یقین کیوں نہیں ہے۔وہ کیوں ایسی باتیں کرتے ہیں۔آنسو ایک روانی سے بہنے لگے تھے۔

بیٹا بات یقین کی نہیں ہے۔اور۔۔۔اور تم یہ رونا تو بند کرو۔تم عورتیں کوئی بات روئے بغیر نہیں کر سکتی۔اس کے آنسو انہیں تکلیف دے رہیے تھے۔

بات محض انکی خواہش کی ہے۔اور اس بھروسے کی ہے جو انکو تم پہ ہے۔ورنہ زندگی کا بھروسہ تو میری کا بھی نہیں ہے۔تمہاری کا بھی نہیں ہے۔بس یہ بزرگ جو ہوتے ہیں نا۔یہ بہت حساس ہوتے ہیں۔انکی خواہش ہوتی ہے۔کہ جو وہ مانگ رہے ہیں۔یا جو وہ چاہتے ہیں۔اپنی اولاد سے وہ انکو بغیر تامل کے مل جائے۔بالکل کسی بچے کی طرح۔۔۔اور اب تم خود دیکھو انکی خواہش ناجائز بھی نہیں۔

وہ اسے منانے آئے تھے۔وہ جانتی تھی۔اس نے افسردگی سے انہیں دیکھا۔اور پھر واپس سر جھکا لیا۔یہ بات اس کے لیے کسی اذیت سے کم نہیں تھی۔کہ بابا کے یقین میں اس کے لیے کمی آئی تھی۔

ٹھیک ہے بھائی جیسے آپ سب چاہو۔۔۔گلے میں آنسو اٹک گئے تھے۔

نہیں گڑیا بات ہماری خواہش کی نہیں تمہاری کیئر کی ہے۔اور تمہارے عتماد کی ہے۔بس۔۔۔دو دن تک سوچ لو۔۔۔پھر جواب دے دینا۔وہ چاہتے تھے کہ وہ دل سے مانے۔

بھائی بات میری رضا کی ہے۔اور بابا میری وجہ سے اُداس ہیں۔بس آپ بابا کو جا کر بول دیں کہ مجھے کوئی عتراض نہیں۔عتماد واپس لوٹ آیا

تھا۔شادی جب کرنی ہی تھی۔تو اب کیوں نہیں۔بابا کی خواہش پہ کیوں نہیں۔۔۔

شیور؟

ہم م م وہ سر ہلا گئی۔بھائی کا چہرہ مسکرایا تھا۔انہوں نے اس کا سر تھپتھپایا اور اُٹھ گئے۔۔۔

اللہ میری گڑیا کو خوش رکھیں۔میں بابا کو بتا کر آتا ہوں۔تم تیار ہو جاؤ۔آج ہم باہر ڈنر باہر کریں گے۔بابا اور بابر کو بھی بتا دیتا ہوں۔وہ بھی چلیں۔سارا پلین وہ منٹوں میں بنا چکے تھے۔

اس ایک فیصلے نے انکو تر و تازہ کر دیا تھا۔اسے حیرت ہوئی تھی۔

میں فریش ہو کر آتی ہوں۔اپنی وجہ سے بھائی کو مسکراتا دیکھ کر اسے بہت اچھا محسوس ہو رہا تھا۔

سویٹزر لینڈ میں سردی اس وقت پورے زوروں پر تھی۔ محض خشک سردی نہ تھی۔ اس کے ساتھ برف باری بھی بھر پور انداز میں ہو رہی تھی۔ اپنے کمرے کی کھڑکی سے وہ ہر چیز کو سفید پڑتے دیکھ رہا تھا۔ سڑکیں عمارتوں کی چھتیں سٹریٹ پولز غرض باہر کی موجود ہر چیز سفیدی اوڑے ہوئے تھی۔ جتنی برف باہر پڑتی جمود پیدا کر رہی تھی۔ اس سے کہیں زیادہ کھڑکی میں کھڑے وجود کی آنکھوں میں جمود تھا۔ جو آسانی سے دیکھا اور پڑھا جا سکتا تھا۔

سردی میں بھی وہاں کے لوگ گھروں میں بیٹھنے کی بجائے باہر سڑکوں پہ لمبے لمبے کوٹ پہنے چہل قدمی کرتے نظر آرہے تھے۔ جن میں بوڑھے جوان سب موسم سے اٹکیلیاں کرتے نظر آرہے تھے۔ مگر اس سب میں ایک واحد وہی شائد شخص ہو۔ جو اس سمیں کمرے میں بند آنکھوں میں نفرت کی لہر لئے کھڑا کھڑکی سے پار ہر منظر کو دیکھ رہا تھا۔ گویا کسی کے وجود کو تلاش کر رہا ہو۔

نتاشا بی بی نفرت ہے مجھے تم سے شدید نفرت۔ جس طرح تم میری زندگی میں آئی ہو۔ اسی طرح میں تمہیں دھکے دے کر اپنی زندگی سے باہر نہ نکال دوں تو میرا نام بدل دینا۔ اس کے لہجے کی کاٹ ایسی تھی۔ کہ خشک فضاء میں اس کی آواز اور جملوں نے دراڑیں پیدا کر دی تھیں۔ ماحول چٹخنے لگا۔ گویا تپتی بھٹی میں مکئی کے دانے چٹختے ہوں۔

میرے زندگی کو تم نے مزاق بنانے کی کوشش کی مجھے تباہ کرنے کی جو تم نے کوشش کی۔ اگر میں خود تمہاری زندگی کو مزاق نہ بنا دوں۔ تمہاری زندگی کا تماشا نہ بنا دوں تو۔ سمجھنا کہ میں دو ھکے کے ہی قابل تھا۔ مگر ایک بات یاد رکھنا میں اپنی آنکھوں دیکھی مکھی کسی صورت نہیں نگلوں گا۔ اور اس کے ساتھ حساب بھی برابر لوں گا۔ اس کے لہجے میں معمول سے ہٹ کر کاٹ تھی۔ زبان اس لہجے سے آشنا نہ تھی۔ اسی لئے جملے بے ربط ادا ہو رہے تھے۔

اس کے اندر کا اشتعال بڑھا تو اس نے دائیں ہاتھ کی ہتھیلی کو پوری شدت سے دیوار پہ دے مارا۔ اور پھر تیزی سے کھڑکی کے سامنے سے ہٹ گیا۔ دیواریں اس شخص سے خوفزدہ ہوتیں سہم کر آنکھیں ڈھاپتی سمٹ گئیں تھیں۔

چند پل صوفے پہ بیٹھ کر اس نے گہرے گہرے سانس لے کر اپنے اندر کی کسافت کی شدت کو کم کرنے کی کوشش کی اور پھر کمرے کا دروازہ کھولتا باہر نکل گیا۔ اس کا رخ ہوٹل کے بزنس ایئریا کی جانب تھا۔ جہاں سے کچھ دیر قبل میٹنگ کے

دوران ہی طعبیت کا بہانا کر کے وہ اُٹھ آیا تھا۔اور جہاں سے ابھی چند لمحے پہلے اکمل نے اسے مسج کر کے واپس آنے کا بولا تھا۔کہ یوں کمرے میں بند ہو جانا بہتر نہ تھا۔اور کچھ اہم پیپرز پہ اس کے سائنز کی بھی ضرورت تھی۔

رات کا دوسرا پہر شروع ہونے کے قریب تھا۔جب اس کی سیاہ رنگ کی کار سرخ اینٹوں کے پورچ میں آر کی۔ باہر نکل کر اس نے سیاہ کوٹ بھی پہلو کی سیٹ سے اُٹھایا اور گھر کی جانب بڑھا۔

گاڑی کے رکنے کی آواز پہ آپی نے افسوس سے نفی میں سر ہلا کر مغرب کی دیوار پہ لگی گھڑی پہ وقت دیکھ کر دادی کو دیکھا۔جن کا رخ لاونج کے داخلی دروازے کی ہی جانب تھا۔اور جو بغیر کسی قسم کے تاثر کو ظاہر کئے تسبیح کا ورد کرنے میں مصروف تھیں۔اسے انکا یوں بیٹھنا بے چین کر رہا تھا۔تو چڑھ کر بول گئ۔دادی اگر آج آپ نے اپنے لاڈلے کو کچھ نہ بولا ناں تو میرے سے بات کرنے کی بالکل بھی ضرورت نہیں ہے۔ پتہ نہیں خود کو کیا سمجھتا ہے۔غضب خدا کا۔یاد ہے آپ کو کس قدر مان سے ہم انکے گھر رشتہ لے کر گئے تھے۔انہوں نے تو ہمیں نہیں فورس کیا تھا ناں۔جو یوں ہم انکی بیٹی کی زندگی اپنے بے کار سے لڑکے کے لئے خراب کر دیں۔انسانیت بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے۔ہیروں جیسی لڑکی کو رشتوں کی کمی تو نہ ہو گی ناں۔ مریم آپی جو نان سٹاپ بولنے لگیں تو انہیں اسے اشارہ دے کر خاموش کروانا پڑا تھا۔کہ وہ آچکا تھا۔اور یوں دونو خواتین کو انتظار میں دیکھ کر بے اختیار اس کی نظر کلائی پہ بندھی گھڑی پہ پڑی تھیں۔رات کا دوسرا پہر چڑھنے کے قریب تھا۔دل چاہا اپنا ماتھا پیٹ لے۔۔۔۔

اسلام علیکم! لہجے کو قدرے بردبار بنا کر اس نے سلام کیا تو۔دادی نے سر ہلا کر جواب دیا جبکہ مریم آپی نے محض گھور کر دیکھا تھا۔وہ مسکراہٹ دبا گیا۔جانتا تھا کہ اس وقت دونو خواتین کے مزاج سخت خراب تھے۔وہیں کرسی گھسیٹ کر انکے قریب ہی بیٹھ گیا۔اور بیٹھنے سے پہلے دادی کے ماتھے کا بوسہ بھی لے ڈالا۔یہ غصہ کم کرنے کو ایک طرح کی چھوٹی سی تدبیر تھی۔

ذریت اپنی گھڑی مجھے دے دو۔ تم جیسے وقت کی پابندی سے نابلد انسان کی کلائی پہ یہ جچتی نہیں۔اور نہ تم اس کے قابل ہو۔مریم آپی نے سب سے پہلے بات شروع کی تھی۔وہ اپنے بھائی کی عادات سے سخت عاجز دکھتیں تھیں۔انکا بس چلتا تو

For more visit (exponovels.com)

وہ راتو رات اس کے سارے کس بل نکال دیتیں۔ مگر افسوس یہ اب وہ والا ذریت نہیں رہا تھا۔ جو خاموشی سے ڈانٹ سن لیتا تھا۔

سوری دادی۔ کام میں وقت کا اندازہ ہی نہیں ہوا۔ اس کے لہجے سے ہلکی سی شرمندگی بھی نہیں جھلک رہی تھی۔

ذریت بچے یہ کوئی زندگی گزارنے کا اصول تو نہ ہوا ناں۔ نہ کھانے کی ہوش اور نہ میرا کوئی خیال۔ چلو مجھے چھوڑو وہ جسے تم بیاہ کر لا رہے ہو۔ اس بیچاری کو کیوں اپنی اس ہٹ دھرمی کی وجہ سے اذیت میں مبتلا کرنا۔ وہ اس وقت خاصی پریشان تھیں۔ ذریت محض گہری سانس لے کر رہ گیا۔

ذریت ایک بات یاد رکھنا۔ اگر تمہاری یہی عادات رہیں۔ تو میں جانے سے پہلے دادی کو ساتھ لے جاوں گی۔ تم کونسا گھر پہ رہتے ہو۔ سو تمہیں کیا فرق پڑنا۔ بلکہ موجیں مارنا کوئی روکنے والا ہی نہیں ہو گا۔ پھر بے شک شادی بھی نہ کرنا۔ ویسے بھی تمہاری حرکتیں دیکھ کر ماہ نور کے گھر والوں نے خود ہی انکار کر دینا۔ مریم آپی جو بولنے لگیں تو کون تھا جو انہیں روک دیتا۔

آپی غصہ مت کریں۔ اور بات بات پہ دادی کو بیچ میں مت لایا کریں بول تو دیا کہ آئندہ ایسا نہیں ہو گا۔ وہ کچھ تلخ ہوا تھا۔ مریم آپی کے ماتھے پہ اور بل نمودار ہوئے۔

ذریت حسن میرے سامنے موڈ دیکھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اور میں دادی کو بار بار اس لئے بیچ میں لا رہی ہوں کیونکہ ایک وہی ہیں۔ جنکو تمہاری وجہ سے تنہائی کاٹنی پڑ رہی ہے۔ پتہ نہیں تم نے کیا کیا ہے کہ ادھر سے ہلتی ہی نہیں ہیں۔ مگر تم عجیب خود غرض ہو رہے ہو۔

سوری آپی پکا اگلی بار خیال رکھوں گا۔ میٹنگز میں اتنا مصروف ہوں کہ کچھ اور سوجھ ہی نہیں پاتا۔ عادت کے برخلاف وہ صفائی دے رہا تھا۔

ہاں کام تو سارا تم کرتے ہو۔ تم ہی واحد انوکھے بزنس مین ہو۔ جو اپنے ملازمین سے زیادہ خود کام کرتا ہے۔ اگر اتنا ہی کام کا شوق ہے۔ تو ہٹا دو سارے ملازمین۔ کیوں مفت میں تنخواہوں پہ پیسہ بہا رہے ہو۔

For more visit (exponovels.com)

بولا تو ہے سوری۔ اور کیا کروں اب۔۔۔ سارے دن کا تھکا ہوا آیا ہوں۔ آرام کرنا چاہتا ہوں اور آپ کی انویسٹیگیشن ہی ختم نہیں ہو رہی۔ وہ اپنے موڈ میں واپس لوٹ آیا تھا۔ تبھی چڑھ کر جواب دیا۔

پتہ ہے مجھے جو تم کام کرتے ہو اور جو تمہاری میٹنگز ہوتی ہیں۔ کل سے تم سیدھے آٹھ بجے گھر نہ آئے تو یاد رکھنا گھر میں گھسنے نہیں دوں گی۔ پھر کرنا پورا شوق باہر گھومنے کا۔ وہ بس خاموشی سے انہیں دیکھتا رہا۔

ذریت میری بات سن لو اہم ہے۔ پھر سونے چلے جانا۔ دادی نے تسبیح وہیں میز کے ایک جانب رکھ کر کہا تو وہ بھی ان کی جانب دیکھنے لگا۔

کل میں ماہ نور کی طرف جا رہی ہوں۔ کچھ جولری خریدی ہے۔ سوچا بچی کو دکھا دوں۔ تم بھی ساتھ چلنا۔ بہتر رہے گا۔ اور ہو سکتا ہے۔ مریم بھی ساتھ ہو۔ اسے کچھ شاپنگ کرنی ہے۔ یہ ادھر سے مارکٹ چلی جائے گی۔ تو تم اپنے سارے کل کے کام ترک کر دو۔

اتنی لمبی بات کے جواب میں وہ خاموش رہا۔ تو آپی کو غصہ آنے لگا۔ بولو بھی۔ گم سم بیٹھنے کو نہیں بولا۔

اچھا۔۔۔ مختصر جواب

کیا اچھا؟

بول تو دیا کہ اچھا لے جاوں گا۔ اب اور کیا کروں۔ وہ یک دم چڑھ گیا۔

دادی ذرا موڈ دیکھیں اپنے لاڈلے کا۔

دادی میں سونے جا رہا ہوں۔ جدھر بولیں گی لے جاوں گا۔ اجازت دیں۔ وہ جواباً خاصا چڑھ گیا تھا۔ ہر وقت غصے میں رہنے والی طبعیت نے اسے عجیب سا اکڑ مزاج سا کر دیا تھا۔

ہاں جاو۔ وہ بھی مریم آپی کا ہاتھ پکڑ تیں اس کا ماتھا چومتیں کمرے کی جانب بڑھ گئیں۔ کہ رات کافی بیت چکی تھی۔ اور صبح انہیں جانا تھا۔

ذریت انکے جانے کے چند لمحوں بعد پانی پی کر اپنے کمرے کی جانب بڑھا۔اس وقت وہ کچھ سوچ رہا تھا۔اور قدم پُر سوچ انداز میں اٹھتے تھے۔

آنٹی روٹی آپ بنادیں بس۔ باقی سب میں کرلوں گی۔ وہ کھانا بنانا سیکھ چکی تھی۔اور آج مہمانوں کے آنے کا سن کر خود خاص احتمام سے بنا رہی تھی۔ کہ بابا کا حکم تھا۔ کہ اپنے سسرالیوں کے لئے کھانا وہ خود بنائے۔ وہ سب بابا کے حکم سے ہی توکر رہی تھی۔انکی خوشی ہی تو تھی۔ جس نے اسے شادی کے لئے ماننے پہ راضی کیا تھا۔ورنہ وہ اس گھر کو چھوڑنے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ جہاں ساری زندگی اس نے گزاری تھی۔اور جہاں کی ایک ایک اینٹ سے اسے عشق تھا۔

وقت کس قدر تیزی سے بدلتا ہے ناں۔آج جس گھر کو میں اپنی زندگی کا سکون اور اپنے تحفظ کی چھت بول رہی ہوں۔ کل یہ گھر میرے لئے پرایا ہو جائے گا۔ پھر شائذ میرا سسرال میرے لئے یہ سب ہو۔آنٹی بتول سے نہ جانے کس جزبے کے تحت وہ کہہ گئی تھی۔ وہ مسکرا کر سنتی رہیں۔

اصل میں بیٹا یہ گھر آپ کے لئے پرایا نہیں ہوگا۔بس مہمان گاہ کی طرح بن جائے گا۔میکہ پرایا نہیں ہوتا۔یہ تو دوسرا گھر ہوتا ہے۔بس یہاں روز روز ٹھرا نہیں جا پاتا۔اور سسرال کا سکھی رہے بھی کیوں۔

بتول آنٹی کی بات پہ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔اسے بے اختیار فرح یاد آئی تھی۔ جس سے کل ہی اس نے بات کی تھی۔وہ کل کا سوچ کر مسکرانے لگی۔

کل جب وہ کیچن میں روٹی بنانے کی پریکٹس کر رہی تھی۔ تبھی لاونج میں چلتے ٹی وی کی تیز آواز میں فون کی گھنٹی کی آواز گونجی تو اسے آنا پڑا۔ مگر اس سے پہلے کے وہ فون اٹھاتی ابرار بھائی فون اٹھا چکے تھے۔

فرح جو بہت خوشی سی ماہ نور کی آواز کے انتظار میں تھی۔ وہی پیچھلی غیر آشنا آواز سن کر پریشان ہو گئ۔آخر یہ نمبر بار بار غلط کیوں مل رہا ہے۔اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

اسلام و علیکم۔۔۔۔جی آپ کو کس سے بات کرنی ہے؟ابرار فرح کی آواز پہچان چکا تھا۔مگر اس کا گھبرانا اس کی سمجھ سے باہر تھا۔اور وہ ٹیکنالجی سے بھی خاصی ناواقف معلوم ہوتی تھی۔

آآآ۔۔۔کیا یہ ماہ نور ابتسام کا نمبر ہے؟آخر تنگ آکر اس نے پوچھ ہی لیا۔

ابرار کے ہونٹ مسکرائے۔ساتھ ہی دور کھڑی ماہ نور کو بھی بلا لیا۔جو واپس جانے کا سوچ رہی تھی۔

جی ہے لیکن آپ کون؟اسے دلچسپی ہوئی تھی۔اگلاری ایکشن دکھنی کی۔۔۔۔

تو پھر دیں اسے آپ ادھر کیا کر رہے ہیں۔جواب رکھائی سے آیا تھا۔ابرار مسکرایا اور فون ماہ نور کی جانب بڑھا دیا۔جو خاصی دلچسپی سے بھائی کو دیکھ رہی تھی۔

فون پکڑا کر وہ وہیں صوفے پہ بیٹھ گیا۔اور ٹی وی کی آواز دھیمی کر لی۔کہ دھیان سارا فون پہ بات کرتی ماہ نور کی جانب تھا۔جو دھیمی آواز میں اسے اپنے اور ذریت کے رشتے کے بارے میں بتا رہی تھی۔

ہائے ماہا۔۔۔وہ اکڑو؟وہ لفٹ والا؟ماہ نور کو اس کے اندازوں پہ ہنسی آئی تھی۔

ہاں وہی۔۔۔

ہائے ماہا مزاق تو نہیں کر رہی۔اسے ابھی تک یقین ہی نہیں آرہا تھا۔

بہت خوب اب کیا میں تم سے اس قسم کے مزاق کروں گی؟

ہاں!مطلب تُو سچ بول رہی؟یار یہ پیس تمہارے گھر والوں کو کدھر سے مل گیا؟وہ سننے کو بے چین تھی۔اور اس نے بھی خاصی تفصیل سے سب کچھ بتایا تھا۔اور فرح کو لگا جیسے وہ کوئی کہانی سن رہی ہے۔کہانیاں بھی تو زندگی سے ہی جنم لیتی ہیں۔سو اس میں حیرانی کی کیا بات۔۔۔۔

ماہا بیٹا مہمان آگئے۔۔۔سوچنے میں اس قدر مصروف تھی کہ آنٹی کی بات پہ وہ چونکی تھی۔

اوہ میں تو بہت بُری حالت میں ہوں۔اس وقت اس کی حالت خاصی میلی سی ہو رہی تھی۔بتول آنٹی نے مسکرا کر اس کی جانب دیکھا اور پھر آٹا فریج میں رکھنے لگیں جو کچھ دیر پہلے ہی انہوں نے گوندھا تھا۔

آپ مل کر چینج کر لیناتب تک میں چائے تیار کرتی ہوں۔بتول آنٹی کی بات میں اسے دم لگا۔تو وہ سر ہلاتی ڈرائینگ روم کی طرف بڑھ گئی۔جدھر سے مریم آپی کی پُر جوش آواز سنائی دے رہی تھی۔وہ مسکرا کر ڈرائینگ روم میں داخل ہوئی ۔مگر بلکل سامنے بیٹھے حضرت کو دیکھ کر وہ گڑ بڑا گئی۔ذریت کے آنے کی اسے اُمید نہیں تھی۔اسی لئے یک دم پریشان ہو گئی۔اور اسی پریشانی میں اسے سمجھ ہی نہ آیا کہ اندر جائے یا پھر وہیں سے مڑ جائے سو۔اسی شش و پنج میں دروازے میں ہی کھڑی تھی۔جب دادی کی نرم اور میٹھی سی آواز پہ اسے انکی جانب جانا پڑا۔

بچے ادھر کیوں رک گئیں ؟

وہ مجھے سمجھ نہیں آئی تھی۔۔۔کہ میں اندر جاوں یا باہر۔اس قدر معصومیت سے دئے گئے معصوم سے جواب نے جہاں مریم آپی کو ہنسنے پہ مجبور کیا تھا۔وہیں دادی بھی مسکرائیں تھیں۔اور اس معصومیت پہ اس کے ماتھے پہ بوسہ لے ڈالا۔ذریت نے پہلو بدلا تھا۔لو آگئی ایک اور حصے دار

اندر داخل ہوتی ماہ نور پہ ذریت نے محض ایک ہی لا تعلق سی نظر ڈالی تھی۔خوبصورت تھی معصوم بھی دکھی تھی۔مگر پھر بھی اسے اس میں ایسا کچھ نہیں دیکھا تھا۔جس کی وجہ سے دادی اور آپی اس چھوٹی سی لڑکی پہ فدا تھیں۔اس نے تو دوسری نظر تک نہ ڈالی تھی۔ایسا ہے ہی کیا تھا۔اس میں جو وہ دوبارہ اسے دیکھنے پہ مجبور ہوتا۔

ماہ نور چند منٹ بیٹھ کر ہی اٹھ آئی۔اپنے حولئے پہ اسے سخت شرمندگی محسوس ہو رہی تھی۔کچھ ذریت کی موجودگی کا اثر تھا شائد۔سو وہ جلد ہی اٹھ کر باہر آگئی۔باہر آکر اس نے ایک نظر کیچن کو دیکھا اور پھر سیڑھیاں چڑھتی اپر آگئی۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے سب سے پہلے واڈروب سے نیلا سوٹ نکالا۔جو ابھی کل ہی اس نے پریس کر کے لٹکایا تھا۔

واش روم سے نکلنے اور بال درست کرنے میں اسے محض چھ یا سات منٹ کا عرصہ لگا تھا۔ کمرے سے نکلنے سے پہلے اس نے شیشے کے سامنے رک کر اپنا عکس دیکھا۔ نیلا سوٹ اس کی شفاف دمکتی رنگت سے امتزاج کھاتا خوب جچ رہا تھا۔ باہر نکلنے سے پہلے اس نے بالوں کو باندھ کر ہم رنگ دوپٹے کو حجاب کی صورت چہرے کے گرد لپیٹا اور باہر نکل آئی۔

وہ سیڑھیاں اُتر رہی تھی۔ جب ذریت ڈرائنگ روم سے نکلا تھا۔ اس نے اسے خاص نوٹس کیا تھا۔ وہ اس وقت سیاہ شلوار سوٹ میں ملبوس تھا۔ جس میں اس کا قد خوب نمایاں ہو رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں فون تھا۔ اور رخ لان کی جانب ۔۔۔ شائد کال سننے جا رہا تھا۔ اس کا دل چاہا بلند آواز میں بولے شوخے۔۔۔ اسنے اور فرح نے جب کبھی ایک یا دو بار اسے یاد کیا تو اسی لفظ سے یاد کیا تھا۔ اب بھی اسی لفظ کو دوہرانے کو خوب دل چاہا۔ مگر وہ اپنی اس حسرت کو دباتی کیچن کی جانب بڑھ گئی۔

اس کے خیال میں یہ سہی وقت تھا۔ کہ وہ ذریت کی غیر موجودگی میں ریفریشمنٹ ڈرائنگ روم میں لے جاتی۔ اور سب کو چائے پکڑا کر خود وہاں سے غائب ہو جاتی۔ اسی خیال کے تحت وہ چائے لے کر ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تھی۔ اور ابھی اس نے چائے کے کپ سب کو پیش کئے ہی تھے۔ جب دادی کی بات پہ وہ یک دم گڑ بڑا گئی۔

ماہ نور بچے۔۔۔ ذریت کو بھی بلا لو۔ اب گیا تو گھنٹے بعد ہی لوٹے گا۔

جی ؟ بے اختیار اس نے بابا کی جانب دیکھا۔ جو جانے کا اشارہ کر رہے تھے۔ اس نے مدد طلب نظروں سے دونوں بھائیوں کو دیکھا۔ اور پھر ہری جھنڈی دیکھ کر مجبوراً اُسے خود ہی جانا پڑا۔

لاونج سے نکلتے ہی دور درخت کے سائے تلے وہ کھڑا تھا۔

شوخا۔۔۔ دل پھر سے چاہا تھا کہ بلند آواز سے لفظ شوخا بولتی۔ اور پھر وہاں سے بھاگ جاتی۔ مگر افسوس کچھ حسرتیں محض حسرتیں ہی ہوتی ہیں۔

باری صاحب سے میٹنگ فائنل کر دو۔ کل دو پہر کی میٹنگ رکھنا۔ اور رات کی سب میٹنگز کینسل کر دو۔ وہ تیز تیز اپنے سیکٹری کو آڈرز دے رہا تھا۔ چند پل تو وہ خاموشی سے پیچھے کھڑی رہی۔ مگر پھر اس کے احکامات کی بڑھتی لسٹ دیکھ کر اسے گلا صاف کر کے اپنی طرف متوجہ کرنا پڑا جس میں وہ خاصی کامیاب ہوئی تھی۔

اوکے فراض ابھی جو بولا وہ کرو۔ کہہ کر اس نے فون رکھ دیا۔ فون رکھ کر وہ سیدھا اس کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

وہ آپ کو سب اندر بلا رہے ہیں۔۔۔ چائے پہ۔ آپس میں دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو ملائے وہ آنے کا مدع بیان کر رہی تھی۔ اس بار ذریت نے اسے خاص نوٹس کیا۔

چلیں میں آرہا ہوں۔ انداز ہمیشہ کی طرح خشک تھا۔ اس کا جواب سُن کر وہ سر ہلا کر مڑی ہی تھی۔ جب ذریت نے اسے پھر سے پکارا تھا۔

سنو۔۔۔ اس کا لہجہ بالکل بھی ایسا نہیں تھا۔ جو اسے نرم شخصیت کا تاثر بخشتا۔

جی؟

کیا ہم باہر مل سکتے ہیں؟

جی؟ میرا مطلب کیوں؟ اسے حیرت ہوئی تھی۔ وہ تو سیدھا ڈیٹ کی آفر دے رہا تھا۔

مجھے تم سے بات کرنی ہے۔

کونسی بات؟۔۔۔

یہ تو میں وہیں بتاوں گا۔ اب کی بار انداز روکھا تھا۔

لیکن میں تو اپنے بھائی یا بابا کے سوا کسی کے ساتھ باہر نہیں جاتی۔ اس قدر صاف گوئی کی ذریت کو ہرگز اُمید نہیں تھی۔

تو پھر پوچھ لو ان سے۔ اور بے فکر رہو۔ میں آدم خور بالکل بھی نہیں ہوں۔ اسے اس لڑکی کا رویہ ایک آنکھ نہیں بھایا تھا۔ تبھی بغیر لگی لپٹی کہہ دیا۔ بُرا تو ماہ نور کو بھی لگا تھا۔ اور سب کچھ بُرا لگا تھا۔ مگر محض گہری سانس لے کر رہ گئی۔

میں آدم خور چیزوں سے ویسے ڈرتی ہر گز نہیں ہوں۔ لیکن میں اپنے خاندان کے اور اپنے اُصولوں کو ساتھ ہی رکھتی ہوں۔ آپ کو جو بھی بات کرنی ہے۔ کریں میں سُن رہی ہوں۔ اور اگر نہیں کر سکتے تو پھر انتظار کے سوا کچھ نہیں۔ وہ اتنا کہہ کر وہاں رکی نہیں تھی۔ ماہ نور ابتسام کی شان کے خلاف تھا۔ کہ وہ بغیر کسی وجہ کے۔ کسی غیر مرد سے باتیں سنتی۔ اور ذریت تو اسے باہر ملنے کا بول رہا تھا۔ جو اس کے مزاج کے سخت خلاف تھا۔ اسی لئے بغیر کسی لفظ کے کہہ کر رستہ ناپتی واپس مڑ گئی۔

جبکہ ذریت کے خواب وخیال میں بھی نہیں تھا۔ کہ چھٹانک بھر لڑکی اسے باتیں سنا جائے گی۔ اسے جس کے پیچھے شہر کی آدھی لڑکیاں دیوانی۔۔۔ اس سے شادی کے جاگتے میں خواب دیکھتی تھیں۔ اور یہ لڑکی جس سے بات بھی پہلی بار اس نے ابھی چند منٹ پہلے کی تھی۔ اور جس سے اس کا رشتہ طہ پایا تھا۔ کس طرح باتیں سنا گئی تھی۔ اس نے ایک ناگوار نظر دور جاتی ماہ نور ابتسام پہ ڈالی اور فون جیب میں ڈالتا۔ اسی رستے سے واپس مڑ گیا جس سے آیا تھا۔

انکل میں ماہ نور کو مارکٹ ساتھ لے جاوں۔ اصل میں کچھ شاپنگ ہے۔ جیسے جوتے وغیرہ۔۔۔ تو سوچا ماہ نور ساتھ چل کر خود لے لے زیادہ بہتر رہے گا۔ آپی کی بات پہ ذریت نے گہرا سانس لیا تھا۔ اس نے ہی انہیں بولا تھا۔ کہ وہ ماہ نور سے ملنا چاہتا ہے۔

کیا بات کرنی ہے؟ جو اس طرح باہر بلا رہے ہو۔ انہیں اس پہ کچھ شک گزرا تو جھٹ پوچھا۔

کرنی ہے کچھ۔ بس پوچھیں انکل سے۔۔۔

بات سنو اپنی ناکام محبت کے قصے ہر گز مت سنانا سمجھے۔۔۔ وہ ان کی بات سُن کر محض مسکرایا۔ تو آپی کا ماتھا ٹھنکا تھا۔ مگر پھر اس کے بار بار بولنے پہ انہیں پوچھنا ہی پڑا۔ ماہ نور بتول آنٹی کے ساتھ برتن سمیٹ رہی تھی۔ تبھی ٹھٹکی مگر مصروف ظاہر کرتی رہی۔

جی بیٹا۔۔۔آپ ماہ نور کو لے جائیں۔ بابا کی معصومیت پہ اس کا دل چاہا ماتھا پیٹ لے۔ لڑکے کی بہن باہر لے جانے کی اجازت کیوں مانگ رہی تھی۔انہیں سمجھنا چاہے تھا۔

بھائی بابا کو بولیں میں نے نہیں جانا۔ کیچن میں برتن رکھتے اس نے مسج کر کے ابرار بھائی کو بلالیا تھا۔اور اب ان کے سامنے منہ لٹکائے کھڑی تھی۔

کیوں ؟ یار ماہا لڑکیاں تو شاپنگ کی دیوانی ہوتی ہیں۔اور ایک تم ہو۔اپنی ہی شادی کی شاپنگ نہیں کرنا چاہتی۔ابرار بھائی کی بات پہ وہ گڑبڑا گئ۔

وہ بات نہیں ہے۔بس مجھے عجیب لگ رہا ہے۔

پاگل اگر انکار کیا تب زیادہ بُرا لگے گا۔اس طرح تھوڑی اچھا لگتا ہے۔۔۔چلے جاو۔ جلدی واپس آجانا۔ابرار بھائی اتنا کہہ کر وہاں رکے نہیں تھے۔ تیزی سے واپس مڑ گئے۔

مال لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ عصر کا وقت تھا۔جب وہ اور آپی شاپنگ سے چارغ ہوئی تھیں۔ ہر چیز آپی نے اس سے مشورے کے بعد لی تھی۔اسے بہت عجیب فیل ہو رہا تھا۔آپی جس قدر پیار سے اس کے لئے سب خرید رہی تھیں اسے خا مخواہ شرمندگی گھیرے جا رہی تھی۔اس نے بہت بار منا کیا کہ جتنی شاپنگ کی کافی ہے۔ مگر آپی نے اس کی ایک نہ سنی اور کافی کچھ خرید ڈالا۔اصل تو وہ تب گڑبڑائی جب آپی اسے برائڈل ڈریس لینے کا بولنے لگیں۔۔۔

آپی وہ آپ اپنی مرضی سے لے لیں۔اسے بے حد شرمندگی محسوس ہو رہی تھی۔

ارے پگلی پہنا تم نے۔اور لوں میں۔۔۔ایسا تھوڑی ہو گا۔ چلو آو۔۔۔جو اچھا لگے فوراً بتانا۔۔ شرمانے کی ہر گز ضرورت نہیں ہے۔

اس قدر پیار پہ اس کو کافی سکون محسوس ہوا تھا۔ورنہ عجیب سا محسوس ہو رہا تھا۔

اور پھر ایک گھنٹے کی محنت کے بعد وہ شادی کا جوڑا بھی خرید ہی چکی تھیں۔اور اب تھکی وہیں مال کے ریستوران میں بیٹھیں تھیں۔ خب مریم آپی کا میز پہ پڑا فون گنگنایا اُٹھا۔انہوں نے ایک نظر سکرین کو دیکھا اور پھر فون اُٹھا کر کھڑی ہو گئیں۔

میں کچھ کھانے کو لاتی ہوں پریشان مت ہونا۔ تم نے کچھ اور کھانا تو بتاؤ۔۔۔ آپی کے پوچھنے پہ وہ نفی میں سر ہلا کر ارد گرد چلتے پھرتے لوگوں کو دیکھنے لگی تھی۔ جب کوئی اس کے سامنے والی کرسی گھسیٹ کر بیٹھا تو وہ چونک کر سیدھی ہوئی۔ آپی جا چکی تھیں۔ وہ جانتی تھی اس نے آنا ہی تھا۔ وہ انہیں مال کے باہر چھوڑ کر کسی کام کا بول کر چلا گیا تھا۔ اور اب تین چار گھنٹوں بعد واپس اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ کچھ گھنٹوں پہلے سیدھے سیاہ قمیض کے بازو اب کلائیوں سے کچھ موڑے جا چکے تھے۔

ماہ نور کے چہرے پہ اس وقت کوئی تاثر نہیں تھا۔ ہاں البتہ اندر سے وہ خاصی جزبز ہو رہی تھی۔ اور کچھ دیر پہلے کے اس کے رویے کو بھول چکی تھی۔ پہلی بار وہ بابا یا بھائی کے علاوہ کسی اور کے ساتھ ادھر ہوٹل میں بیٹھی تھی۔

تم شادی سے انکار کر دو۔ اس کے الفاظ تھے یا بوم ب۔ اس کے سارے جزبات یکدم ہوا ہوئے تھے۔

جی؟

ہاں تم شادی سے انکار کر دو۔

کیوں؟ وہ ماہ نور ابتسام تھی۔ کسی کے آگے نہ جھکنے والی فطرت کی مالک۔ ساکھ پہ آتا سوال دیکھ کر جھٹ سوال کیا۔

کیونکہ میں شادی نہیں کرنا چاہتا۔ جوس کا سپ لے کر بڑے آرام سے کہا گیا۔

مجھ سے صرف نہیں کرنی؟ یا کسی اور سے بھی نہیں کرنی؟ بڑے ٹھہرے انداز میں اس نے اس سے پوچھا تھا۔ ذریت کی نظریں جو ہوٹل کا جائزہ لے رہی تھیں۔ ٹھٹک کر نیلے سوٹ میں ملبوس کم عمر لڑکی پہ ٹِک گئیں۔ وہ سامنے بیٹھی عتماد سے پوچھ رہی تھی۔

تم سے اور نہ کسی اور سے۔ خشک انداز میں جواب دے کر اسے دیکھا تھا۔ کہ ضرور مضطرب کر دے گا۔ مگر وہ پُر سکون ہی رہی۔

ٹھیک ہے تو پھر کر دیں انکار۔ اس نے بھی تحمل سے گلاس اُٹھا کر ہونٹوں سے لگایا۔ اور پھر کچھ لمحوں بعد واپس شفاف میز پہ رکھتے ہوئے جواب طلب نظروں سے دیکھنے لگی۔

دیکھو اس سے سراسر نقصان تمہارا ہو گا۔ میرا کچھ نہیں جائے گا۔ مجھے کسی عورت پہ بھی عتماد نہیں ہے۔ مجھے شادی اب کرنی ہے اور نہ کسی اور وقت۔ اب تم سمجھ جاؤ میرے ساتھ رہ کر تم کس قسم کی زندگی گزارو گی۔ اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو کبھی گھاٹے کی ڈیل نہ کرتا۔ اندر کے غصے کو دبا کر عادت کے بر خلاف اس نے خاصے تحمل سے سمجھانا چاہا تھا۔

لیکن میں آپ نہیں ہوں۔ اور نہ ہی یہاں کوئی بزنس میٹنگ چل رہی ہے۔ جو آپ ڈیل کی بات کر رہے ہیں۔ شادی سے یا لڑکی سے جس سے بھی آپ کو پرابلم ہے۔ مجھے نہیں ہے۔ شادی میرے لئے حکم ہے۔ بابا کا بھی اور خاص طور پہ میرے ربّ کا۔ سو میں یہ حکم ضرور مانوں گی۔ اب چاہے آپ ہوں یا کوئی اور مجھے فرق نہیں پڑتا۔ پرابلم آپ کو ہے۔ سو آپ کی مرضی کر دیں انکار۔ اسے اس کے الفظ نے خاصہ دکھ دیا تھا۔ پتا نہیں اسے کس چیز کی اکڑ تھی۔

ٹھیک ہے اب میں جو بھی کروں۔ وہ میری مرضی ہے۔ تم مجھ سے سوال کرنے کا حق کھو چکی ہو۔ اس نے اب کی بار ڈرانے کی کوشش کی۔ مگر وہ خاموشی سے اس پہ لاپرواسی نظر ڈال کر ارد گرد آتے جاتے لوگوں کو دیکھتی رہی۔ گویا وہاں کسی اور کے بارے میں بات ہو رہی ہو۔

ایک ناگواری کا احساس تھا۔ جو اس کے اندر سے اُٹھا تھا۔ آخر یہ لڑکی خود کو سمجھتی کیا تھی۔ اتنی کوئی خوبصورت بھی نہیں ہے۔ جو ایسے بن رہی ہے۔ جیسے کسی ریاست کی ملکہ ہو۔ اسے اس کا انداز ایک آنکھ نہیں بھایا تھا۔

ماہ نور اگرچہ خود کو خاصا پُر سکون ظاہر کر رہی تھی۔ مگر اندر سے وہ جس قدر افسردہ تھی۔ یہ وہی جانتی تھی۔ یا پھر مالک۔۔۔۔ اندر سے دکھ کا ایک اُبال تھا۔ جو بار بار اُٹھ رہا تھا۔ وہ ہر چیز کی اُمید کر سکتی تھی۔ مگر شادی سے انکار کے بارے میں اس نے سوچا تک نہیں تھا۔

For more visit (exponovels.com)

ابرار بھائی آچکے ہیں۔۔۔ میں چلتی ہوں۔آپ آپی کو بتا دیجئے گا۔ابھی کچھ دیر پہلے ہی اس نے میسج کر کے انہیں بلایا تھا۔اور اب ان کا رپلائے آیا تھا۔کہ باہر کھڑا ہوں آجاو۔۔۔

اس نے شوپنگ بیگ اُٹھائے اور وہاں سے اُٹھ کر سیڑھیاں اترتی باہر آگئی۔بھائی سامنے ہی کھڑے تھے۔سوڈھونڈنا نہیں پڑا۔

کیا سارے جذباتی میرے گھر ہی جمع ہونے ہیں۔پتہ نہیں ان سب کو شادی کا اتنا جنون کیوں چڑھ گیا ہے۔کام نہ ہونے کی وجہ سے اس کی بڑبڑاہٹیں عروج پہ تھیں۔چند منٹوں بعد آپی کو بلا کر وہ بھی گھر کا رستہ ناپ رہا تھا۔جہاں کچھ دیر پہلے وہ دادی کو چھوڑ کر آیا تھا۔

سارے رستے آپی اس سے پوچھتی رہیں۔کہ کیا بات ہوئی۔مگر اس کے ماتھے کی رگیں تنی رہیں۔اور ایک لفظ بھی منہ سے نہ بولا۔پوچھ پوچھ کر آخر وہ بھی چپ ہو گیں۔کہ خود ہی بعد میں ماہ نور سے پوچھ لیں گی۔

- ---------------

شام کے سائے ڈھلنے کے قریب تھے۔نارنجی سورج کی آسمان پہ آگ کی لپٹیں جلتی محسوس ہو رہی تھیں۔سورج زوال کی طرف تیزی سے محوِ سفر تھا۔اس نے عصر کی نماز ابھی ابھی پڑھی تھی۔اور دُعا مانگتی نیچے پھوپو کی طرف کیچن میں آگئ جہاں وہ تیزی تیزی سے کھانا بنانے میں مصروف تھیں۔

ہو گئ ہو فارغ تو ذرا یہ پیاز کاٹ دو۔مغرب سے پہلے کھانا بنانا ہے۔ابھی کل کے انتظامات باقی ہیں۔کل پھوپو کے سسرالیوں نے ان کی شادی کی ڈیٹ فائنل کرنے آنا تھا۔اور وہ آدھے آج اور کل میں کام بانٹ چکی تھیں۔تا کہ زیادہ پرابلم نہ ہو۔

For more visit (exponovels.com)

میرے سے نہیں کٹتے پیاز ویاز۔۔۔ رہ رہ کر پھوپو کے جانے کا غم اسے ڈسے جا رہا تھا۔ دوسری طرف ماہ نور بی بی کی بھی منگنی ہو چکی تھی۔ صدمہ سا صدمہ تھا۔ اور پھوپی بیگم کو ابھی تک پیازوں کی فکر تھی۔ اور اس سے پیاز کٹوانے کی فرمائیشیں ہو رہی تھیں۔

اوہو۔۔۔ لڑکی یہ منہ کس کے غم میں لٹکار کھا۔ ذرا مجھے بھی تو بتاو۔ کونسی فکر ہے۔ جو میری مانو بلی کو تنگ کر رہی ہے۔ وہ جب بھی ناراض ہوتی وہ اسے ایسے ہی الفاظ سے مخاطب کرتیں۔

پاکستانی وزیرِ داخلہ باہر لان میں آیا بیٹھا ہے۔ اور نواز شریف کی سالگرہ کے فنگشن کی لسٹوں میں لکھے گئے مہمانوں کے نام بتا رہا ہے۔ پوچھ رہا ہے۔ مودی کا نام لسٹ میں ڈالوں یا رہنے دوں۔ جواب اس قدر منہ بگاڑ کر دیا تھا۔ کہ پھوپو ہنستی چلی گئیں۔

واہ مجھے نہیں پتا تھا۔ کہ تمہاری حکومت تک بھی رسائی ہے۔ کہ وزیر مشیر ہماری موٹی سے مشورے کرنے آتے ہیں۔

ہاں ناں۔۔۔ کل ڈونلڈ ٹرمپ آیا بیٹھا تھا۔ کہہ رہا تھا۔ اس کے گھر دعوت پہ آکر اسے عزت بخشوں۔ لیکن میں نے انکار کر دیا کہ نہیں۔ کل میں مصروف ہوں۔ کل میری پھوپو کے سو کولڈ سسرالیوں نے آنا ہے۔ سو میرے پاس وقت نہیں ہے۔

لفظ سو کولڈ پہ ذاہرہ نے مڑ کر اسے دیکھا تھا۔ اب وہ سمجھ چکی تھیں کہ کیوں منہ لٹکا ہوا تھا۔

اچھاااا اب میں سمجھی کہ میڈم کا منہ کیوں لٹکا ہوا ہے۔ انہوں نے اچھا کو لمبا کیا تھا۔

چلو شکر ہے۔ منہ بگاڑ کر سامنے پڑے دھلے دھلائے ٹماٹر کاٹنے لگی۔

انکو کیوں بیچاروں کو سو کولڈ بول رہی ہو۔ اپنی اماں سے بول دو تمہیں بھی رخصت کر دیں۔ چاہو تو جہیز میں۔۔۔ میں تمہیں اپنے ساتھ بھی لے کر جا سکتی ہوں۔ مسکرا کر انہوں نے کٹے ہوئے ٹماٹر ہنڈیا میں ڈالے اور ساتھ بات بھی کرتی ہیں۔

نہیں۔۔۔میں جہیز کو لانت سمجھتی ہوں۔آپ کرو شادی۔اور جب سسرال میں جا کر ہر روز س سے ساس کے ہر صبح ڈنڈے کھنے پڑیں گے۔جب وہ ہر صبح سر میں ڈنڈا مار کر اُٹھایا کرے گی ناں۔تو یقین مانو پھوپی بیگم میں تمہارے رونے نہیں نسوں گی۔بلکہ وہ سب س سے ساس کو بتایا کروں گی۔اور آدھی باتیں اپنے پاس سے بھی لگایا کروں گی۔تب اصل مزہ آئے گی۔اس کے منصوبے سن کر انکا منہ کھل گیا تھا۔

ہائے فری یہ کونسے بدلے ہیں۔جو تم مجھ سے لو گی۔

پھوپی بیگم میں آپ کو حقیقت سے آگاہ کر رہی ہوں۔جو جلد ظاہر ہونے والی ہے۔اس کے لفظ پھوپی بیگم پہ بے اختیار وہ ہنسی تھیں۔جو باہر سے گزرتی بوا نے صاف سنی تھی۔

لڑکی! بن بیاہی لڑکیاں یوں دانت نکالتی کچھ اچھی نہیں لگتیں۔اپنے آپ کو قابو میں رکھو۔شام کا وقت ہے۔بوا کیچن میں آکر جو بولیں تو جہاں پھوپو گڑ بڑائیں تھیں۔وہیں فرح کا بھی منہ بن گیا۔ایک تو ان کر اپنے گھر چین نہیں ہے۔وہ ابھی وہیں دروازے میں کھڑی تھیں۔جب فرح نے دھیمی آواز میں تبصرا کیا تھا۔ذاہرہ گڑ بڑا گیئں

جی جی بوا۔آپ نے سہی کہا۔میں خیال رکھوں گی۔گڑ بڑا کر بات سمنبھالنے لگیں۔پتہ نہیں اب بوا نے سنا تھا یا نہیں۔وہ اندازہ نہ لگا سکی۔

ہمم! بوا سر ہلا کر مڑ گئی۔مگر ایک ناگوار نظر فرح پہ ضرور ڈالی تھی۔اسے بڑی بیگم کی لڑکی ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔بس مجبوری کے تحت آجاتیں تھیں۔کہ جب تک پیٹ کی ہر بات یہاں سے وہاں نہ کر دیتیں انکو چین نہ ملتا تھا۔رات کو نیند نہ آتی تھی۔کروٹیں بدل بدل کر رات بیت جاتی تھی۔

تمیز کرو فری اگر وہ سن لیتیں تو؟

تو سن لیتیں۔ہم اتنے فارغ نہیں ہیں۔کہ ایویں ہر ایرے غیرے کی فکریں پالتے پھریں۔کہہ کر وہ وہاں رکی نہیں تھی۔اُٹھ کر باہر آ گئ۔جہاں چچی اپنے بیٹے کو پڑھا رہی تھیں۔آجکل اس کو اور بہت فکریں تھیں۔

اسلام و علیکم! ماہ نور نے بجتے فون کو اُٹھایا اور ساتھ ہی ساتھ فیشن میگزین دیکھتی رہی۔ ابھی ابھی وہ لنچ سے فارغ ہوئی تھی۔

وعلیکم اسلام! ماہ نور کیسی ہو؟ آپی نے مسکرا کر احمد کو کارپٹ پہ کھیلتے ہوئے دیکھ کر جواب دیا تھا۔

ٹھیک آپی آپ کیسی ہیں؟ ماہ نور کو ذریت کی باتیں بھولی نہیں تھیں۔

گھر پہ سب کیسے ہیں؟

جی جی سب اچھے ہیں۔ آپ بتائیں دادی جان کیسی ہیں؟

صدقے جاوں۔ دادی جان بھی فٹ فاٹ ہیں۔ وہ اصل میں ماہا بیٹا مجھے تم سے ایک بات کرنی تھی۔ وہ اس وقت خاص سوچ سوچ کر بول رہی تھیں۔

جی جی آپی میں سن رہی ہوں۔۔۔ اسے عجیب سا محسوس ہوا تھا۔

بیٹا بات کچھ عجیب سی ہے۔ میری خواہش ہے۔ کہ آپ اس بارے میں کسی سے بات مت کرنا۔ سمجھ رہی ہو ناں۔ انداز خاصا محتاط تھا۔

جی سمجھ گئی۔ وہ میگزین چھوڑ کر سیدھی ہو بیٹھی۔ بات ضرور سریس تھی۔

وہ اصل میں۔۔۔۔ وہ رکیں۔۔۔ کیا۔۔۔۔ میرا مطلب ذریت نے کل آپ کو شادی سے انکار کرنے کو بولا تھا؟ ہو سکتا ہے۔ میں غلط سمجھی ہوں۔ تم بُرا مت ماننا۔ اگر اس طرح کی بات ہے۔ تو پلیز مجھے بتا دو۔ ماہ نور حیرت سے منہ کھولے سن رہی تھی۔ وہ اپنے بھائی کو کتنا اچھا سمجھتی تھیں۔

آپی انہوں نے مجھے شادی سے انکار کرنے کو بولا تھا۔ اسی لئے انہوں نے مجھے بلایا تھا۔ انہوں نے مجھے کہا لیکن میں نے انکار کر دیا۔۔۔ اب وہ انہیں ساری بات بتا رہی تھی۔ اسے یہی سہی لگا تھا۔ وہ کیوں بے عزتی برداشت کرتی۔ اس کے گھر والوں کو پتا ہونا چاہے کہ وہ کیا کرتا پھرتا ہے۔

مریم آپی سب خاموشی سے سنتی رہیں۔ مگر شرمندگی اور غصے نے ان کے چہرے کو سرخ کر دیا تھا۔

ماہ نور میری تم سے گزارش ہے۔ تم یہ بات کسی سے مت کرنا۔ اور شادی کے معملے میں بے فکر ہو جاو۔ ذریت کے معملے میں پریشان مت ہونا۔ اس کا علاج میں کرلوں گی۔ بس میرے پہ یقین رکھنا۔ آپی کو سمجھ نہیں آرہی تھی۔ کہ وہ کیسے شرمندی کو کم کریں۔ کن الفاظ میں معزرت کریں۔ اس لڑکے نے انہیں سخت شرمندہ کروایا تھا۔

آپی میں نے ابھی کسی سے اس بارے میں بات نہیں کی۔ آپ ذریت کو مت بتائے گا کہ میں نے آپ کو بتایا ہے۔ ماہ نور کو کچھ حوصلہ ہوا۔

میں جانتی ہوں۔ گڑیا تم بے فکر رہو۔ خُدا تمہیں خوش رکھے۔ دادی نے ایک بہترین لڑکی منتخب کی تھی۔ انہیں اندازہ ہو چکا تھا۔

....

زندگی پوری رفتار کے ساتھ محوِ سفر تھی۔ ہر چیز تیزی سے اپنے اختتام کی جانب گامزن تھی۔ اور ناواقف تھی۔ سڑکیں، عمارتیں، دفاتر غرض یہ کہ ہر وجود اس وقت کام کاج میں مصروف نظر آتا تھا۔ اور جو نہیں نظر آتے تھے۔ وہ بھی دوسروں کو کام کرتے دیکھنے میں مصروف نظر آتے تھے۔ یا پھر ان کے کام میں نقص نکالنے والا عظیم کام کرنا تو ان پہ گویا فرض تھا۔ سو وہ بھی وہ بغیر ماتھے پہ شکن لائے کر رہے تھے۔ کل ملا کر یہ بات ہی حقیقت تھی۔ کہ وہاں ہر کوئی کام کر رہا تھا۔ چاہے کام کوئی بھی تھا۔ کام تو کام ہوتا ہے ناں۔۔۔

اگر اس وقت ایک نظر اسفند اکرام کے کمرے کی کھڑکی کے نیلے شیشے کے پار سے کمرے میں ڈالی جائے۔ تو یہ دیکھ کر بالکل بھی حیرت نہیں ہو گی۔ کہ وہ بھی اس وقت کام کام اور کام کی تصویر بنا۔ دائیں ہاتھ سے کاغذات پہ دستخط کرنے کے ساتھ ساتھ بائیں ہاتھ سے فون کو کان سے لگائے، دوسری جانب جاتی بیل کو سن رہا تھا۔ باہر سے آنے والا کبھی اس کے چہرے کے تاثرات نہیں پڑھ سکتا تھا۔

نتاشااس وقت ایک بوتیک میں کھڑی سیاہ سرخ اور مونگیاں رنگ فراک ساتھ لگائے زرناب اور نوین سے داد وصول کرنے میں مصروف تھی۔ کہ سچ میں مونگیا اور سیاہ رنگ اس پہ خوب جچ رہا تھا۔ جب ہاتھ میں پکڑا اس کا فون گنگنا اُٹھا۔

کس کا فون ہے ؟ نوین جو کچھ فاصلے پہ کھڑی تھی۔ اور اس کے چہرے کے بگڑتے تاثرات دیکھ کر فون کرنے والی شخصیت کا نام جان چکی تھی۔ مگر پھر بھی اس نے پوچھ لینا مناسب سمجھا۔

مینڈک کا۔۔۔ کال کاٹ کر اس نے خاصے کڑوے لہجے میں کہا تو زرناب اور نوین ہنس دیں۔

غرور تو دیکھو مادام کا۔۔۔ مادام اس وقت سے ڈرو جب اسی مینڈک کی تمہیں مینڈکی بننا پڑے گا۔۔۔ اور

مجھے وہ وقت نظر آرہا ہے۔ زرناب نے نوین کی بات کاٹ کر خلا میں دیکھتے ہوئے کہا۔ تو جواب میں نتاشا نے اس کے بازو پہ چٹکی کاٹی تھی۔ وہ ضبط سے محض بازو سہلا کر رہ گئی۔

میں۔۔۔ منہ دھو رکھو۔۔۔ ذریت سے ملنے کے بعد میرے اندر اتنی ہمت آ ہی چکی ہے۔ کہ میں ڈیڈ سے اس کے لئے لڑ سکوں۔ نتاشا کے جاگتی آنکھوں سے دیکھے گئے خواب اس وقت فضا میں تیر رہے تھے۔ اور وہ خلا میں انہیں اُڑتا دیکھ کر شادمان تھی۔

او مادام واپس آؤ۔۔۔ اور حال کی بات کرو۔۔۔ بلکہ حال سے بات کرو۔۔۔ اب کی بار پھر سے کچھ وقفے بعد فون کی گھنٹی بجی تھی۔ تو زرناب نے پھر سے اس کا ریکاڈ لگا ڈالا۔ کبھی کبھی تو موقع ملتا تھا۔ وہ احمق نہیں تھی۔ جو جانے دیتی۔۔۔

مائی فُٹ۔۔۔ یہ انسان کبھی میرا حال یا پھر مستقبل نہیں ہو سکتا۔ لہجے میں تفاخر لئے اس نے ایک بار پھر سے کہا تو نوین اور زرناب بھی مسکرادیں۔ یہی اس کا غرور تو سب کو مار ڈالتا تھا۔ کوئی ایسا ہو۔ جو اس کے غرور کو مات دے۔ تو میں کہوں گی کہ ہاں تھا۔۔۔ تھا ایک انسان شہزادوں کی سی آن بان شان والا۔ جس کو نتاشا نے اس کے غرور کے بدلے میں مارا۔۔۔ آذر وہ یونی کا واحد انسان تھا۔ جس کے سامنے جا کر نتاشا کو خود جھکنا پڑا اور تب تک جھکنا پڑا جب تک۔

اس نے اپنی خوبصورت کا زہر اس کے اندر نہ اُتار دیا۔ اور جس دن اس نے دیکھا کہ آذر اس زہر سے نیلا ہو چکا ہے۔ اسی دن اس نے اسے کھائی میں دھکا دے دیا۔ کہ اگر زہر سے بچ بھی جائے تو گہرائی کی ایسی چوٹ لگے۔ کہ پھر وہ دوبارہ

For more visit (exponovels.com)

سانس نہ لے سکے۔اور اس نے ایسا ہی کیا تھا۔اور کیا خوب کیا تھا۔وہ جانتی تھی۔وہ اس بات سے بہت پہلے سے واقف تھی۔بلکہ تب بھی واقف تھی۔جب وہ ہاتھ میں کانچ کی زہر بھری بوتل لیئے کھڑا تھا۔اس نے مرنے سے پہلے اسے کال کی تھی۔نتاشا سب جانتی تھی۔مگر اسے پروانہ تھی۔اس نے تو نہیں اسے کہا تھا۔کہ وہ خودکشی کرے۔تو وہ پھر کیوں پروا کرتی۔اس نے سب کی زندگی کا ٹھیکا تو نہیں اُٹھار کھا تھا ناں۔

نتاشا۔۔۔سوچو اگر یہ مینڈک شہزادہ نکلا۔۔۔تب ؟کیا تب بھی تم اس کے بارے ہیں یہی بولو گی۔نوین دور کی کوڑی لائی تھی۔

ہاااا۔وہ مینڈک سے مینڈہ تو ہو سکتا ہے۔مگر شہزادہ نہیں۔اور وہ چاہے کسی سلطنت کا مالک ہی کیوں ناں بن آئے۔وہ میرے ذریت کی جگہ نہیں لے سکتا۔۔۔

اوہووو۔۔۔مادام تو ذریت صاحب کے عشق میں گوڑے گوڑے ڈوب چکی ہیں۔

قسم سے۔۔۔نوین کی بات نے اسے مزہ دیا تھا۔

دیکھتے ہیں۔تاشو تمہارا یہ عشق تمہیں ڈبوتا ہے۔یا تیراتا ہے۔زرناب نے بھی مسکرا کر کہا تو نوین کو اس کی بات پہ اتفاق ہوا تھا۔ہاں۔۔۔

بے فکر رہو۔۔۔میں نہیں ڈوبتی۔لہجہ خوب متکبر تھا۔

تیر کر تو میں جاؤں گی ہی۔آج مجھے ذریت نے کال کر کے خود ڈنر پہ انوائٹ کیا ہے۔اور تم جانتی ہو۔آج وہ مجھے پرپوز بھی کر دے گا۔میں نے اس کی آنکھوں میں اپنے لیئے دیوانگی دیکھی ہے۔وہ بھی میری طرح ہی کے احساسات میں گفتار ہے۔یہ ممکن نہیں ہے۔کہ اب میں ڈوب جاؤں۔وہ سچ بول رہی تھی۔وہ آج کے ڈنر کے لیئے ہی شاپنگ کرنے تو آئی تھی۔وہ آج کی شام کو ذریت اور اپنے لیئے یادگار بنا دینا چاہتی تھی۔اس لیئے خوب دل لگا کر اس نے شاپنگ کی تھی۔

یار پلیز اپنے مینڈک کا بھی فون اُٹھا لو۔۔۔ورنہ میں پاگل ہو جاؤں گی۔آخر یہ سکون کیوں نہیں کرتا۔زرناب نے نخوست سے سر جھٹک کر کہا تو۔وہ اثبات میں سر ہلا کر کال اُٹھا گئی۔

دوسری جانب آٹھویں کال پک ہونے پہ بے اختیار وہ کرسی کی پشت چھوڑ کر سیدھا ہوا۔۔۔

ہائے بے بی۔۔۔ لہجہ یکدم بدلا تھا۔ وہ بہت زبردست ایکٹرس تھی۔

کہاں ہو؟ کب سے کال کر رہا ہوں۔ تم ہو کے کاٹے جا رہی ہو۔ اسے شکایت ہوئی۔ تو وہ کہہ بھی گیا۔ نتاشا کے ماتھے پہ بہت سے ناگواریت کے تاثرات ظاہر ہوئے۔ وہ محض کھول کر رہ گئی۔

بے بی بزی تھی۔۔۔

کہاں؟

بس فرنڈز کے ساتھ۔

کونسی فرنڈز؟ نتاشا کا دل چاہا ہیں اسے جھاڑ دے۔ مگر وہ کیا کرتی۔ کہ ڈیڈ کی وجہ سے بس مجبور تھی۔ جنہوں نے اسے دھمکی دی تھی۔ کہ اگر اس نے اس رشتے کے ساتھ ذرا سی بھی چھیڑ چھاڑ کی تو اسے چین چاچو کے پاس بھیج دیں گے۔ اور پھر واپس بھی نہیں بلائیں گے۔ وہ بھی کوئی ماں باپ کی محبت میں ماری گئی لڑکی نہیں تھی۔ کہ ان کی محبت میں وہ رکی ہو۔ وہ بس ذریت کی وجہ سے خاموش تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی۔ کہ ذریت کو اس سب کی بھنک بھی پڑے اور وہ اس کے سامنے تماشا بنے۔ اس سے شادی تک وہ بس خاموش رہنا چاہتی تھی۔

نوین اور زرناب اور کون۔۔۔ تم بھی ناں اسفی۔۔۔

اوکے۔۔۔

کال کیوں کی؟ اب وہ سیدھی پوائنٹ پہ آئی۔

آج شام میں ریڈی رہنا۔ تم اور میں باہر شاندار سا کینڈل لائٹ ڈنر کریں گے۔ اس کا لہجہ شوخ ہوا تھا۔ نتاشا کا حلق تک کڑوا ہو گیا۔

For more visit (exponovels.com)

سوری بے بی۔۔۔آج رات تو بالکل بھی ممکن نہیں ہے۔بتایا تو ابھی کہ میں فرنڈز کے ساتھ بزی۔شام میں ہم سینمہ مووی بھی دیکھنے جارہے۔تو آج رات تو بالکل بھی پاسبل نہیں۔

کونسی مووی؟وہ ایک بار پھر سے پوچھ گیا۔

تم نہیں جانتے نئی آئی ہے۔وہ جانتی تھی۔کہ وہ فلمیں کم ہی دیکھتا تھا۔

پھر بھی۔۔۔ہے کونسی اگر اچھی لگی تو میں بھی دیکھ لوں گا۔

انڈین ہے۔وہ انڈین موویز خاص طور پہ نہیں دیکھتا تھا۔

اوکے۔۔۔اور؟

اور کیا؟۔۔۔بس ابھی ہم شوپنگ پہ ہیں۔تو۔۔۔میں رات میں فری ہوکر بات کروں گی۔اسے جلدی اس سے جان چھڑوانی تھی،سو جھٹ کہہ دیا۔اسفند اکرام مسکرا کر رہ گیا۔

جیسے تمہاری مرضی۔۔۔اب اور کیا میں بول سکتا ہوں۔لہجے میں بلا کی شرینی۔آنکھوں میں محبت کی چمک،سنہری چمکتی پیشانی۔۔۔وہ تو گویا شہزادہ ہی تھا۔آسمانی رنگ سوٹ میں ملبوس وہ خوب بھلا دکھ رہا تھا۔نتاشا اس کے قابل نہیں تھی۔مگر یہ اس کی سادگی اور خوبصورتی تھی۔کہ وہ جانتا نہ تھا شائد۔۔۔

اوکے دین بائے۔۔۔کہہ کر نتاشا نے تیزی سے فون رکھ دیا۔کہ کچھ بول ہی نہ دے۔بمشکل جان چھڑوائی تھی اس نے۔

چھچھورا۔۔۔فون رکھتے ہی اس نے تبصرا کیا تھا۔اور پھر نخوست سے سر ہلاتی۔بیگ اُٹھاتی۔۔۔ان دونو کے ساتھ باہر کی جانب بڑھ گئی۔

::::::::::::::::::::::

دادی اپنے پوتے کی نئی کرتوت سُنیں۔۔۔ کل اس نے ماہ نور کو لنچ پہ لے جا کر بوجھیں کیا کہا۔۔۔ دادی کے سامنے صوفے پہ پاؤں چڑھائے وہ اس وقت چاول چُننے کے ساتھ گفتگو میں مصروف تھیں۔

بس تم اب ہو جاؤ بھائی کی شکائتیں پڑھنی شروع۔ سگھا بھائی ہے تمہارا۔ اپنے رویے کو نرم رکھا کرو بچے۔

بس دادی آپ کی یہی عادت میری سمجھ سے باہر ہے۔ بات سُن لیں پہلے۔ بلکہ اس سے بھی پہلے ماہ نور کے گھر فون کریں اور ان سے دن رکھنے کی بات کریں۔ جتنی جلدی شادی ہو اتنا بہتر ہے۔ کہنے کے ساتھ انہوں نے چاولوں والی ٹرے سامنے کی ٹیبل پہ رکھی۔ اور پھر تیزی سے اُٹھ کر نمبر ملانے لگیں۔ وہ آج بھائی کو رات کہ کھانے پہ خوشخبری ضرور سنانا چاہتی تھیں۔ دادی ہیں ہیں ہی کرتی رہ گئیں۔ اور وہ نمبر ملا کر اب باتوں میں مصروف تھیں۔ پوتی کی یہی تیزی انہیں ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔

بری (بڑی) نانو۔۔۔ احمد جسے وہ سیب کی چھوٹی چھوٹی کاشیں کھلانے میں مصروف تھیں۔ ان کا یوں خیال بھٹکتا دیکھ کر ہاتھ ہلا گیا۔

جی وہ انکل دادی جان کو آپ سے بات کرنی تھی۔ حال احوال جاننے کے بعد انہوں نے فون دادی کی جانب بڑھایا تو وہ محض گھور کر رہ گئیں۔

اسلام و علیکم بھائی صاحب۔۔۔ ان کا لہجہ وہی حلاوت لئے ہوئے تھا۔

و علیکم اسلام۔۔۔ کہیے بہن جی کیسی ہیں آپ ؟ ابتسام صاحب بھی لہجے میں نرمی لئے ہوئے تھے۔

جی اللہ کا بہت بہت شکر۔ آپ بتائیں۔ بچے کیسے ہیں ؟ اور اب آپ کی صحت کا کیا حال ہے۔

ہاں جی سب ٹھیک۔ صحت بھی اچھی ہے۔ خریت مریم بیٹی بتا رہی تھی۔ کہ آپ کو بات کرنی ہے۔ سب ٹھیک تو ہے ؟ انہیں پریشانی ہوئی تھی۔

ہاں جی ! سب ٹھیک ہے۔ اللہ رحم کرے۔ بس میں چاہتی تھی۔ کہ ایک دو دن دیکھ کر شادی کی تاریخ تیہہ کر دی جائے۔ مریم کو واپس جانا ہے۔ اور میری خواہش ہے کہ میں اپنی پری سی بیٹی کو جلد سے جلد گھر لے آؤں۔ ابھی تو مریم آئی ہے۔ ساتھ احمد ہے۔ تو دونو خوب رونک لگائے رکھتے ہیں۔ مگر جب یہ نہیں ہوتے۔ تو خالی گھر جان کو آتا ہے۔ اب اگر آپ مناسب سمجھیں تو۔۔۔ کوئی تاریخ تیہہ کر لی جائے۔ دادی نے بہت مناسب انداز میں بات کی تھی۔ دوسری جانب ابتسام صاحب مسکرائے۔ آخر بیٹی کی ودائی کا دن آنے کو تھا۔

ہاں جی ! آپ آئیں کسی دن مل بیٹھ کر دیکھ لیتے ہیں۔ کوئی دن دیکھ کر رکھ لیتے ہیں۔

بہت شکریہ۔۔۔ بے حد شکریہ۔ آپ نے تو میری بہت بڑی خواہشی کا مان رکھ لیا۔ بے حد شکریہ۔۔۔ دادی کا دل باغ باغ ہو اُٹھا تھا۔

اسی طرح کی کچھ گفتگو کے بعد دونو جانب سے فون رکھ دیا گیا تھا۔ دونو گھروں میں یک دم شادی کی خوشیوں نے آبسیرا کیا تھا۔

یہ کیا بد تمیزی تھی مریم۔ عجیب جلد باز لڑکی ہو۔ پتہ نہیں تمہارا شوہر بیچارا کیسے برداشت کرتا ہے۔ دادی نے لاڈلی پوتی کو گھورا تھا۔ جواب پُرسکون ہو کر واپس اپنی جگہ جا بیٹھی تھی۔ اور واپس کام کو لگ گئی۔۔۔

اب بولو گی بھی۔ کہ کیا کر دیا میرے معصوم بچے نے ؟ جس کی وجہ سے اس سے پوچھے بغیر ہی فیصلہ کر لیا۔ جب پانچ منٹ بعد بھی وہ نہ بولیں تو آخر انہیں خود ہی پوچھنا پڑا۔

معصوم۔۔۔ ہنہ معصوم تو وہ بالکل نہیں ہے۔ وہ اب بچہ نہیں رہا۔ اسے اب تو لوگوں کے دل توڑنے آ گئے ہیں۔ اب تو وہ اتنا بڑا ہو گیا ہے، اتنا اُونچا ہو گیا ہے کہ باقی سب اسے کیڑے مکوڑے نظر آتے ہیں۔ پوتی کے منہ سے اتنے بڑے بڑے الفاظ وہ بھی اپنے لاڈلے پوتے کے بارے میں سُن کر ان کا منہ کھل گیا تھا۔

مریم بول بھی چکو اب۔ کیوں بوڑھی دادی کی جان لینا چاہتی ہو۔ عجیب مسخرا پن ہے۔ اب کی بار ان کے ماتھے پہ واضح ناگواری کو تاثرات دیکھے اور پڑھے جا سکتے تھے۔

سن لیں اپنے معصوم پوتے کی حرکت۔۔۔ کل پرسوں جب میں ماہ نور کو ساتھ مارکیٹ لے کر گئی تھی۔۔۔ وہ اب آہستہ آہستہ ساری بات ان کے گوشِ گزار کرتی جا رہی تھیں۔ جسے سن کر ان کا منہ کھلتا جا رہا تھا۔ افسوس اور صدمے سے ان کا حال بُرا ہوتا جا رہا تھا۔ انہیں اپنی تربیت پہ افسوس ہوا۔ ساری بات سن کر ان کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ اپنے پوتے سے انہیں اس حرکت کی ہرگز اُمید نہیں تھی۔

مریم آپی بھی دادی کو دیکھ کر غمگیں ہو گئیں۔

::::::::::::::::

ذریت بچے اپنا فون ٹیبل پہ رکھو۔ وہ اس وقت کافی عرصے بعد شام کا ٹوک شو دیکھنے میں مصروف تھا۔ جب کھانا لگنے پہ اُٹھا تھا۔ لیکن دادی جو ٹیبل پہ احمد کے ساتھ بیٹھی تھیں۔ ان کے اگلے حکم پہ مسکرا کر رہ گیا۔ اور اثبات میں سر ہلاتا فون وہیں ٹیبل پہ چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔

ماموں۔۔۔ رات آپ مجھے کہانی سُنائیں (سُنائیں) گے ؟ روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے دادی جان کے ہاتھ سے کھاتے احمد نے اپنے ماموں جان سے فرمائش کی تھی۔ ذریت ہنس دیا۔ اور بڑھ کر بیٹھنے سے پہلے اس کے گورے گورے گالوں پہ پیار کر کے چھوڑ دیا۔

کیوں نہیں۔ آج آپ میرے ساتھ سونا پھر میں آپ کو سٹوری بھی سُناؤں گا۔ اور آپ اور میں، ہم مل کر کارٹونز بھی دیکھیں گے۔ ذریت کو اس سے بات کرنے میں مزہ آ رہا تھا۔ تبھی دادی سے لے اسے اپنی گود میں بیٹھا لیا۔ اور خود کھلانے لگا۔

ماموں کی بات میں لفظ کارٹونز ایسا قابلِ اُنس تھا۔ کہ اس نے تیزی سے اثبات میں سر ہلایا تھا۔ مریم آپی جو چاولوں سے بھری ٹرے لئے آ رہی تھیں۔ مسکرا کر ان دونو کو دیکھنے لگیں۔ ذریت احمد سے باتیں کرتا بالکل بچہ بنا ہوا تھا۔ دادی نے بہت دِنوں بعد اسے مسکراتے دیکھا تھا۔

For more visit (exponovels.com)

ماموں آپ کو پتہ ہے۔ بیٹ مین۔۔۔ ایشے۔۔ ایشے اُرتا۔ میں بھی ویسے اُروں گا۔ ماموں میں اُروں گاناں؟ ذریت کی گود میں بیٹھا وہ اپنے پسندیدہ ٹوپک کو ڈسکس کرتا خوب پُرجوش ہو رہا تھا۔

ہاں ہاں میرے پرنس چارمنگ کیوں نہیں۔۔۔

ماموں آپ کو پتہ ہے بیٹ مین سب کی ہیلپ کرتا ہے۔ وہ کبھی نہیں روتا۔ آپ کی طرح۔

ذریت اس کی بات پہ خوب محظوظ ہوا تھا۔

اچھاااا۔ واہ کیا بات ہے آپ کے بیٹ مین کی۔

اوکے! احمد بیٹے اب آپ لاؤنج میں جاؤ۔ ماموں کھانا کھانے لگے ہیں۔ احمد ماں کا اشارہ پا کر تیزی سے ذریت کی گود سے اُترا اور کودتا لاؤنج کی طرف بھاگ گیا۔ وہ خاصا ایکٹو بچہ تھا۔

ذریت میں اور مریم نیکسٹ ویک تمہاری شادی کی ڈیٹ فکس کرنے جا رہے ہیں، ہم نے سوچا ہے۔ کہ جلد از جلد تمہارے فرض سے بھی سبکدوش ہو جاؤں۔ تمہارا کیا خیال ہے؟

دادی نے جو اسے کہا تھا۔ اس کا منہ کھل گیا تھا۔ اس نے تو اس شادی کو روکنے کا تازہ پلین بنایا تھا۔ وہ اس چھٹانک بھر کی بد تمیز لڑکی کے ساتھ اپنی زندگی تباہ نہیں کر سکتا تھا۔ ابھی تو نتاشا والا معملہ بھی نہیں حل ہوا تھا۔ اور اب یہ نیا مسلہ۔ اس شادی سے اس کا سارا پلین ملیامیٹ ہو سکتا تھا۔ یہ اسے نظر آ رہا تھا۔

دادی آپ اس سے کیا پوچھ رہی ہیں۔ بھلا ذریت کو کیا اعتراض۔ کیوں ذریت میں سہی کہہ رہی ہوں ناں؟۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی اعتراض اُٹھاتا، آپی نے فوراً سے پیشتر بات کاٹ کر کہا تھا۔ وہ وہی بولیں جو وہ سننا چاہتی تھیں۔ جو ان کے حسبِ منشا تھا۔ اس نے ایک نظر دادی کو دیکھا۔ اور پھر گہری سانس لے کر اثبات میں سر ہلا گیا۔ انکار کی گنجائش تو انہوں نے چھوڑی ہی نہیں تھی۔ اسے تو ہر صورت ہاں ہی بولنا تھا۔ سو وہ بول کر رہ گیا۔ اور پھر کھانا کھانے لگا۔ اس وقت وہ اپنے اگلے اقدام سوچ رہا تھا۔ دادی کو وہ انکار نہیں کر سکتا تھا۔ اور نہ آپی اسے ایسا کرنے دیتی۔ اس لئے اگلے وقت کا اسے سوچنا تھا۔

آپی اور دادی کو اس کا بغیر بحث کے مان جانا حیرت میں مبتلا کر گیا تھا۔ مگر وہ خاموش ہی رہیں۔

....

آج صبح کا آغاز ہر صبح کی طرح ہی ہوا تھا۔ کچھ ایسا نیا نہیں تھا۔ ہاں بس ایک چیز میں تبدیلی آئی تھی۔ کہ آج وہ کل سے کچھ زیادہ اُداس تھی۔ آج وہ کل کی طرح تروتازہ نہیں جاگی تھی۔ آج صبح اس کے لئے اپنے ساتھ ایک پریشانی بھی لائی تھی۔

سورج کی نئ نئ کرنیں بہت سوں کے لئے اُمید لے کر آئی آئی تھیں۔ اور بہت سوں کے لئے خوف۔۔۔ اس کے لئے یہ صبح خوف لائی تھی۔ کل رات میں اسی لڑکے کا فون ایک بار پھر آیا تھا۔ وہ اسے ماہ نور کی شادی پہ آنے کو بول رہا تھا۔ یہ دوسری بار اس کی اس سے بات تھی۔ ماہ نور کی شادی کی ڈیٹ دو روز پہلے ہی تیہہ پائی تھی۔ اس نے اسی روز اسے بتایا تھا۔ اور ساتھ آنے کی دعوت بھی دی تھی۔ اور کہا تھا۔ کہ اگر وہ نہ آئی تو وہ ناراض ہو جائے گی۔ لیکن اس نے انکار کر دیا۔ کہ وہ جانتی تھی۔ امی جی کسی صورت نہ مانتیں۔۔۔ بابا کو منانا تو الگ۔ اس لئے اس نے ان تک بات جانے سے پہلے ہی انکار کر دیا تھا۔ اور ماہ نور اس سے خاصی ناراض بھی ہوئی تھی۔ لیکن اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آر ہی تھی۔ کہ یہ بندہ کون ہے۔ جو ماہ نور کی شادی تک کے بارے میں جانتا ہے۔ اور جو جانبوجھ کر اسے بلیک میل کر کے شادی پہ آنے کو بول رہا تھا۔ وہ کون ہو سکتا تھا۔ یہ تو نہیں جانتی تھی۔ لیکن اس کا اس سب کے پیچھے مقصد کیا تھا۔ یہ اس کو ضرور سمجھ آر ہا تھا۔

فرح خان بندہ اتنا بُرا نہیں ہے۔ ایک بار سامنے آکر دیکھ لو۔ اس نے اسے کیا کہا تھا۔ وہ سن کر اس قدر خوف زدہ ہوئی تھی۔ کہ فوراً سے پیشتر کال کاٹ دی تھی۔ نہ تو وہ فون پھینکنے کے قابل تھی اور نہ ہی کسی کو کچھ بتا

سکتی تھی۔ ادھر پھوپو کی شادی بھی اگلے ماہ تک ہونا تیہہ پا چکی تھی۔ ایسے میں وہ انہیں تنگ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اور ویسے بھی وہ اس کے لئے کر بھی کیا سکتی تھیں۔ اس لئے اب مناسب یہی تھا۔ کہ وہ ماہ نور کے پاس شادی پہ جاتی۔ اور وہاں جا کر گھر والوں کو اس قصے کے بارے میں بھنک لگنے سے پہلے ہی ختم کر دیتی۔ مگر مصیبت یہ تھی۔ کہ وہ کہے کسے جو امی جی اور بابا کو وہاں جانے کے لئے منا لے۔ کم از کم اس کے کہنے پہ تو وہ کسی صورت نہ مانتے۔ کچھ پل سوچ کر وہ لان سے گھر کے رہائشی حصے کی جانب بڑھ گئی۔ اب اسے کچھ کرنا تھا۔ اس سے پہلے کہ اس کی عزت پہ بات آتی۔

وہ بجائے سامنے کے رستے سے گھر کے پچھلے دروازے سے اندر آئی تھی۔اس نے تیزی سے دروازہ کھولا اور ابھی اندر کی جانب قدم رکھا ہی تھا۔جب سامنے سے آتے بھاری وجود سے اس کا بُرا ٹکراؤ ہوا۔وہ گرتے گرتے بچی۔وہ بھی اس شخص کے تفیل جس نے اسے گرتا دیکھ کر فوراً سہارا دیا تھا۔ورنہ سر کے بل سیدھی زمین پہ جاتی۔

فرح کو لگا اس کا سر کسی پہاڑ سے ٹکرایا ہو۔وہ چکرا کر رہ گئی۔اور بہت اُلجھن سے اس انسان کو دیکھا۔تو نظر پڑتے ہی گویا سیٹی گُم ہو گئی۔وہ چاچو کے بڑے بیٹے کا ٹیچر اور بابالوگوں کے پھوپو کا چھوٹا بیٹا کاشف تھا۔وہ آج اتنی صبح ادھر کیا کر رہا تھا۔وہ تو شام میں آتا تھا ناں۔ابھی دو چار روز پہلے ہی تو چچی جان کے کہنے پہ چاچو جی نے کاشف سے کہا تھا۔کہ وہ ان کے بڑے بیٹے کو پڑھا جایا کرے۔تو اب اس وقت ؟ وہ اُلجھی تھی۔اور خاص طور پہ شرمندہ بھی ہوئی۔

آپ ادھر ؟

جی ! وہ کام تھا بھابھی سے کچھ۔۔۔وہ نہ جانے کیوں اسے گھورتا محسوس ہوا۔وہ پزل ہوئی۔

نہیں میرا مطلب خریت آپ دوسری طرف سے چلے جاتے۔اس طرف سے۔۔۔دانستہ اس نے جملہ آدھا چھوڑ بھی دیا۔

بس پتہ نہیں کیوں میرا دل چاہا ادھر سے گزروں۔ادھر سے جا رہا تھا۔اب سمجھ آئی کہ کیوں چاہ رہا تھا۔۔۔دل

جی ؟ اسے اس کی بات کا ایک لفظ بھی نہیں سمجھ آیا تھا۔ہاں البتہ نظریں اس کی اسے خاصی چبھتی ہوئی محسوس ہوئی۔تبھی ماتھے پہ بہت سے بل نمودار ہوئے۔کاشف مسکرا دیا گویا اس کے اندر کا حال جانتا ہو۔

کچھ نہیں۔۔۔میری بات پہ مت جائیں۔۔۔میں تو ایسے ہی بکواس۔۔۔چچی جان کی آواز پس منظر میں گونجی تو وہ جملہ چھوڑ کر فرح کی پشت کی جانب دیکھنے لگا۔ایکسیڈنٹ کی وجہ سے فرح کی رخ بدل گیا تھا۔

کاشف تم گئے نہیں ؟ چچی جان کی آواز اپنی پشت پہ سنائی دی تو۔وہ مڑی۔۔۔لیکن مڑنے پہ چچی جان کی آنکھوں میں جو اسے دیکھنے کو ملا تھا۔اس نے اس کا خون خشک کر دیا تھا جس سے اسے یکدم اپنا جسم سرد پڑتا محسوس ہوا۔

For more visit (exponovels.com)

جی بس جا ہی رہا تھا۔ کاشف کا لہجہ مسکراتا تھا۔

تم ادھر فرح سب خریت ؟ان کی آنکھیں اسی پہ تھیں۔اسے ان کا لہجہ خود پہ ہنستا محسوس ہوا۔وہ نظر جھکا کر تیزی سے وہاں سے گزر گئی۔اسے وہاں رکنا مناسب نہیں لگا۔جاتے ہوئے۔چار آنکھیں خود پہ جمی محسوس ہوئی تھیں۔یہ چچی جان اتنی عجیب کیوں ہیں؟وہ سوچ کر رہ گئی۔

::::::::::::::::::::::::::

آپ لوگوں نے شادی کی تیاری کا کیا سوچا کب تک شروع کر رہے ہو؟ بڑے خان (فرح کے والد) نے پوچھا تو کھانے کی میز پہ خاموشی کا وقفہ ہوا تھا۔

ایک دو دن میں کپڑوں کی تیاری شروع کرتے ہیں۔چچی جان نے کہا تو انہوں نے اثبات میں سر ہلا کر ایک نظر اپنی بیگم صاحبہ کو دیکھا۔اور پھر کھانے میں مصروف ہو گئے۔وہ اپنی عورت کو سمجھانے میں ناکام رہے تھے۔اب وہ کیا کہتے۔

آج دوپہر میں چچی آ رہی ہیں۔کھانے کا خاص خیال رکھنا۔ان کا رخ زہرہ پھوپو کی طرف تھا۔اور مخاطب بھی انہی سے تھے۔

جی بہتر۔۔۔وہ سر ہلا گئیں۔اندر سے انہیں بہت خوشی ہوئی تھی۔

وہ آئیں گی تو ساتھ ہزاروں شکوے شکایتیں بھی لائیں گی۔کہ زہرہ کی شادی کی تاریخ بھی رکھ دی اور ان کو بتانا کسی نے مناسب ہی نہ سمجھا۔بلانا تو دور کی بات۔۔۔چچی تھوڑی منہ پھٹ تصور ہوئی تھیں۔سب نے ایک ناگوار نظر ان پہ ڈالی مگر بولا کوئی نہیں۔

چُپ کر کے کھانا کھاؤ۔چاچو نے جواب میں جھڑ کا تو چچی کا منہ بن گیا۔مگر وہ بھی اپنے نام کی ایک تھیں۔منہ میں ہی بڑ بڑاتی ہیں۔

For more visit (exponovels.com)

بھابھی بیگم آپ کچھ بتادیں کیا بناؤں۔ مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آتا۔ پھوپو زہرہ کو نہ جانے کیا سوجھا کہ اپنی بڑی بھابھی کو مخاطب کر بیٹھیں۔ حلانکہ وہ زہرہ کو خاص پسند نہ کرتی تھیں۔

میں کیا بتاؤں۔ جو مرضی بناؤ۔ بے تاثر کہہ کر انہوں نے کہا تو انہیں مایوسی ہوئی۔ مگر پھر خوش اخلاقی سے سر ہلا گئیں۔

کھانے کے بعد سب مرد حضرات اُٹھ گئے۔ تو دونو بڑی خواتین بھی ساتھ ہی اپنے اپنے کاموں کو نبٹانے کو اُٹھ کھڑی ہوئی ۔کام جو تھے۔ کام بھی کیا کام تھے۔ بڑی بیگم کو اپنی بھابھی سے ہر روز اس وقت بات کرنا ہوتی تھی۔ جبکہ چھوٹی بیگم کو ڈرامہ دیکھنا ہوتا۔ اس کے بعد بڑی بیگم فرح پہ نظر رکھنے کو لاؤنج میں بیٹھ جاتیں۔ کہ چچی کے منہ سے وہ کچھ ایسے الفاظ سُن چکی تھیں۔ جس کی بعد ایک لمحہ وہ اسے زہرہ کے پاس نہ چھوڑتیں مگر افسوس وہ اب اتنے سال بعد ایسا کوئی حق سمجھتی نہ تھیں۔ اور چھوٹی چچی اس وقت اپنی بہن سے گفتگو فرماتیں۔ اور تب تک اس کام کو جاری رکھتیں جب تک ان کے بچے سکول سے آنہ جاتے۔ اس کے بعد سونے جاتیں۔ اور تب اُٹھتیں جب ان کے بچوں کو ٹیچر پڑھانے کو آتا۔ یہ روز کی روٹین تھی۔ وہ دونو خواتین بس کبھی کبھی کیچن میں آتی تھیں۔ سارا کیچن زہرہ پھوپو سنبھالتی تھیں۔ مگر پھر بھی وہ دونو خواتین انہیں کچھ خاص پسند نہ کرتی تھیں۔ ایک کے پاس وجہ تھی۔ کہ اس نے ان کی بیٹی کو ان سے چھینا۔ جبکہ دوسری کو اپنے بھائی کے ٹھکرائے جانے نے دو منہ کرر کھا تھا۔ اور اس سب سے الگ زہرہ تھیں۔ جو سمجھدار تو انتہا کی تھیں۔ مگر معصوم بھی تھیں۔ اسی لئے بھابیوں سے خوب بنا کر رکھنے کی کوشش کرتیں۔ مگر ناکام ہی رہتیں۔

فرح اور پھوپو۔۔۔ لان میں بیٹھی تھیں۔

پھوپو مجھے ہر صورت ماہ نور کی شادی پہ جانا ہے۔ پلیز کچھ کریں۔ فرح کو وہاں جا کر ہی اس مصیبت سے جان چھوڑانے کا طریقہ سوجھا تھا۔ اب وہ ہر صورت وہاں جا کر اس فون کال والے سے حساب برابر کرنا

چاہتی تھی۔ جس کی وجہ سے اسے سخت پریشانی اُٹھانی پڑی تھی۔

اچھا صبر کرو۔ کچھ سوچتی ہوں۔

ہاں پلیز۔۔۔ لیکن آپ بات کس سے کریں گی؟ میرا مطلب امی جی سے یا بابا سے؟

ماں تمہاری کو تم سے کوئی غرض نہیں۔۔۔باپ تمہارا ویسے بڑا مصروف۔تو میں جس سے بھی بات کروں گی۔تم بس تیاری پکڑو۔اور اس سب کو بھول جاؤ۔پھوپو کے الفاظ نے اسے دکھ دیا تھا۔مگر وہ خاموش ہی رہی۔

پھر بھی کس سے کریں گی۔؟وہ پھر سے پوچھ گئی۔

اوہو۔۔۔فری کیا پرابلم ہے۔بولا تو کہ چپ ہو جاؤ۔کچھ سوچ کر ہی کہا ہے۔کیوں بار بار تنگ کر رہی ہو۔ایک دم پھوپو کے غصہ کرنے پہ وہ گڑ بڑا کر انہیں دیکھنے لگی۔مگر پھوپو اس وقت کچھ سوچ رہی تھیں۔اور خاصی پریشان دکھتی تھیں۔وہ گہرا سانس لے کر رہ گئی۔وہ اس سے کبھی ایسے بات نہیں کرتی تھیں۔

پھوپو کیا ہوا؟آپ پریشان ہیں؟فرح کی آواز پہ پھوپو چونکیں۔

ہاں تھوڑی۔۔۔گہری سانس لی کر انہوں نے اثبات میں سر ہلایا تو فرح ان کی طرف گھومی۔وہ دونو اس وقت بینچ پہ بیٹھی تھیں۔

کیوں؟کیا ہوا؟مجھے بتائیں۔وہ اپنی پھوپو کو کسی صورت پریشان نہیں دیکھ سکتی تھی۔

ہاں۔۔۔بس فری بن ماں کی ہوں۔تو پریشانیاں تو اُٹھانی ہی ہیں۔کوئی ایک ہو تو بتاؤں۔پھوپو کے لہجے میں گہرا دکھ ہلکورے لے رہا تھا۔

کیا ہوا پھوپو؟بتائیں تو سہی۔ہو سکتا ہے میں کچھ کر سکوں۔اس کی تو جان پہ بن آئی تھی۔

ہلکی ہوا چل رہی تھی۔آسمان کی فضا میں چیل کی آواز سخت منحوس لگ رہی تھی۔ان کی نظریں بے اختیار آسمان کی جانب اُٹھیں۔اور پھر سورج کی آسمان پہ پھیلی تیز کرنوں کی وجہ سے واپس نیچے کر لیں۔

چھوڑو کچھ نہیں۔میں چچی سے بات کروں گی۔وہ منا لیں گی بڑے بھائی کو۔انہوں نے بات پلٹنا چاہی تھی۔فرح نے انہیں گھور کو دیکھا۔اور پھر ہاتھ بڑھا کر ان کا ہاتھ تھام لیا۔

For more visit (exponovels.com)

پھوپو بتائیں مجھے۔ کیا ہوا ہے؟ میرے سے شئیر کریں، ہو سکتا ہے۔ میں آپ کے لئے کچھ کر سکوں۔ فرح نے محبت اور نرمی سے کہا۔ تو ذہرہ نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔ اسکی آنکھوں میں محبت کی نرمی اور چمک تھی۔ وہ اس کی آنکھوں دیکھتی رہیں۔ یہاں تک کہ ماضی کے بہت سے عکس اس کی آنکھ میں بننے بگڑنے لگے۔ اور ساتھ ہی بیک گراؤنڈ میوزک میں مانوس سی آوازیں بجنے لگیں۔

ذہرہ کا کردار اچھا نہیں ہے۔ اس کو جلدی رخصت کر دو۔ تمہاری بیٹی کا مستقبل خطرے میں ہے۔ یہ آواز بوا کی تھی۔ تصویر میں بڑی بھابھی بیگم بھی واضح دکھ رہی تھیں۔ جن کے چہرے پہ اس کے لئے ناپسندیدگی واضح تھی۔

تمہاری بہن نے پہلے خود میرے بھائی کو ورغلایا۔۔ اور اب جب وہ رشتہ لے کر آیا۔ تو اسے بے عزت کر کے نکال دیا۔ میں پوچھتی ہو۔ کاہے کو اسے اتنی چھوٹ دے رکھی۔ ایسی بدعمال لڑکی کو تو گھر بیٹھانا ہی نہیں چاہیے۔ چھوٹی بھابھی کی آوازیں بھی واضح تھیں۔ جبکہ چھوٹے لالہ خاموش بیٹھے غصہ دبا رہے تھے۔

پھوپو۔۔۔ پھوپو۔۔۔ فرح نے کندھا ہلایا۔ تو وہ ماضی سے یکدم حال میں لوٹ آئیں۔ ہاں؟ کیا ہے؟

کہاں گم ہو گئی تھیں۔ میں نے آپ سے کچھ پوچھا تھا۔ بتائیں مجھے کسی نے کچھ کہا تو نہیں؟ وہ ان کے چہرے پہ کچھ تلاش کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

کچھ نہیں میری ماں۔ بس کچھ سوچ رہی تھی۔ آؤ اندر چلیں۔ وہ اسے کچھ نہیں بتانا چاہتی تھیں۔

نہیں بتایں گی پھر؟

جب کچھ ہو گا۔ تو ضرور بتاؤں گی۔ ابھی چلو۔ مسکرا کر اسے گھسیٹتی وہ اندر لے گیں۔ اس کا منہ بنا ہوا تھا۔ یہ پھوپو کبھی مجھ سے کچھ شئیر نہیں کرتیں۔۔۔

::::::::::::::::::::::::

لاہور شہر اس وقت روشنیوں میں ڈوبا ہوا۔ خوب آنکھوں کو خیرہ کرر ہا تھا۔ اس سب میں نتاشا کی چھب ہی نرالی تھی۔ لمبے سرخ سیاہ اور مونگیا رنگ ٹخنوں تک آتے فرک میں، ہائی ہیلز کے ساتھ۔۔۔ سج سج کر چلتی وہ ہوٹل میں موجود بہت سوں کے دلوں پہ بجلیاں گرا رہی تھی۔ اس کے خوبصورت ہونٹوں پہ لگی سرخ رنگ لپسٹک کے ساتھ ہلکے میک اَپ نے اس کے حسن کو چار چاند لگا دئے تھے۔ لوگوں کی نظروں کو خود پہ اُٹھتا دیکھ کر اس کی گردن فخر سے تن گئی۔ اور آنکھوں میں ایک مان ایک بھروسہ سا اُمڈ آیا۔ چاہے جانے کے احساس نے اسے مغرور بنا دیا تھا۔

ریزروڈ ٹیبل کو خوبصورت انداز میں پھولوں سے سجایا گیا تھا۔۔۔ اسے یقین تھا۔ کہ یہ ایک خوبصورت کینڈل لائٹ ڈنر ہو گا۔ کرسی گھسیٹی گئی جس پہ وہ ایک ادا سے بیٹھ گئی۔ اس نے ایک نظر سارے ہوٹل کے حال کو دیکھا۔ اور پھر فون کا کیمرہ آن کے اپنا عکس کیمرے میں دیکھنے لگی۔ ملازم اسے بیٹھا کر خود جا چکا تھا۔ اگرچہ وہاں موجود لوگوں کی نظروں نے اسے سمجھا دیا تھا۔ کہ وہ کیسی دِکھ رہی ہے۔ مگر پھر بھی اس نے دیکھنا ضروری سمجھا۔

وہ ہلکی نروس بھی تھی۔ دل کی ڈھڑکن دھیرے دھیرے اس کے کانوں میں رِدھم بنا رہی تھی۔ آج ذریت اس سے اظہارِ محبت کرنے والا تھا۔ وہ جسے چاہتی تھی۔ وہ اسے ملنے والا تھا۔ اس بات نے اسے بے انتہا خوش کرر کھا تھا۔ اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا ہی ناں تھا۔۔۔

ذریت کب آؤ گے۔۔۔ پندرہ منٹ تک انتظار کے بعد اکتا کر اس نے خود سے سوچا۔ اور فون آن کر کے سوچنے لگی۔ کہ آیا کے اسے میسج کرے یا رہنے دے۔ اور پھر فیصلہ یہ ہوا۔ کہ وہ اسے میسج کر کے ہرگز ظاہر نہیں کرے گی۔ کہ وہ اس کے انتظار میں سولی پہ لٹکی ہے۔ اب وہ ذریت کو تڑپانا چاہتی تھی۔

دس منٹ اور گزرے۔۔۔ پھر جب گھڑی پہ بیس منٹ اور بھی گزر گئے۔ تو نتاشا کو پریشانی ہونے لگی۔

نوین وہ ابھی تک نہیں آیا۔ ضبط سے چہرہ سرخیاں جھلکا رہا تھا۔ اس نے اکتا کر نوین کو ہی میسج کر دیا تھا۔

نہیں آیا؟ کیوں تم نے پوچھا نہیں؟ فوراً جواب موصول ہوا۔

نہیں۔۔۔

پاگل اسے میسج کر کے پوچھ لو۔اب کیا ساری رات ادھر رکو گی۔ہو سکتا ہے نہ آئے۔نوین کا میسج سکرین پہ چمکا۔

نہیں وہ آئے گا۔ایسے بھی بھلا ہوتا ہے۔اور ویسے بھی اس نے مجھے خود انوائٹ کیا تھا۔فوراً صفائی پیش کی۔وہ اب اندر سے خاصی پریشان تھی۔اسے اب تک آجانا چاہے تھا۔

ہاں تو کرو میسج۔۔۔کر کے بتانا مجھے۔نوین کی بات بھی سہی تھی۔آخر وہ کب تک بیٹھتی اور۔۔۔اس نے اثبات میں سر ہلا کر ذریت کا نمبر ملایا۔۔۔کال جا رہی تھی۔مگر کوئی اُٹھا نہیں رہا تھا۔دس منٹ تک مسلسل کال کرنے کے بعد جب اسے یقین ہو گیا۔کہ اب وہ کال نہیں اُٹھائے گا۔تو اس نے اس کے لئے میسج چھوڑ دیا۔مارے ضبط اور غصے کی انتہا کے اس کا بُرا حال تھا۔وہ جو اتنا تیار ہو کر خوشی سے یہاں جس کی خاطر آئی بیٹھی تھی۔وہ آیا ہی نہ۔۔۔اور اب فون بھی نہ جانے کدھر رکھ کر بھول بیٹھا تھا۔لوگ جو کچھ دیر پہلے اسے ستائش سے دیکھ رہے تھے۔اب انہیں نظروں میں اس کے لئے شرارت اور طنز تھا۔پہلی بار نتاشا کو احساس ہو رہا تھا۔کہ دل ٹوٹنے کی تکلیف کیا ہوتی ہے۔اور آج پہلی بار ذریت نے آذر کی تکلیف کا کچھ حساب برابر کیا تھا۔کھیل تو ابھی جاری تھا۔بساط تو بچھ چکی تھی۔جلد اُمید تھی کہ بازی گر اپنی بازی جیت کر ہی نکلے گا۔

ہاں میرے شیر کام ہوا؟ذریت نے اکمل کو میسج کیا۔تو جھٹ جواب آیا۔

ہاں بس ہو گیا۔میں اسے بتا چکا ہوں۔جا رہا ہے وہ۔اکمل کے ہونٹ لکھتے ہوئے مسکرا رہے تھے۔کمرے کی نیم روشنی میں اس کے چہرے پہ فخر تھا۔

تم کہاں ہو؟میسج اسفند کی جانب تھا۔وہ اس سے پوچھ رہا تھا۔

میں ادھر سے نکل چکا ہوں۔بھابھی ادھر بیٹھی تھیں۔تو مجھے لگا۔تم بھی ساتھ ہو گے۔اسی لئے میں نے تم سے پوچھا تھا۔

ہاں بس میں جانے والا تھا۔بس گاڑی کا پرابلم ہو گیا۔میں اسے بتا چکا ہوں۔اسفند کے جواب پہ بلکہ صفائی پہ اکمل نے ہنس کر بات انجوائے کی تھی۔اور پھر خُدا حافظ بول کر فون رکھ دیا۔

طوطا مینا۔۔۔وہ بڑبڑایا اور پھر آنکھیں موند لیں۔

نتاشا کا دل چاہ رہا تھا۔ ہوٹل کی ہر چیز توڑ دے۔ کوئی چیز نہ چھوڑے۔ وہاں موجود لوگوں کے چہرے بگاڑ دے۔

نتاشا تم ادھر؟ سامنے سے آتے اسفند کی آواز پہ نتاشا نے چونک کر سر اُٹھایا۔ اور نہایت غصے سے اسے دیکھا۔ اب ایک اسی کی کمی باقی تھی۔ ایک ناگوار سی نظر اسفند اکرام پہ ڈال کر وہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ وہ نظر اسفند کے اندر کو کاٹ کر گئی تھی۔ اسفند اکرام کی آنکھوں میں کوئی تاثر تھا۔ جو آہستہ آہستہ بننے بگڑنے لگا تھا۔ جب کچھ پل گزرنے کے بعد بھی اسنے اسے بیٹھنے کا نہ کہا۔ تو وہ خود ہی کرسی گھسیٹا ویٹر کو اشارہ کرتا براجمان ہو گیا۔ نتاشا نے ایک نخوست سے نظر اس پہ ڈالی جو شلوار قمیض میں تھا۔ اور اب خاصا اس کے وجود سے بے پرواہ دکھتا تھا۔

تم نے بتایا نہیں تم یہاں کیسے؟ پہلے کا پوچھا سوال ایک بار پھر سے اسنے دُھرایا تو نتاشا کا چار و نچار وہاں سے اُٹھنا ہی پڑا۔

اسفند میں تم سے کل بات کروں پلیز۔ ابھی میری طعبیت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ میں گھر جا کر ریسٹ کروں گی۔ وہ بنا دیکھے اسے کہہ گئی اور ساتھ ہی ساتھ اپنا بیگ اور فون بھی اُٹھایا۔ اس کے انداز سے صاف لگتا تھا۔ کہ اسے جانے کے لئے اسفند کی اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔

کھانا؟

نہیں۔۔۔ نہیں کھانا نہیں بس گھر۔ اللہ حافظ۔ کہہ کر اس سے پہلے کے وہ کچھ کہتا۔ وہ میز سے جگہ بناتی جا رہی تھی۔

شیور۔۔۔ وہ خود کلامی میں کہہ گیا۔ اس کے جان کے بعد وہاں رکنا اس کے لئے ممکن نہیں تھا۔ وہ بھی واپس آ گیا۔ لیکن اس کے دماغ ایک کہانی تھی۔ جو جنم لے رہی تھی۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ کرداروں کو سمجھے کیسے۔

::::::::::::::::::::::::::

فری بیٹا تمہارا منہ کیوں اتنا سا نکل آیا؟ کیا کھاتی نہیں ہو دھیان سے۔ اب تو تمہیں آئے ہوئے بھی کئی ماہ ہو گئے۔ چھوٹی دادی اپنے سارے روعب اور زعم کے ساتھ وہاں موجود سب کے درمیان بیٹھی ہوئی تھیں۔ وہ سوات سے ابھی کچھ منٹ پہلے پہنچی تھیں۔ ان کے آتے ہی مرد حضرات بھی گھر آ چکے تھے۔ اب سب ان کے گرد بیٹھے خوشی سے ان کا حال احوال پوچھ رہے تھے۔

نہ۔۔۔ نہیں دادی مجھے کیا ہونا۔ میں تو سیٹ ہوں بالکل۔ دادی کے تفتیشی انداز پہ وہ یک دم گڑ بڑا گئی۔

آئے ہائے۔۔۔ لڑکی کا منہ تو دیکھو کتنا سا نکل آیا۔ بڑی دادی کے بعد چھوٹی دادی تھیں۔ جو فرح سے بے حد محبت کرتی تھیں۔ وہ ان کے دل میں خاص جگہ رکھتی تھی۔

کھانا لگ چکا ہے۔ چھوٹی دادی کھانا کھالیں۔ صفوراں مائی کی چھوٹی بیٹھی جو شیفٹنگ کے دوران سوات سے ان کے ساتھ ہی پشاور آئی تھی۔ کھانے کا بتا رہی تھی۔

طیبہ بچی کیسی ہو؟ تم تو ہم سے ملی ہی نہیں۔ دادی کا پیار سب کے لئے یکساں ہی تھا۔ خواہ وہ مرد ہوں عورتیں ہوں، بچے ہوں یا پھر ملازمین۔۔۔ وہ سب کے دلوں پہ راج کرتی تھیں۔ اور سب کے لئے بہت نرم دل مشہور تھیں۔

جی دادی بس آپ کی دُعا ہے۔ ہاتھ مسل کر مسکرا کر جھکے سر کے ساتھ کہا تو دادی مسکرا دیں۔ تمہاری ماں کیسی ہے۔ شام میں لانا اسے۔۔۔ میں

دادی کھانا ٹھنڈا ہو جائے گا۔ چچی نے بیچ راہ میں ان کی بات کاٹ کر کہا۔ تو جہاں چھوٹی دادی کے ماتھے پہ بل نمودار ہوئے تھے۔ وہیں باقی سب بھی گڑ بڑا گئے۔ بڑوں کی بات کاٹنا ان کے خاندان میں سخت معیوب سمجھا جاتا تھا۔

بہو تمیز کو کس صندوق میں رکھ آئی ہو۔ یاد کر و اور لے آؤ۔ دادی نے ناگواری سے کہا۔ تو چچی گڑ بڑا کر سر جھکا گئیں۔ جبکہ ساتھ بیٹھے چاچو نے سخت ناگواری سے اپنی بیوی کو دیکھا تھا۔

آجائیں دادی جان میز پہ چلتے ہیں۔ کھانا آپ کا منتظر ہے۔ اب کی بار بات پلٹنے کو زہرہ پھوپو نے کہا۔ تو وہ سر ہلاتیں گھٹوں پہ زور ڈالتی اُٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔ ساتھ ہی باقی سب بھی اُٹھ کر ان کی میت میں ڈائننگ حال میں داخل ہوئے۔

بابا صاحب مجھے آپ سے بات کرنی تھی۔ کھانا سرو کیا جا چکا تھا۔ سب کھانے کی طرف متوجہ تھے۔ جب فرح نے ہمت کر کے بات شروع کی۔

ہم م م۔۔۔ سُن رہا ہوں۔ سر ہلا کر اُنہوں نے اجازت دی۔ تو وہ تھوک نگلتی۔۔۔ گہرا سانس لیتی۔ سب کو ایک نظر دیکھتی کہنے لگی۔۔۔

وہ بابا صاحب میری ایک دوست ہے لاہور میں ماہ نور۔۔۔ اگلے ہفتے اس کی شادی ہے۔۔۔ میں۔۔۔ میرا مطلب ہے۔اس نے ہمیں شادی پہ بلایا ہے۔اور خاص طور پہ اسرار بھی کیا۔ کہ ہم ضرور آئیں۔

منا کر دو،۔۔۔اس سے پہلے کہ بابا صاحب کچھ کہتے امی جی بول پڑیں۔اس کا منہ لٹک گیا۔ چھوٹی دادی بس خاموشی سے دیکھ رہی تھیں۔

میں نے منا کیا تھا۔ لیکن۔۔۔ لیکن وہ ضد پہ اڑی رہی۔ کہنے لگی۔ کہ اگر تم نہیں آؤ گی۔ تو میں تم سے کبھی بات نہیں کروں گی۔

جاؤ گی کس کے ساتھ۔ بابا صاحب کے سوال پہ جہاں وہ خوش ہوئی تھی۔ وہیں امی جی ناگوار

وہ۔۔۔اسے سمجھ نہیں آئی کیا کہے۔کسے لے کر جاتی۔

اس کے چپ رہنے پہ انہوں نے اسے ایک نظر دیکھا۔اور پھر واپس کھانے کی طر متوجہ ہو گئے۔اگر کوئی ساتھ جاتا ہے۔تو دو دن کے لئے چلی جاؤ۔ ورنہ رہنے دو۔۔۔

میں چلے چلتی ہوں۔اپنی مانو بلی کے ساتھ۔۔۔ دادی کے مان جانے سے اسے بہت خوشی ہوئی تھی۔وہ مسکرا کر سر ہلا گئی۔اور ایک آنکھ بچا کر پھوپو کو بھی دیکھ لیا۔جو اسے ہی دیکھ رہی تھیں۔اور مسکرا رہی تھیں۔میز کے دوسری جانب بیٹھی بڑی بیگم کے ماتھے پہ ناگواری کے واضح بل تھے۔اسی طرح کے کچھ تاثرات چچی کے چہرے پہ بھی تھے۔وہ دادی کی گُڈ بُک میں تھی۔یہ بات انہیں پسند نہ تھی۔

:::::::::::::::

For more visit (exponovels.com)

رشن دن بہت چہل پہل کے ساتھ اپنا آغاز کیا چاہتا تھا۔ اس نے کروٹ بدل کر سامنے دائیں جانب لگی بڑی سی شیشے کی کھڑکی کو دیکھا۔ جس کے دوسری طرف ٹیرس تھا۔ جہاں کل رات وہ سگریٹ نوشی کرتا رہا تھا۔ اور جہاں سے چاند چمکتا ہوا اس کے پہلو میں اُترا ہوا لگتا تھا۔

شیشے کے پار سے چھن کر آتی روشنی اس کے چہرے پہ پڑ رہی تھی۔ اس نے ان سنہری کرنوں سے بچاؤ کی خاطر ہاتھ آنکھوں کے سامنے کر لیا۔ اور کمرے میں نظر دوڑائی۔

کمرے میں سفید پینٹ کی مناسبت سے چوقلیٹ براؤن فرنیچر تھا۔ کھولے ہوادار کمرے کی کھڑکیوں کے سامنے بھی بھاری پردے تھے۔ جن کا رنگ بھی پینٹ اور فرنیچر کی مناسبت سے تھا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ساتھ ہی پاؤں بیڈ سے نیچے اتار کر، چوکلیٹ براؤن قالین پہ متناسب چال چلتی کھڑکی کے سامنے آگئی۔۔۔ اور ٹیرس کی جانب کی کھڑکی ایک جھٹکے سے کھول دی۔

وہ اس وقت نیوی بلو کاٹن کے ہلکے پھلکے سوٹ میں کھولے بالوں کے ساتھ اچھی دکھ رہی تھی۔ دائیں کندھے پہ جھولتے دوپٹے کو درست کر کے وہ ایک آخری نظر ٹیرس کی خالی کرسیوں پہ ڈال کر باتھ روم کی جانب بڑھ گئی۔

دس منٹ بعد اس کی آمد ہوئی۔ تو کمرے میں کھٹ پٹ کی آوازیں آرہی تھیں، جس سے ظاہر ہوتا تھا۔ کہ کمرے کا مالک آچکا ہے۔ وہ بغیر اسے نوٹس کئے شیشے کے سامنے جا کر کھڑی ہوگئی۔ اور آہستہ آہستہ گیلے لمبے بالوں کو سُلجھانے لگی۔۔۔ شیشے میں اس کا عکس اگرچہ واضح تھا۔ مگر ماہ نور نے دیکھنے سے عتراض برتا تھا۔ وہ ایک بد تمیز، اور بداخلاق مرد تھا۔ اور وہ اس سے کوئی بھی بات کر کے ماحول کو تناؤ کا شکار نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس نے نخوست سے ایک نظر اس کو دیکھا۔ جو رات کا جاگا شائد اب نیند پورا کرنے کی خواہش کو لئے، آنکھوں پہ بازو رکھے سونے کی کوشش میں تھا۔

شوخا۔۔۔ سوچ کر سرہلا کر اس نے ایک آخری نظر اپنے اوپر ڈالی تھی۔ وہ اس وقت جامن رنگ نازک سے کام داری شلوار سوٹ میں ملبوس تھی۔ گیلے بالوں کو کھولا چھوڑے، ہلکے میک اپ اور نازک سی جیولری کے ساتھ وہ قابل دید لگ رہی تھی۔ اس کی تروتازہ رنگت دمق رہی تھی۔ البتہ آنکھوں میں سرد مہری اور غصہ ہلکورے لے رہا تھا۔

For more visit (exponovels.com)

یہ پردے برابر کرو۔ کروٹ بدلتے اس نے اس قدر روکھائی سے ماہ نور سے کہا تھا۔ کہ وہ دانت پیس کر رہ گئی۔

مجھے سورج کی روشنی اچھی لگتی ہے۔اس نے بھی جواب میں اُسی روکھائی سے کہا۔اور جنوب سمت پڑے تھری سیٹر صوفے پہ بیٹھ گئی۔

جاؤ ٹیرس پہ جا کر اپنا شوق پورا کرو۔ مگر اس پردے کو برابر کرو۔ سیاہ ٹراؤزر شرٹ میں بکھرے بالوں کے ساتھ وہ خاصا چڑچڑا لگ رہا تھا۔ماہ نور اس کی پشت کو گھور کر رہ گئی۔

کیوں ناں میں یہ شوق باہر اس خوبصورت لان میں جا کر پورا کر لوں۔اس نے بھی اُدھار رکھنا پسند نہیں کیا تھا۔ذریت نے مڑ کر ایک نظر اسے سر سے پاؤں تک دیکھا(وہ اس عرصے میں لا تعلق ہو چکی تھی۔)اور پھر پاس پڑا کوشن منہ پہ رکھ لیا۔

جب تک میں سو کر اُٹھ نہیں جاتا۔ تم اس کمرے سے باہر نہیں نکلو گی۔ذریت کا یہ حکم اسے رات بھی موصول ہو چکا تھا۔منہ بگاڑ کر رہ گئی۔

میں یہاں اتنی دیر نہیں بیٹھ سکتی۔مجھے جانا ہے نیچے۔۔۔اسے سخت بھوک لگ رہی تھی۔

مجھے بات دُہرانے کی عادت نہیں ہے۔مجھے مجبور مت کرنا کہ میں تم پہ سختی کروں۔چپ چاپ ادھر بیٹھی رہو۔۔۔اور اب اُٹھو شاباش اور پردے برابر کرو۔وہ بالکل بھی نرمی سے بات کرنے کا عادی معلوم نہیں ہوتا تھا۔جب سے وہ اس گھر میں آئی تھی۔بلکہ وہ جب بھی اس سے بات کرتا تھا۔ہمیشہ لہجے کو روکھا،لا تعلق اور سخت رکھتا تھا۔اب کی طرح۔۔۔وہ خاموشی سے اُٹھ گئی۔اس نے سُنا تھا۔کہ مردوں سے ضد نہیں باندھنی چاہیے۔وہ بھی یہی کرنے کی کوشش میں تھی۔وہ یہاں آنے سے پہلے بہت سی باتیں پہلے ہی جانتی تھی۔مریم آپی نے مہندی کی رات اسے ذریت کے ماضی میں سخت برتاؤ کی جو وجوہات بتائیں تھیں۔وہ ان وجوہات کی بنا پر۔۔۔ عقل مندی سے کام لے کر حالات کو سازگار بنا سکتی تھی۔اور اس نے سوچا بھی یہی تھا۔ماہ نور کے کانوں میں مریم آپی کی آواز گونج رہی تھی۔وہ گہرا سانس لے کر ٹیرس میں آ گئی۔۔۔

اس لڑکے نے خودکشی ایک لڑکی کی وجہ سے کی تھی۔ جو آذر کی یونیورسٹی میں پڑھتی تھی۔ اس نے آزر کو اس طرح دھوکہ دیا تھا۔ ایسے اپنی محبت میں پھنسا کر ایسا بے بس کیا تھا۔ کہ وہ مارا ہی گیا تھا۔ وہ لڑکی ہم نہیں جانتے کون تھی۔ معلوم کرنے کی کوشش کی تھی۔ ذریت نے اور اکمل نے لیکن پھر آذر کی امی کے منا کرنے پہ اُنہوں نے اسے ڈھونڈنے کا کام چھوڑ دیا تھا۔ آذر کی موت کے بعد اس کی امی یہاں سے اپنی بیٹی کے پاس چلی گئیں۔ ذریت نے ان کو بھی روکنے کی بہت کوشش کی تھی۔ لیکن وہ نہیں مانیں۔ وہ اپنی بیٹی مومنہ کے پاس رہنا چاہتیں تھیں۔ ذریت آذر سے بہت محبت کرتا تھا۔ دونوں نے سارا بچپن، لڑکپن، اور جوانی کے اوائل ایک ساتھ ہی گزارے تھے۔ آگے بزنس ایک ساتھ ہی کرنے کا پلین تھا دونوں۔ مگر۔۔۔ مگر اس سے پہلے ہی آذر چلا گیا۔ مریم آپی کی آنسوں میں بھیگی آواز اب بھی ایک تسلسل سے اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ وہ جو کھڑی بلندی سے نیچے لان میں لگے پودوں کو دیکھنے میں مصروف تھی۔ تھک کر ایک کرسی دیوار کی چھاؤں میں لے کر بیٹھ گئی۔

ماہ نور نے سر دیوار سے ٹکالیا۔ ایک آنسو بہت خاموشی سے اس کی آنکھ سے نکلا۔ اور اس کی گال پہ پھسلتا قمیض کے گلے میں جزب ہو گیا۔ وہ نہیں جانتی وہ کیوں روئی تھی۔ شائد ذریت کے غم کا احساس کر کے۔۔۔

:::::::::::

اگر سو نہیں گئی۔ تو آجاؤ تمہاری پیاری نند یاد فرماتی ہے۔۔۔ وہ جو آنکھیں بند کئے۔ کہیں ماضی میں گم ہو چکی تھی۔ اس کی آواز پہ چونکی۔ اور جھٹ گیلے گال بھی صاف کر لئے۔ وہ آنکھیں سکیڑے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ ماہ نور کو شرمندگی ہوئی۔ اور ساتھ ہی ذہن میں خیال بھی آیا تھا۔ کہ کہیں وہ غلط نہ سمجھ لے۔

چلو بھی۔۔۔ وہ اس وقت لیمن رنگ ٹی شرٹ میں ملبوس، کچھ دیر پہلے کے حولیئے سے یکسر مختلف تروتازہ دکھ رہا تھا۔ ماہ نور کو اپنی جگہ سے ہلتا نہ پا کر اس نے جھڑکا۔ تو وہ خاموشی سے اُٹھ گئی۔

پلیز آئندہ میرے سے ایسے بات مت کیجئے گا۔ ماہ نور کو سخت خفت محسوس ہوئی تھی۔ وہ بغیر گھبرائے کہہ گئی۔

ذریت نے اس کے کہنے پہ رک کر اور ایک آنکھ سکیڑ کر، اسے دیکھا۔۔۔اور پھر واپس چل پڑا۔ میرے سے کسی بھی اچھے رویے کی اُمید مت رکھنا۔۔۔کہنے کے ساتھ اس نے کمرے میں قدم رکھا۔اور پھر دراز سے ایک باکس نکال کر اسے تھما دیا تھا۔ماہ نور اس سے پہلے کہ سمجھتی۔ پکڑا کر وہ جا چکا تھا۔

باکس کو قدرِ شش و پنج میں اس نے کھولا۔۔۔تو اس میں ایک خوبصورت ہیروں جُڑا سیٹ تھا۔ جس کی چمک اس کی قیمت کو بڑھا رہی تھی۔

واؤ۔۔اسے وہ اچھا لگا تھا۔ضرور آپی نے ہی لیا ہو گا۔اس شوخے سے تو بالکل بھی اُمید نہیں ہے۔ سر جھٹک کر اس نے سوچا اور پھر سیٹ الماری میں رکھ کر خود بھی باہر آ گئی۔ جہاں سب اس کے منتظر تھے۔

::::::::::::

وہ جس وقت ڈائنگ حال میں داخل ہوئی۔۔۔تمام مہمان کھانے کی میز کے گرد بیٹھے، دُلہن کے منتظر تھے۔اس نے آتے ہی قدرِ مسکرا کر سلام کیا۔ مہمانوں پہ ایک طائرانہ نظر ڈالی۔اور پھر ذریت کے پہلو کی کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔سب مہمان اسے ہی دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔

نیند اچھی آئی رات میں۔اگر ابھی بھی تھکاوٹ محسوس کرو۔تو پھر سے سو لینا۔رات میں ولیمہ ہے۔سو بے فکر رہنا۔مریم آپی اس کے بائیں جانب بیٹھیں تھیں۔ان کے کہنے پہ مسکرا کر اس نے سر ہلا دیا۔

تم کافی عقل مند ہو۔ذریت کو لگا تھا۔وہ اس کے بُرے رویے کے بعد ضرور اس کے گھر والوں کے ساتھ، روکھا پیش آئے گی۔یا پھر کھانے کی میز پہ تو وہ ضرور ہی اس کے ساتھ بیٹھنے سے انکار کر دے گی۔ مگر اس نے حیرت انگیز طور پہ ایسا کچھ بھی نہیں کیا تھا� آہاں۔۔۔چلیں شکر ہے۔آپ کو پتہ تو چلا۔بظاہر مسکرا کر کہے گئے۔اس کے الفاظ میں طنز کی کاٹ ذریت نے واضح محسوس کی تھی۔ایک سرد نظر ڈال کر سب مہمانوں کو دیکھا۔اور پھر ماہ نور کو۔۔۔جو آپی کے دئے گئے جوس کو گھونٹ گھونٹ پی رہی تھی۔

تم بولتی بہت ہو۔اور مجھے باتونی عورتیں سخت زہر لگتی ہیں۔ایک بار پھر سے اس نے قدرِ جھک کر کہا۔ تو ماہ نور مسکرا دی۔دادی اور مریم آپی کی نظریں ان دونوں پہ ہی جمی تھیں۔دادی ذریت کو جہاں دیکھ کے خوش ہو رہی تھیں۔وہیں مریم آپی کچھ اُلجھ رہی تھیں۔وہ اپنے بھائی کو بہت اچھے طریقے سے جانتی تھیں۔اس کی رگ رگ سے واقف تھیں۔

کس قسم کی خواتین آپ کو پسند ہیں۔آپ بتادیں۔تا کہ میں ویسی بن جاؤں۔

دادی مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔میں شام تک واپس آجاؤں گا۔ماہ نور کی بات کے جواب میں اس نے کرسی دھکیلی۔اور دادی سے مخاطب ہو کر کہا تھا۔مگر دادی کے جواب دینے سے پہلے ہی وہ جا رہا تھا۔

مجال ہے۔جو یہ بچہ گھر آرام سے ٹِک جائے۔دادی کا بس چلتا۔تو آج وہ اس کے پاؤں کسی رسی سے باندھ دیتیں۔

یہ ابھی کیا بکواس کر کے گیا ہے؟مریم آپی ذریت کی چھوڑی کرسی پہ آبیٹھی تھیں۔ماہ نور نے قدرِ حیران ہو کر اُنہیں دیکھا۔

آپی اب کیا آپ میرے سامنے میرے شوہر کے بارے میں ایسے الفاظ استعمال کریں گی۔

تمہارا بیچارا شوہر ہے ہی اس قابل کہ دن رات اس کی عزت افزائی کی جائے۔اس کے منہ بنانے پہ مسکراہٹ دبا کر اُنہوں نے کہا۔تو ماہ نور بھی مسکرا دی۔یہ تو سہی کہا آپ نے۔

نند بھاوج میں خوب بنتی معلوم ہوتی ہے۔وہ خاتون ذریت کے رشتے میں ممانی تھیں۔جو کافی دیر سے ان دونوں کو کسی بات پہ آہستہ آہستہ مسکراتے دیکھ رہی تھیں۔آخر مسکرا کر دادی سے پوچھ ہی لیا تھا۔جواب میں دادی کا مان اور خوشی سے چہرہ کھل ہی گیا تھا۔

ماہ نور اور آپی بھی مسکرا دیں۔

ہاں میری بہو۔۔۔بہت اچھی ہے۔تم نہیں جانتی میں نے اِسے کیسے ڈھونڈا۔دادی کے لہجے میں چُھپی محبت نے ماہ نور کو آنکھیں جُھکانے پہ مجبور کر دیا تھا۔وہ کہاں ماں کی محبت کی عادی تھی۔

اماں بتا ہی دیں پھر آپ۔ کہ کیسے ڈھونڈی اتنی پیاری بہو۔ ذریت کی خالہ نے مسکرا کر ماہ نور کو دیکھ کر کہا۔ تو دادی دھیمے سے مسکرا دیں۔

جاؤ چائے بناؤ۔ ساتھ بیٹھ کر پیتے ہیں ساتھ سارا واقع بھی بتاؤں گی۔ دادی کے لہجے میں جوش تھا۔ ماہ نور شرمندہ ہو گئی۔

آپی اب کیا دادی سارا واقع بتائیں گی۔ اس نے پریشانی سے پہلو میں بیٹھی مسکراتی مریم آپی سے پوچھا تھا۔ وہ ہنس دیں

دادی پہ بھروسہ رکھو۔۔۔ وہ کہانیاں سُنانے میں بہت ماہر ہیں۔ آؤ ہم تمہارے کمرے میں چلیں۔ آپی نے کہنے کے ساتھ کرسی کھینچ دی۔ تو وہ سب سے اجازت لیتی اُٹھ گئی۔

:::::::::::::

ماہ نور ایک بات پوچھوں ؟ مریم آپی اس کے سامنے صوفے پہ بیٹھی تھیں۔ اور ماہ نور ان کے سامنے بیڈ پہ ٹانگیں لٹکائے اپنے سوٹ کے سٹونز پہ انگی پھیر رہی تھی۔

جی آپی پوچھ کیوں رہی ہیں۔ جو پوچھنا ہیں کھولے دل سے پوچھیں۔ اس نے ان کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر کہا۔ تو وہ دھیمے سے مسکرا دیں۔

تم میرے سے ناراض تو نہیں ہو۔ میرا مطلب ہے۔ جیسے میں نے تمہیں سب کو سچ بتانے سے منا کیا تھا۔ جیسے میں نے تمہیں روکا تھا۔ اس کے بعد ناراض ہو جانا ایک فطری سی بات ہے۔ مریم آپی کے دل میں یہ بات کافی دیر سے کانٹے کی طرح چُب رہی تھی۔ بس شائد یہ بھائی کی محبت ہی تھی۔ کہ وہ ماہ نور کو کھونا نہیں چاہتی تھیں۔ چاہے لاکھ مسلے ہوتے۔ کہ وہ جانتی تھیں کہ وہ ان کے بھائی کے لئے بہترین ہے۔

نہیں آپی ناراض نہیں ہوں۔ لیکن وقتی طور پہ سچ پوچھیں۔ تو تھوڑا فکر مند ہوئی تھی۔ لیکن پھر میں نے اللہ پہ چھوڑ دیا۔ اس نے معصومیت سے کہا۔ تو مریم آپی پھر سے مسکرا دیں۔

مجھے اور دادی کو تمہاری یہی بات بہت پسند ہے۔ تم جانتی ہو عجیب بات ہے۔ لیکن سچ ہے۔ کہ میرا بھائی بہت عام سا مرد ہے۔ اس کی ناراضگی دور کرنا۔ یا اس کو منانا بہت آسان ہے۔ اس کا مسلہ بھی عورت کا کردار ہی ہے۔ اب بے شک وہ خود جو بھی ہو۔ خود اس کا کردار جیسا بھی ہو۔ میں جانتی ہوں۔ یہ اچھی بات نہیں ہے۔ غلط ہے۔ مگر میں اس کے لئے اتنا ہی کر سکتی ہوں۔ جتنا اب تک اس کو سیٹ رکھنے کے لئے میں اب تک کرتی آئی ہوں۔ مریم آپی کے چہرے پہ فکر کی لکیریں تھیں۔ ماہ نور جواب میں خاموش ہی رہی تھی۔

وہ اس عورت سے شادی کرنے کے لئے ہر گز تیار نہیں تھا۔ جسے وہ جانتا نہیں تھا۔ میں جانتی ہوں۔ کہ وہ ایسا ہی ہے۔ اپنے سے منسلک چیز میں ہر لیحاظ سے پرفیکشن دیکھنا چاہتا ہے۔ پلیز ماہ نور تم اس کی کسی بھی بات کو دل پہ مت لینا۔ بلکہ جب بھی کوئی مسلہ ہو۔ اسے عقلمندی سے حل کرنے کی کوشش کرنا۔ میں جانتی ہوں۔ ذریت دل کا بہت نرم اور اچھا ہے۔ جب وہ تمہیں دیکھے گا، پرکھے گا۔ وہ تم سے ہماری ہی طرح محبت کرے گا۔ ماں اور بہن کے سوا اس نے کبھی عورت کو اس نظر سے نہیں دیکھا۔ اسی لئے ایسا ہے۔ مریم آپی بہت محبت اور نرمی سے اسے سب سمجھا رہی تھیں۔ وہ سنتی رہی، اور سمجھ کر اثبات میں سر ہلاتی رہی۔

آپی میں جانتی ہوں۔ کہ آپ جو بھی مجھے کہہ رہی ہیں۔ وہ محض لفاظی نہیں ہو گی۔ لیکن مجھے بس اس بات کا خوف ہے۔ کہ کہیں اتنی دیر نہ ہو جائے۔ کہ۔۔۔ وہ بات کو اختتام میں چھوڑ گئی تھی۔ مریم آپی نے چونک کے اُسے دیکھا۔

ماہ نور نااُمید مت ہو۔ اور ایک دلچسپ بات بتاؤں۔ مرد جتنا خود کو عقلمند سمجھتے ہیں۔ کچھ معاملوں میں ہوتے نہیں ہیں۔ عورت کو وہ بس انڈر ایسٹیمیٹ کرتے رہتے ہیں۔ ورنہ عورت کے سامنے گھٹنے ٹیک دینا، کوئی نئی بات نہیں ہے۔ عورت کو مرد کی بائیں پسلی سے بنایا ہی اس لئے گیا ہے۔ کہ جب مرد ٹیڑھا ہونے لگے۔ فوراً سے سیدھا کر دے۔ اور ویسے بھی تم نہیں دیکھتی۔۔۔ عورت کے لئے مرد۔ وہ بھی اپنے شوہر کو بے وقوف بنانا کونسا مشکل کام ہے۔ آخری بات اُنہوں نے ہنس کے کہی تھی۔ ماہ نور بھی مسکرا دی۔

اگر آپ کا بھائی یہ سب سُن لے۔ تو؟

تو کیا۔۔۔ میں تو اس کے سامنے ہی اُسے ایسے ایسے ارشادات سے نواز چکی ہوں۔ کہ بس۔۔۔

ہاہاہا۔۔۔کاش میں وہ ارشادات سُن سکتی۔اس نے ہنس کر کہا تھا۔مریم آپی مسکرتی اُٹھ کھڑی ہوئیں۔

ہاں سُن لینا۔ویسے بھی تمہارا شوہر ایک ایسا انسان ہے۔جو اپنی عزت افزائی کے مواقع خود ہی فراہم کرتا رہتا ہے۔بہت جلد تم دیکھو گی۔مریم آپی کی بات پہ وہ ایک بار پھر سے ہنسی تھی۔

واہ شیر کو بھی کوئی زنجیر ڈال سکتا ہے۔کیا بات ہے۔مجھے تو آپ سے کلاسز لینی ہوں گی۔ماہ نور نے ان کے جاتے جاتے بھی ہنس کر کہہ دیا تھا۔

بول کر شیر اور سر مت چڑھانا اُس کو۔اور بے فکر رہو۔آہستہ آہستہ سب سیکھ جاؤ گی۔کہہ کر وہ دور وازہ کھولتی کمرے سے نکل گئیں۔تو وہ بھی مسکراتی بیڈ پہ پاؤں اکٹھے کر کے بیٹھ گئی۔اسے ایک دم سے بھائی اور بابا بہت یاد آنے لگے تھے۔اس نے صبح نماز کے بعد سب سے پہلے بابا کو کول کی تھی۔اور بابا نے دوسری بیل پہ ہی اس کی کال اُٹھالی تھی، شائد وہ رات بھر سوئے نہیں تھے۔

ماہ نور گہرا سانس لے کر رہ گئی۔اب تو شائد یہ جُدائی ہمیشہ کے لئے قسمت میں لکھی گئی تھی۔اب تو بس سوائے صبر کے کوئی چارا نہ تھا۔

:::::::::::

آ گئے۔۔۔مل گئی آپ کو اپنی بیوی سے اجازت گھر سے باہر نکلنے کی۔وہ اس کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔جب نتاشا نے طنز کیا۔ذریت نے سر اثبات میں ہلا دیا� آ ایک خوبصورت عورت بھی حسد کر سکتی ہے۔مجھے اندازہ نہیں تھا۔ذریت کم کم مسکراتا تھا۔اب بھی بغیر مسکرائے کہا۔تو نتاشا دلکشی سے مسکرا دی۔

ہنی حسد کیسا؟ وہ میرے سے زیادہ خوبصورت تو نہیں ہو گی۔اور ویسے بھی جو چیز اس کے پاس میری کچھ مصلیحت کے تحت ہے۔میں اس کو ہمیشہ تو اس کے پاس رہنے نہیں دوں گی۔اور ہم بہت جلد شادی کر لیں گے۔تب وہ ہماری زندگی میں کہیں نہیں ہو گی۔پھر اس طرح کی حالت میں حسد نہیں بنتا۔البتہ مجھے اس پہ ہنسی ضرور آتی ہے۔بیچاری تم سے شادی پہ پتہ نہیں کتنی خوش ہو گی۔فرنڈز کے سامنے کتنا اترائی ہو گی۔وہ بالکل اپنی سوچ کے تحت بات کر رہی تھی۔

For more visit (exponovels.com)

ذریت بے اختیار لمبی سانس لے کر رہ گیا۔ ناشتے کی میز پہ اس کے طنز وہ سُن چکا تھا۔ اور جس طرح سے اُس نے ذریت کو اگنور کیا تھا۔ یہ بات اس کے لئے عجیب بھی تھی۔ اور ناگوار بھی۔۔۔

کیا ہم کوئی اور بات کریں۔ اس نے ناگواری سے کہا۔ تو نتاشا جیسے کھل ہی گئی۔

ہاں ضرور۔۔۔

ویسے ذریت اگر ڈیڈ نے کوئی پرابلم کیا تو؟ میرا مطلب ہے۔ کہ وہ ابھی تک یہ نہیں جانتے۔ کہ میں اسفند سے منگنی ختم کر چکی ہوں۔ جب اُنہیں پتہ چلے گا۔ وہ مجھے چین بھیجنے کی ہر ممکن کوشش کریں گے۔ تب۔۔۔ تب کیا ہو گا ذریت۔ اسے صرف اسی بات کا خوف تھا۔ ذریت جو ٹانگیں سیدھی کئے۔ کوفی شوپ میں بیٹھا۔ ارد گرد کے لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔ نتاشا کی بات پہ سر اثبات میں ہلایا۔

تو مائی ڈیئر۔ میں وہاں بھی جا سکتا ہوں۔ اور بے فکر رہو۔ میں خود تمہارے ڈیڈ کے پاس جاؤں گا۔ مجھے یقین ہے۔ کہ میرا سٹیٹس وہ اسفند اکرام سے کم نہیں پائیں گے۔ نتاشا نے جوش میں سر ہلایا تھا۔ اسے خامخوہ شک و شباہت میں نہیں پڑنا چاہیے تھا۔

ذریت آپ نے اپنی بیوی کی کوئی تصویر نہیں دیکھائی۔ مسکرا کر اس نے سامنے بیٹھے ذریت سے کہا تھا۔ وہ آنکھیں سکیڑ کر اُسے دیکھنے لگا۔

تم اُسے دیکھ کر کیا کرو گی۔

بس ویسے ہی۔۔۔ میں دیکھنا چاہتی تھی۔ کہ آپ کی جلد ایکس ہو جانے والی وائف کیسی ہے۔ مسکراہٹ دبا کر اُس نے کہا۔ تو ذریت ٹانگیں سیدھی کر کے بیٹھ گیا۔ اور سامنے پڑی کافی پینے لگا۔

میرے پاس اس کی کوئی تصویر نہیں ہے۔ اور اب بات یا تو بدل دو یا پھر مجھے اجازت دو۔ وہ ہمیشہ بات دوٹوک انداز میں ہی کرتا تھا۔ اب بھی دوٹوک کہا تو وہ مسکرا کر سامنے چہرے پہ پڑتے بالوں کو دائیں کان کے قریب سے انگلی پہ فولڈ کرنے لگی۔

For more visit (exponovels.com)

جیسا آپ کہو۔

:::::::::::::

عصر کی نماز کا وقت تھا۔ وہ ابھی نیند سے اُٹھی تھی۔ ماہ نور کا آج ولیمہ تھا۔ سیڑھیاں اُترتے اُسے یاد آ گیا۔ کل کا دن بہت خوبصورت گزرا تھا۔ ماہ نور کی رُخصتی پہ اسے بہت مزہ آیا تھا۔ بابر بھائی نے خوب چُٹکلے چھوڑے تھے۔ وہ مسکراتی آنکھیں ملتی، لاؤنج میں آ گئی۔

لاؤنج میں اُنچی آواز میں ٹی وی چل رہا تھا۔ وہ وہیں صوفے پہ بیٹھ گئی۔ اور چینل سرچ کرنے لگی۔

ٹی وی دیکھنے کے دوران وقفے وقفے سے کیچن سے برامد ہونے والی کھٹ پٹ کی آوازین بتا رہی تھیں۔ کہ وہاں کوئی موجود ہے۔

پھوپو اگر آپ ہیں تو پلیز ایک کپ چائے بنا دیں۔ سر میں بہت درد ہے۔ سر میں درد متواتر تھا۔ سونے کے باوجود سر کی کل شام سے ہونے والی درد بالکل نہیں جا رہی تھی۔

پھوپو تو نہیں مگر تمہاری چاچی ضرور ہوں۔۔۔ چچی کے ہاتھ میں چائے کا کپ تھا۔ فرح صوفے کی پشت سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ جھٹ سیدھی ہوئی۔

مجھے لگا پھوپو ہیں۔ چائے ان کے ہاتھ میں دیکھتے اس نے کہا تھا۔ وہ مسکرا کر اس کی جانب بڑھیں،

کوئی بات نہیں! جاؤ ذرا یہ ڈرائینگ روم میں چائے دے آؤ۔ تب تک میں تمہارے لئے بھی چائے ڈال دیتی ہوں۔ کہنے کے ساتھ اُنہوں نے کپ اُس کی طرف بڑھایا تو سوالیہ انداز میں ان کو دیکھتی اُٹھ گئی۔

کون۔۔۔ کون ہے۔ ڈرائینگ روم میں؟

کوئی غیر نہیں ہے۔۔۔ کہہ کر وہ مڑی تھیں۔ مگر پھر اس کو وہیں کھڑا دیکھ کر رک گئیں۔

تم ابھی تک کھڑی ہو۔ارے بھئی جاؤ بھی۔اب کی بار اُنہوں نے جانے کے لئے سامنے کی جانب ڈرائینگ روم کو اشارہ کیا۔ تو وہ سر ہلاتی بڑھ گئی۔

اس نے جیسے ہی ڈرائینگ روم میں قدم رکھا۔ وہ ایک دم گڑ بڑائی تھی۔ اسے اُمید نہیں تھی۔ کہ اُدھر کاشف ہو گا۔ وہ ایک لمحے کو رکی۔ مگر پھر بارعب چال چلتی آگے بڑھ گئی۔ کاشف جو سر جُھکائے چچی کے لاڈلے کو پڑھانے میں مصروف تھا۔اس کے آنے پہ سر اُٹھا کر مسکراتا اُسے دیکھنے لگا۔

فرح نے خاموشی سے کپ میز پہ رکھ دیا۔اور ابھی مڑی تھی۔ جب پشت پہ پڑنے والی آواز پہ رکنا پڑا۔

شائستہ آپ کو گھر پہ بلا رہی تھی۔۔۔

جی؟

شائستہ میری بہن۔۔۔اس نے مجھے آپ کو پیغام دینے کو بولا تھا۔ مگر آپ شائد کہیں گئیں ہوئی تھیں۔۔۔ ویسے آپ کہاں گئی تھیں۔؟ ہاتھ میں پین پکڑے وہ صوفے کی پشت سے ٹیک لگائے اُسے دیکھتا پوچھ رہا تھا۔ فرح کو اس کا سوال اور اس کا انداز دونوں بُرے لگے تھے۔

کیوں؟ آپ کو اس بات سے کیا۔ میں کہاں گئی تھی۔ اور اپنی بہن سے بول دیجئے گا۔ کہ میں مصروف ہوں۔ اگر ملنا ہو تو گھر آ جائے۔اس نے روکھائی سے کہا۔ تو کاشف بھی سر اثبات میں ہلاتا مسکرا دیا۔

میرے خیال میں آپ کو میرا سوال پسند نہیں آیا۔

نہیں! آپ کا خیال سراسر غلط ہے۔ خیر یہ چائے چچی نے بھیجی ہے۔ پی لیجئے گا۔ کہہ کر وہ رکی نہیں تھی۔ کاشف نے ایک ابرو اُٹھا کر بغور اُسے دیکھا۔اور پھر سر جھٹک کر واپس کام کی متوجہ ہو گیا۔

اتنی دیر لگا دی چائے دینے میں۔۔۔ چچی نے اسے آتا دیکھ کر کہا تھا۔ وہ صوفے پہ پاؤں چڑھائے بیٹھیں۔ کوئی ڈرامہ دیکھنے میں مصروف تھیں۔ فرح کو ان کا انداز ناگوار گزرا مگر خاموش ہی رہی۔

For more visit (exponovels.com)

یہ تمہاری چائے پڑی ہے پی لو۔ ویسے اب تک تو ٹھنڈی ہو چکی ہو گی۔۔۔ چینل سرچ کرتے ہوئے اگرچہ لئے دئے انداز میں کہا تھا۔ مگر فرح خان کوئی بچی نہیں تھی۔ کہ ان کا رویہ اور طنز نہ سمجھتی۔

چلیں کوئی بات نہیں۔ آپ کے آگے ایک چائے کی کیا قیمت۔۔۔ آپ کو پتہ ہے۔ کاشف بھائی کہہ رہے تھے۔ کہ وہ چائے نہیں پیئیں گے۔ مجھے سخت بُری لگی ان کی یہ بات۔ بھلا کیا تک بنتی ہے انکار کی۔ آپ نے بیٹا سمجھ کر اتنے پیار سے چائے بنائی۔ اور میں بھائی سمجھ کر لے کر گئی۔ مگر کیا کہنے خون جو سفید ہو گیا۔ آگے سے اور بولے۔ کہ چائے کچھ ایسی اچھی بھی نہیں ہوتی۔ لو اب بھلا یہ کوئی بات تھی کرنے والی۔ صفاچٹ جواب سُن کر میرا تو دل ہی کھٹا ہو گیا۔ سوچا لے جاؤں چائے واپس۔ بے قدرِ کو بھلا آپ کی محبت کی کیا قدر۔ مگر پھر منت کر لی۔ کہ آپ کا خامخواہ دل کھٹا ہو گا۔ صوفے سے پاؤں لٹکا کر بیٹھتے، اس نے خاصی لمبائی اور صفائی سے لیٹ آنے کی وجہ بیان کی تو چچی پہ گویا گھڑوں پانی پڑا۔ ان کا کہاں خیال تھا۔ کہ وہ اتنا تڑتڑ کر جائے گی۔ ایک ناگوار نظر اس پہ ڈال کر ٹی وی کی آواز بلند کر دی۔ تو فرح خان جو بڑی معصومیت سے جواب دے کر مزے دار چائے کی چُسکیاں لے رہی تھی دھیمے سے مسکرا دی۔

:::::::::::::

ماہ نور یہ دادی نے دیا ہے۔ یہ پہن لو۔۔۔ وہ اس وقت پستہ اور گولڈن رنگ شرارے میں سر پہ گولڈن رنگ ہی دوپٹے کو بیوٹیشن سے سیٹ کروانے میں مصروف تھی۔ جب مریم آپی اندر آئیں۔ ان کے ہاتھ میں ایک جیولری باکس تھا۔

ماشاءاللہ بھابی صاحبہ آپ تو غضب ڈھا رہی ھیں۔ مریم آپی نے سچ میں اس کی تعاریف دل سے کی تھی۔ کہ وہ اپنے تمام ملکوتی حُسن کے ساتھ۔ آسمان سے اُتری پریوں کی شہزادی لگ رہی تھی۔ اُنہوں نے بڑھ کر اس کے گال پہ بوسہ لیا۔ تو ماہ نور مسکرا دی۔

تم جانتی ہو۔ تمہیں دیکھنے کے بعد مجھے یقین ہے۔ کہ ذریت کسی دوسری عورت کو دیکھنے کی کبھی غلطی نہیں کرے گا۔ بس ہمت سے کام لینا۔ ان کے لہجے میں ہمیشہ کی طرح کی محبت اور بڑی بہنوں والا مان تھا۔ ماہ نور نے سر ہلا دیا۔

آپی آپ کی بھابی جتنی صورت کی خوبصورت ہے۔اُتنی ہی سیرت کی بھی خوبصورت ہے۔ذریت بھائی سچ میں بہت خوش قسمت ہیں۔۔۔مریم آپی جو بیوٹیشن کو دیکھ کر بات سُنتے مسکرا رہی تھیں۔اختتام پہ ماہ نور کو دیکھا تھا۔

اوف اللہ اتنی تعاریفیں۔۔۔اب بس بھی کرو آپ لوگ۔شرما کر کہنے پہ۔جہاں مریم آپی حیران ہوئی تھیں۔وہیں بیوٹیشن بھی ہنس دی تھی۔

توبہ ماہاتم شرما رہی ہو۔اُنہیں یقین نہیں آیا تھا۔کوئی اتنا معصوم کیسے ہو سکتا ہے۔

آپ لوگ ایسی باتیں کرو گی۔تو کوئی بھی شرما جائے گی۔اس نے ایک بار پھر معصومیت سے کہا۔تو مریم آپی بھی مسکرا دیں۔

اچھا باقی باتیں بعد میں۔۔۔پہلے یہ پہن کے دیکھاؤ۔ڈبہ کھول کر اُنہوں نے سامنے کیا تھا۔وہ ایک خوبصورت سا بھاری گولڈ کا سیٹ تھا۔جس کا ڈیزائین نہایت باریک اور روائیتی تھا۔ماہ نور کو وہ بہت پسند آیا تھا۔

واہ آپی دادی جان کی پسند تو بہت کمال ہے۔وہ سراہے بغیر نہ رہ سکی۔

ہاں تمہیں دیکھ کر ہم سب کو بھی یقین ہو چکا ہے۔مریم آپی نے لاڈ سے ہار اس کے گلے میں ڈالتے ہوئے کہا تو وہ محض مسکرا دی۔

بہت اچھا لگ رہا ہے۔ماہ نور اللہ آپ کی زندگی میں آپ کی قسمت میں کرے۔آمین۔۔۔اوکے آپی جی۔اب میں جاتی ہوں۔امی کے ساتھ گھر سے آؤں گی۔اپنا سامان اُٹھاتے بیوٹیشن تیز تیز بولتی کہہ رہی تھی۔۔اور پھر مریم آپی کے سر ہلاتے ہی باہر بھی نکل گئی۔

ماہ نور ذریت کا موڈ صبح کچھ آف تھا۔وہ جب گھر آیا ماتھے پہ دس بل ساتھ لایا تھا۔اس کا ہاتھ تھامے وہ کہہ رہی تھیں۔ماہ نور سُنتی رہی۔

کیوں وجہ پوچھی آپ نے؟

ارے میں وہی تو پاچھنے لگی تھی۔ تم سے کہ تمہیں بتایا اس نے کچھ۔ دادی سے کہہ رہا تھا۔ کہ کیا لڑکی چنی ہے میرے لئے گھمنڈی اور پتہ نہیں کیا کیا۔ مسکراہٹ دباتے وہ کہہ رہی تھیں۔ ماہ نور کا منہ کھول گیا۔

توبہ توبہ۔۔۔ آپی آپ کا بھائی کتنا جھوٹا ہے۔ میں کب گھمنڈی ہوں۔ گھمنڈی تو وہ خود ہیں۔

اچھا۔ جب میں کچھ بول دوں تو۔ تمہارا شوہر بن جاتا ہے۔ اور جب تم کچھ بولو۔ تو میرا بھائی۔۔۔ اُنہیں مزہ آ رہا تھا۔ ذریت نے کچھ بھی ایسا دادی سے نہیں بولو تھا۔ وہ جانبوجھ کر ماہ نور سے جھوٹ بول رہی تھیں۔ تاکہ ماہ نور کے دل ہیں یہ بات نہ آئے کہ۔ اس نے ایک غلط انسان سے شادی کی۔ جس کو اس کی پرواہی نہیں تھی۔

ہاں تو؟ آپ کا بھائی ہے۔ ہی اس قابل۔ ناک سے مکھی اُڑا کر کہا۔ تو وہ مسکرادیں۔

اچھا بات سُنو۔۔۔ باہر جب تمہیں لے جایا جائے گا ناں۔ تو وہاں آذر کی امی اور اس کی بہن بھی ہوں گی۔ ان سے ضرور ملنا۔ اور کھڑے ہو کر ملنا۔ وہ ذریت کو اور مجھے بہت چاہتی ہیں بالکل اپنی بیٹی کی طرح۔ ان کی تاکید پہ اس نے سمجھ کر سر ہلایا۔ تو وہ اس کا گال تھپ تھپاتی کمرے سے نکل گئی تھیں۔

ماہ نور نے ایک نظر خالی دروزے کی راہ داری کو دیکھا۔ اور پھر مسکراتی شیشے کے سامنے پڑے سٹول پہ بیٹھ گئی۔ اور شیشیے میں اپنا آپ دیکھنے لگی۔

کہتی تو آپی سچ ہی ہیں۔ مسکرا کر شیشے میں دیکھتے ہونٹ کے قریب سے سرخ لپسٹک کو درست کرتے اس نے دل میں سوچا تھا۔ اور اس سے پہلے کہ وہ اپنی خوبصورتی کی چند قصے اور پڑھتی۔ کوئی بہت تیزی سے کمرے کا دروازہ کھولتا اندر داخل ہوا تھا۔ ماہ نور نے نووارد کو شیشے کے عکس میں دیکھ لیا تھا۔ مسکرا کر مڑی۔

ذریت جو ماہ نور کو کچھ بولنے والا تھا۔ اسے دیکھ کر ذرا دیر کو ٹھٹکا۔ مگر پھر اپنے آپ کو سنبھال کر سیدھا اس کے سامنے جا کھڑا ہوا تھا۔ ماہ نور بھی سٹول سے اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

تم ابھی مریم آپی سے میری چغلیاں کر رہی تھی ناں۔ ذریت کی بات پہ ماہ نور یک دم گڑ بڑائی تھی

چغلیاں؟ کیسی چغلیاں۔۔۔اور میں کیوں کرنے لگی۔آپ کی چغلیاں ں ں۔اس نے چغلیاں لفظ گھسیٹ کر لمبا کر دیا تھا۔

میری بات سُنو۔۔۔اپنی زبان کو کنڑول میں رکھو گی۔تو تمہارا ہی مستقبل محفوظ ہو گا۔ورنہ۔۔۔

ورنہ؟اس نے ابرو اُٹھا کر ایسے دیکھا۔گویا کہہ رہی ہو۔جاؤ جو کرنا ہے کر لو۔

ورنہ یہ مس ماہ نور ابتسام۔کہ مجھے تمہں گھر بھیجنے کے لئے کسی ویزہ کے دفتر نہیں جانا پڑے گا۔۔۔یعنی اپنے چھوٹے سے ذہن میں یہ بات بیٹھا لو۔کہ مجھے صرف تمہاری ایک غلطی کی ضرورت ہے۔پھر آگے گھر تک کا رستہ تم باآسانی تیہہ کر لو گی۔مسکرا اس نے اس کے دائیں کو گال تھپ تھپا کر کہا۔تو ماہ نور بھی جواب میں مسکرا دی۔وہ دونوں اس وقت کمرے کے وسط میں ایک دوسر کے مقابل کھڑے تھے۔

پہلی بات اپنی تصیح کر لیجئے میں اب مس ماہ نور ابتسام نہیں مسز ماہ نور ذریت حسن ہوں۔دوسری بات آپ کی اس ساری لفاظی سے صاف ظاہر ہوتا ہے۔کہ اس گھر میں کوئی ایسی شخصیت ضرور ہے۔جس کے بول بالے کی وجہ سے۔آپ سرِ عام غنڈہ گردی نہیں دکھا سکتے۔اور یقیناًوہ المعروف شخصیت میرے حق میں ہوں گیں۔یعنی کہ میری اور آپ کی۔۔۔ہم سب کی پیاری دادی جان۔ویسے کی دُلہن تھی۔وہ مگر زبان ایسے چلا رہی تھی۔کہ اسے دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا۔کہ شرماہٹ تو اس کے قریب سے بھی نہ گزری ہو گی۔ذریت کا دل چاہا اس کو پکڑ کر کمرے سے باہر نکال دے۔مگر افسوس صد افسوس کے وہ جو بھی بول

رہی تھی۔بالکل سچ تھا۔اور یہ بھی سچ تھا۔کہ قدرت نے اس جیسے ٹیڑھے انسان کو کیا چُن کر بیوی دی تھی۔جو اس کی بہن اور دادی کی لاڈلی تھی۔وہ گہرا سانس لے کر رہ گیا۔ابھی کچھ عرصہ اسے برداشت کرنے کے سوا اور کوئی چارا نہ تھا۔

مسز یا مس جو بھی تم کہو۔۔۔میری بات دھیان سے سُنو(ماہ نور نے دائیاں کان سامنے کر لیا تھا۔)اس گھر کو اپنا گھر سمجھ کر یہاں رہنے کی بے وقوفی ہر گز مت کرنا۔واپسی میں تکلیف تمہیں ہی زیادہ ہو گی۔دوسری بات دادی اور آپی سے کمرے کی کوئی بھی بات ڈسکس کرنے کی غلطی سے بھی غلطی مت کرنا۔ورنہ میں کسی کی بھی پرواکئے بغیر تمہیں یہاں سے چلتا کر دوں گا۔اور۔۔۔ابھی وہ کچھ اور بھی بولنے والا تھا۔کہ ماہ نور بول اُٹھی۔

For more visit (exponovels.com)

آپ ایک کام کریں ایک پرچہ تیار کر کے مجھے دے دیں۔ کہ مجھے کیا کرنا ہے۔اور کیا نئیں۔ مسکرا کر اس نے اس کے کندھے سے اندیکھی دھول صاف کرتے کہا تھا۔ لہجے میں مسکراہٹ تھی۔ذریت اس کی لگام کھینچنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ جس کا وہ خوب فائدہ اُٹھا رہی تھی۔

ایک اور بات مجھے زیادہ بولنے والی عورتوں سے سخت چڑھ ہے۔ سو اپنی اس زبان کو بھی ذرا قابو میں رکھا کرو۔اس نے کہا تو بہت ٹھہر ٹھہر کر تھا۔ مگر لہجہ صاف دل کی حالتِ زار بیان کر رہا تھا۔

ماہ نور کھل کھلا کر ہنسی تھی۔۔۔اس کے ہنسنے کا انداز بہت دلفریب معلوم ہوا تھا۔ذریت گھور کر رہ گیا۔

جب مجھے فرق نہیں پڑتا۔ کہ آپ کیسے ہو۔ تو آپ بھی مجھے میرے حال پہ چھوڑ دوناں۔ وہ جانبوجھ کر اب اسے تنگ کر رہی تھی۔ یہ مریم آپی کی بات کا اثر تھا۔

تمہیں ایک دن میں ہی یہ خوش فہمی کیوں ہونے لگی۔ کہ مجھے تمہاری پرواہے۔اسے اس کی دماغی حالت پہ شک سا گزرا تھا۔

ماہ نور مسکرادی۔اور مڑ کر بیڈ پہ جا بیٹھی۔ اُنہیں معلوم بھی نہیں ہوا تھا۔اور دونوں ایک دوسرے سے چُھپن چُھپائی کھیلنے لگے تھے۔

ذریت نے ایک نظر اس خود پسند لڑکی کو دیکھا۔اور پھر خود کو شیشے میں دیکھنے لگا۔اس وقت وہ سیاہ کوٹ سوٹ میں ملبوس تھا۔اور بالوں کو جیل سے سیٹ کر کے ایک سائڈ پہ لا کئے۔ وہ قدرِ بُردبار اور با اعتماد لگ رہا تھا۔اس نے نیک ٹائی کو ذرا سیٹ کیا۔ شیشے میں سے ماہ نور کی پُشت کو دیکھا۔اور پھر ہاتھ میں پکڑے فون کو چارجنگ پہ لگانے کے لئے سوئچ بورڈ کی جانب بڑھ گیا۔ماہ نور بھی اپنے فون پہ بابر بھائی سے میسجنگ میں مصروف تھی۔

::::::::::::

ماہا میری گڑیا میرے ساتھ جائے گی۔ بابا اس کے سامنے کھڑے اس سے پوچھ رہے تھے۔ ماہ نور کی نظریں ان کے ہاتھ میں پکڑے سفید رومال پہ تھیں۔ اس نے رومال کو دیکھتے آنکھیں پٹپٹا کر سر نفی میں ہلایا۔ تو ان کے چہرے پہ مایوسی اور افسردگی کے سائے لہرانے لگے۔

بابا آپ کہاں جا رہے ہیں؟ ان کے چہرے پہ مایوسی دیکھ کر اسے دُکھ ہوا تھا۔

میں۔۔۔ میں اُدھر پہاڑوں میں جا رہاں ہوں۔ ادھر ایک جھرنا بہتا ہے۔ اس جھرنے کے پاس ایک جھیل ہے۔ جس میں بطخیں تیرتی ہیں۔ وہ دونوں اس وقت کسی گھر کی چھت پہ کھڑے تھے۔ اور اسی چھت سے بہت دور پہاڑ تھے۔ جس کی طرف ان کا اشارہ تھا۔

ماہ نور سہم کر انہیں دیکھنے لگی۔ بابا آپ مجھے چھوڑ کر وہاں چلے جائیں گے؟ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

آپ وہاں کیوں جا رہے ہیں۔ وہاں اچھی بطخیں نہیں ہیں۔ وہ ان کے دونوں ہاتھوں کو پکڑ چکی تھی۔ وہ انہیں وہاں جانے نہیں دینا چاہتی تھی۔ وہ ان کو کھونے سے ڈرتی تھی شائد۔

مگر جواب میں بابا سر نفی میں ہلاتے اسے اس سے اپنے ہاتھ چھڑوا رہے تھے۔ ماہ نور ان کے قدموں میں بیٹھ گئی۔ اور ان قمیض کے دامن کو مُٹھی میں دبا لیا۔

بابا اگر آپ چلے گئے۔ تو آپ کی ماہا آپ کے بغیر کیا کرے گی۔ میں۔۔۔ میں تو مر جاؤں گی بابا۔ وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

نہیں میری جان ضد نہیں کرتے اور بابا کی گڑیا بہت بہادر ہے۔ وہ رہ لے گی بابا کے بغیر۔۔۔ کہیں بہت پیچھے بابا کے بچپن میں کہے گئے الفاظ پس منظر میں چل رہے تھے۔ وہ محض آواز سُن سکتی تھی۔ ماہ نور رونے لگی۔ وہ انہیں جانے نہیں دے رہی تھی۔ اور بابا اس سے ہاتھ چھڑوا رہے تھے۔ اور مڑ مڑ کر دور پہاڑ کی جانب بھی دیکھ رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ تھک کر ان کا ہاتھ چھوڑتی۔ اس کی آنکھ کھل گئی۔

For more visit (exponovels.com)

ایک جھٹکے سے ہلق سے سانس کھینچتے وہ اُٹھ بیٹھی۔۔۔ کمرے میں نیم تاریک تھی۔ اور اس نیم تاریکی میں بھی اس کا پسینے اور آنسوں سے تر چہرہ دیکھا جا سکتا تھا۔ چہرے پہ رقم خوف بھی آسانی سے پڑھا جا سکتا تھا۔

اس نے ہوش کی دنیا میں یقین پانے کے لئے تر چہرے اور گردن پہ ہاتھ پھیرا۔ اور پھر قریب ہی دھرے پانی کے جگ سے پانی گلاس میں انڈیل کر پینے لگی۔ اس کا گلا خشک ہوتا۔ کانٹا بن چکا معلوم ہوتا تھا۔ پانی پینے سے گلا ذرا کھولا تو اس نے کمرے میں ایک تائرانہ نظر ڈالی تھی۔ کمرے میں نیم تاریکی اس کے عصاب کو شل کر رہی تھی۔ اس نے اُٹھ کر لائٹ جلا دی، اور پھر واپس اپنی جگہ پہ بیٹھی آنکھیں موند کر بیڈ سے سر ٹکا گئی۔ اس کا جسم ہلکی کپکپی کا شکار تھا۔ وہ بابا سے بے انتہا محبت کرتی تھی۔۔۔ اور اس کا دماغ اسے بتاتا تھا۔ کہ یہ خواب کسی نہ کسی طرح سچ ہو جانے والا ہے۔ مگر دل کہتا تھا۔ کہ نہیں ایسا کچھ نہیں ہو گا۔ حوصلہ رکھو، یقین رکھو۔

ذریت رات سے کمرے میں نہیں تھا۔ وہ روز رات میں کمرے سے غائب ہو جاتا تھا۔ ماہ نور نے ایک نظر پھر سے کمرے میں ارد گرد دیکھا۔ اور ابھی واپس لیٹنے کا سوچ ہی رہی تھی۔ جب وہ کمرے میں داخل ہوا تھا۔ سر جُھکائے وہ کچھ سوچتا اندر آیا تھا، مگر پھر زرد چہرے کے ساتھ سامنے بیٹھی ماہ نور کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ بیس منٹ پہلے جب اس نے دیکھا۔ تب وہ سو رہی تھی۔ اور اب وہ واپس آیا تو وہ پریشان سی بیٹھی جاگ رہی تھی۔

ماہ نور نے اس کے ہاتھ مین فون دیکھا۔ اور پھر سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھتی بیڈ سے اُٹھ کر اس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

میرے بابا؟ اس کے منہ سے جو لفظ نکلا تھا۔ وہ ذریت کے لئے غیر یقینی تھا۔ وہ اسے بتانے آیا تھا۔ کہ اس کے والد صاحب ہسپتال میں ہیں۔ مگر اس سے پہلے ہی وہ کہہ دیا تھا۔ ذریت نے نگاہ چورائی۔

ماہ نور انکل ہسپتال میں ہیں۔ انہیں مائنر ہارٹ اٹیک آیا ہے۔ اس نے ابرار بھائی کے کہنے پہ لفظ مائنز بولا تھا۔ ماہ نور لڑکھ گئی۔ اگر تبھی ذریت اسے سہارا نہ دیتا۔ تو شائد وہ گر جاتے۔ ذریت نے اسے قریب ہی بیڈ کی پائنتی پہ بیٹھا دیا۔

میرے با۔۔۔ بابااس کی آنکھون میں وحشت وبے یقینی تھی۔ ذریت ان آنکھوں کے جزبات کو سمجھ سکتا تھا۔ اسے یاد تھا۔ جب اسے آذر کی موت کا پتہ چلا تھا۔ وہ بے یقین ہی رہا تھا۔

یقین اور بے یقینی کے درمیان جھولنے والا لمحہ سب سے زیادہ تکلیف دے اور صبر آزمہ ہوتا ہے۔ وہ سمجھ سکتا تھا۔

وہ ٹھیک ہیں۔۔۔ ڈاکٹرز انہیں جلد گھر بھیج دیں گے۔ وہ سب کچھ بول رہا تھا۔ جو ابرار نے اسے بولنے کے لئے کہا تھا۔

ماہ نور نے سر نفی میں ہلایا۔ میں جانتی ہوں۔ وہ ٹھیک نہیں ہیں۔ پیچھلی بار جب اُن کا ایکسڈنٹ ہوا تھا۔ تب بھی سب نے میرے سے چُھپایا تھا۔ مگر مجھے پتہ تھا۔۔۔ اب بھی مجھے پتہ ہے۔ کہ وہ ٹھیک نہیں ہیں۔ مگر میں آپ سے یہ نہیں بولوں گی۔ کہ یہ جھوٹ ہے۔ کیونکہ میں اس جھوٹ پہ یقین کر لینا چاہتی ہوں۔ وہ بول رہی تھی۔ اور بھل بھل کرتے اس کے آنسو گالوں کو بھگوتے اس کی قمیض کے دامن اور گلے میں جزب ہوتے جارہے تھے۔ ذریت نے گہرا سانس لیا۔ چلو آؤ چلیں۔ ان سے ملنے چلتے ہیں۔ پھر تمہیں خود ہی یقین آجائے گا۔ وہ اسے یہ یقین پتہ نہیں کیوں دلانے چلا تھا۔ کہ وہ درد سے بھاگ رہی ہے۔ وہ سہے اور خود کو مضبوط بنائے۔

خوف سے اس کے ہونٹ کپکپارہے تھے۔ میں۔۔۔ میں انہیں نہیں جانے دوں گی۔ وہ بطخیں اچھی نہیں ہیں۔ وہ جو کہہ رہی تھی۔ ذریت اس خواب سے ناواقف تھا۔ البتہ وہ اس کے اندر کے جزبات کو ضرور سمجھ رہا تھا۔ وہ اس سب سے گزر چکا تھا۔ وہ تیزی سے سر ہلاتا واپس مڑ گیا۔ وہ مریم آپی کو لینے گیا تھا۔ انہوں نے ہی اسے وہاں لے جانے کو بولا تھا۔

وہ متواتر رونے کے ساتھ نفی میں سر ہلانے میں مصروف تھی۔ جب مریم آپی اس کے ساتھ آئیں۔ ساتھ ہی دادی جان بھی تھیں۔

آپی میرے بابا۔۔۔ انہیں دیکھتے ہی ہونٹ لٹکا کر آنسوں کو بہاتے اس نے کہا۔ تو مریم آپی بے اختیار اس کی جانب بڑھ گئیں۔ دادی پریشانی سے اسے دیکھتیں سامنے صوفے پہ بیٹھ رہی تھیں۔

ماہ نور۔۔۔ رومت۔ اللہ پاک انکل کو صحت دیں۔ وہ ٹھیک ہیں۔ تم رو کیوں رہی ہو۔ ان کے لہجے میں درد تھا۔ ماہ نور نے نفی میں سر ہلایا۔

For more visit (exponovels.com)

نہیں ! نہیں ہیں وہ ٹھیک۔

مریم آپی نے اس کا سر اپنے کندھے سے ٹکا لیا۔ رومت۔۔۔ ہم ابھی ان سے ملنے جاتے ہیں۔

ماہ نور میری بچی رومت۔ وہ ٹھیک ہو جائیں گے۔ شاباش میرا بہادر بچہ روتے نہیں۔ دادی کا پُر شفیق سا لہجہ تھا۔ مگر اس وقت وہ بھی اثر نہیں کر رہا تھا۔

دادی میرے بابا میرے خواب میں آئے تھے۔ وہ۔۔۔ وہ مجھے چھوڑ کر جا رہے تھے۔ وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ مریم آپی کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ ماہا میری جان رومت۔ میرا یقین کرو۔ وہ ٹھیک ہیں۔ آؤ ہم ان کے پاس چلتے ہیں۔ ذریت گاڑی نکال چکا تھا۔ اور اب ہارن بجا رہا تھا۔

جاؤ میرا بچہ خیر سے جاؤ۔ میں صبح آؤں گی۔ اور اب رونا مت۔ دادی دعا کریں گی۔ وہ محبت سے کہہ رہی تھیں۔ وہ سر ہلاتی اُٹھ گئی۔ اور کندھے پہ جھولتے دوپٹے سے ہی حجاب باندھنے لگی۔ مریم آپی بھی اُٹھ گئیں تھیں۔

:::::::::::

ذریت اسفند اکرام اس لڑکے کو ڈھونڈ رہا ہے۔ اکمل اس کے سامنے بیٹھا کوفی سے شغف اُٹھاتا کہہ رہا تھا۔ ذریت کی نظریں کہیں دور تھیں۔ اس نے اکمل کی بات نہیں سُنی۔

ذریت۔۔۔ اس نے اسے کندے سے پکڑ کر ہلایا۔ تو وہ حوش کی دنیا میں لوٹا۔

کیا۔۔؟

ہاں ڈھونڈنے دو۔ مجھے اس سے فرق نہیں پڑتا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ساتھ ہی اس کی نظریں سامنے لگے بڑے سے درخت پہ تھیں۔

ذریت تم کل رات سے جاگ رہے ہو۔ بھا بھی بھی ادھر ہی ہیں۔ میرا مشورہ مانو تو انہیں لے کر گھر چلے جاؤ۔ شام میں پھر آجانا۔ وہ کل رات سے ہسپتال میں تھا۔ اور مسلسل جاگنے کی وجہ سے خاصا ڈسٹرب تھا۔

For more visit (exponovels.com)

ہاں میرا بھی یہی خیال ہے۔ سمجھ کر اس نے سر ہلایا۔ تو اکمل مسکرا دیا۔

ویسے اگر تم بُرا نہ مانو تو ایک سوال پوچھوں؟

ہم م کافی کو گھونٹ بھرتے اس نے اجازت دی تھی۔

تم نتاشا کے زیادہ قریب نہیں ہو رہے۔ میرا مطلب ہے۔ کہ۔۔۔ تم جو چاہتے تھے۔ اس سے تم ہٹتے جا رہے ہو۔

ذریت نے جواب میں ایک گہری سانس لی۔ اور پھر جیب سے والٹ نکال لیا۔۔۔ پتہ نہیں یار۔ میری زندگی میں سب اپلٹ چل رہا ہے۔ مجھے نہیں پتہ میرا انجام کیا ہو گا۔ اس نے جس لہجے میں کہا تھا۔ اس بات نے اکمل کو چونکا دیا تھا۔ وہ سر ہلا کر رہ گیا۔

ماہ نور جاؤ تم گھر چلی جاؤ۔۔۔ وہ بینچ پہ بیٹھی۔۔۔ تسبیح کرتی مسلسل ایمر جنسی روم کے باہر کھڑی لال بتی کو دیکھ رہی تھی۔ جب ابرار بھائی آئے۔

نہیں میں نہیں جاؤں گی۔ وہ ضد پہ اڑی تھی۔ تبھی ذریت اور اکمل بھی آ گئے۔

ذریت تم سمجھاؤ اسے۔۔۔ بات ہی نہیں سن رہی۔ وہ اب ذریت کو کہہ رہے تھے۔ ذریت نے ماہ نور کو دیکھا تھا۔ جو مسلسل بس ایک جانب دیکھ رہی تھی۔ اس کا چہرا میرون رنگ حجاب میں زرد لگتا تھا۔

نہیں بھائی میں بابا کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی۔ وہ ناراض ہوں گے۔ اور افسردہ بھی۔ سر ہلاتے اس نے ذریت کے کہنے سے پہلے ہی کہہ دیا تھا۔ ذریت اس کے پاس کی کرسی پہ بیٹھ گیا۔ بائیں جانب بابر بیٹھا تھا۔ وہ چہرے سے خاصا تھکا ہوا لگتا تھا۔

ماہ نور ضدمت کرو۔ میں یہں رہوں گا۔ اور شام میں تمہیں بھی ساتھ لے آؤں گا۔ چلو اب گھر چلیں۔ مریم آپی کی بھی کال آ چکی ہے۔ اس نے نرمی سے کہا۔ تو ماہ نور کو جیسے جھٹکا لگا۔ اس نے عجیب نظروں سے ذریت کو دیکھا تھا۔ جس کے بعد اس پہ گھڑوں پانی پڑا۔

میں۔۔۔ نہیں۔۔۔ جاؤں گی۔اس نے رک رک کر مگر رعب سے کہا۔ توذریت ابرار بھائی کو دیکھ کر رہ گیا۔ ابرار بھائی دیکھ رہے تھے۔ وہ مسلسل ایک کی پوزیشن میں بیٹھی تھی۔اور خاصی زرد ہو رہی تھی۔

ماہ نورا گر تم گھر نہ گئی۔ تو میں بابا کو تمہاری شکائت لگاؤں گا۔ وہ تم سے ناراض ہو جائیں گے۔ بابر نے اب کی بار انگلی اُٹھ کر تاکید کرنے کے انداز میں کہا۔ توباوجود ٹینشن کے ابرار مسکرا دیا۔اور ماہ نور کی آنکھون میں لبالب آنسو بھر گئے۔۔ بے دردی سے صاف کرتی تیزی سے وہاں سے اُٹھ گئی۔

چلیں۔۔۔آنکھوں میں غم کی نمی لئے اس نے ذریت کو دیکھے بغیر کہا تھا۔ ابرار نے بڑھ کر اس کے سر پہ ہاتھ رکھ کر اسے رخصت کیا تھا۔ماہ نور روتی ذریت کے پہلو میں چلتی آ گئی۔ اکمل وہیں رُکا تھا۔ ذریت نے اسے خیال رکھنے کو بولا تھا۔

ذریت اس کے ساتھ قدم کے ساتھ قدم ملا کر چل رہا تھا۔ مگر اس وقت وہ سوچ کسی اور کے بارے میں رہا تھا۔

:::::::::::

کمرے کی نیم تاریکی میں ایک سایہ سا نظر آتا شخص اس وقت رائٹنگ ٹیبل پہ سر ٹکائے آنکھوں کو بند کئے مسلسل سوچنے میں مصروف تھا۔اس کی آنکھیں نم تھیں۔

ابرار کا دل پسیج رہا تھا۔ وہ ڈیڈ کی لمحہ بہ لمحہ گرتی حالت سے واقف تھا۔ان کا دل محض ۲۰ فیصد کام کر رہا تھا۔ان کے دونوں پاؤں سوج چکے تھے۔ جنہیں اُنہوں نے چھپائے رکھا تھا۔ کہ ماہ نور کی شادی میں رکاوٹ نہ پیدا ہو جائے۔اب شادی ہوئی۔ تو گویا زندگی کا پہیہ بھی لڑکھنے لگا۔

ابرار نے سر اُٹھا کر قریب ہی پڑی فائل اُٹھائی اور ورق گردانی کرنے لگا۔ بابا کی رپورٹ میں ہر چیز واضح تھی۔ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔البتہ ڈکٹرز پُر اُمید تھے۔

اس نے اوراق الٹ پلٹ کرنے کے بعد اُنہیں ٹیبل کی دراز میں رکھنے کی غرض سے دراز کھولا۔ تو اس کا ہاتھ جیسے ٹھٹکا ہو۔

ایک ہاتھ جتنا موبائل فون جس کی سیاہ سکرین بھی نیم اندھیرے میں نظر آرہی تھی۔اس کی توجہ پا گئی تھی۔اس نے فائل واپس میز پہ رکھی۔اور فون اُٹھ کر دیکھنے لگا۔فون کی سکرین اُپری بٹن کے کچھ لمحے کے دبائے جانے سے چمکنے لگی۔سکرین کے آن ہوتے ہی،اس پہ کمپنی کا نام جلی حروف میں چمکنے لگا تھا۔اس نے سکرین پہ ہاتھ پھیر کر انجانا سا لمس محسوس کرنے کی کوشش کی۔اور پھر شرمندہ سا ہوتا مسکرا کر سر جھٹک گیا۔اس لڑکی کی یاد اس کے سہمے ہوئے کو خوبصورت سی میٹھی سی بے چینی عطا کر گئی تھی۔

فرح خان ایک ایسا کردار تھا ابرار ابتسام کی زندگی کا جس کو سوچنے کے لئے اسے زیادہ سوچنا نہیں پڑا تھا۔غیر ارادی طور پہ وہ اپنے آپ کو دیکھ کر سوچنے لگا تھا۔کہ شائد وہ سچ میں موٹا ہوتا جا رہا ہے۔اس نے اپنی آواز کو بھی نوٹس کیا تھا۔مگر وہ اتنی بدھی نہیں تھی۔اسے حقیقتاً دکھ ہوا تھا۔وہ بھلا کہاں سے موٹا تھا۔وہ تو بڑا ڈائٹ اور ہلتھ کونشئیس بندہ تھا۔ایک انجان لڑکی کی ایسی رائے نے اسے سوچنے پہ مجبور کیا تھا۔یا پھر اس آواز میں ہی ایسی سادگی، معصومیت اور نرماہٹ تھی۔کہ اسے ہر لمحہ وہ آواز اپنے کانوں میں رس گھولتی محسوس ہوتی۔اس نے تب ہرگز محسوس نہیں کیا تھا۔جب ماہ نور ہر روز اسے فارغ دیکھ کر اپنے اور فرح کے قصے خوب جوش سے سُناتی تھی۔وہ دلچسپی لیتا تھا۔اسے مزہ آتا تھا۔ایسی لڑکی کے بارے میں سُننے میں جو سچ میں بہت معصوم تھی۔سادہ دل تھی۔اور بہت پُر خلوص بھی۔اسے سہی محبت فرح خان سے تب ہوئی تھی۔جب اسے دیکھنے کا لمحہ قریب تھا۔وہ بے چین بھی تھا،خوفزدہ بھی ہوا تھا۔اس کا دل چاہ رہا تھا۔وہ کمرے سے نکل جائے۔جتنی اسے دیکھنے کی بے چینی ہوئی تھی۔اس سے کہیں زیادہ وہاں سے اسے بغیر دیکھے چلے جانے کی خواہش تھی۔وہ خود کو مزید پرکھنا چاہتا تھا۔دیکھنا چاہتا تھا۔اپنا امتحان لینا چاہتا تھا۔مگر پھر نہ جانے کیا سوچا کہ وہ جا ہی نہ سکا۔

سکرین کے جگ مگ کرتے چہرے کو دیکھتے اس نے کچ لمحے کے لئے کچھ سوچا۔۔۔اور پھر فون کے مختلف فیچرز دیکھنے لگا۔اس نے سب سے پہلے گیلکری کھالی تھی۔جس میں ایک سوائے پھول کے اور کوئی تصویر نہ تھی۔وہ سر جھٹک گیا۔چند لمحوں تک یوں ہی فون کو کھنگالتا رہا۔اور پھر آخر میں نوٹ پیڈ کھول کر بیٹھ گیا۔نوٹ پیڈ وہ کھول چکا تھا۔مگر

ذہن اس وقت اس حالت میں نہ تھا۔ کہ وہ فوری طور پہ کچھ لکھ پاتا۔ سوا یک وصی شاہ کے کچھ اشعار تھے۔ جو ذہن میں ایک جھماکے کے ساتھ آئے تو۔ وہی لکھنے لگا۔ جس میں شاعر کہہ رہا تھا۔ کہ

ہر اک شب مری تازہ عذاب میں گزری

تمہارے بعد تمہارے ہی خواب میں گزری

میں ایک پھول ہوں، وہ مجھ کو رکھ کے بھول گیا

تمام عمر اُسی کی، کتاب میں گزری

شعر لکھ کر اس نے سکرین واپس بند کی۔ فون دراز میں رکھا۔ اور چابی اُٹھاتا کمرے سے نکل گیا۔ بابا کے پاس وہ ہسپتال جا رہا تھا۔

::::::::::::::

لاؤنج کے صوفے پہ بیٹھے بیٹھے ہی نہ جانے اس کی کس لمحے آنکھ لگی تھی۔ جب کسی نے اس کے گھٹنے کو پکڑ کر ہلایا تو آنکھیں کھول کر دیکھنے لگی۔ احمد اپنی خوبصورت گول گول آنکھوں سے اسے دیکھتا ہنس رہا تھا۔ ماہ نور نے مسکرا کر اسے اُٹھایا اور اپنے برابر بٹھالیا۔

میری جان کیا کر رہی ہے۔ دھیمے سے اس سے پوچھتے اس کے پھولے پھولے خوبصورت گال کا بوسہ لیتے اس نے پوچھا۔ تو وہ ہنستا اس کے پشت پہ دھرے بالوں کی چٹیا سے کھیلنے لگا۔۔۔

احمد کیا کر رہے ہو؟ ماہ نور نے اسے اپنی جانب متوجہ کرنے کے لئے اس کے بال بگاڑ کر پوچھا۔ تو شرماتا اس کے بالوں کو چھوڑتا اس کے کندھے سے گال رگڑنے لگا۔

مانی۔۔۔ آپ تانام تاہے؟ (ممانی آپ کا نام کیا ہے؟) وہ اپنی توتلی زبان میں پوچھ رہا تھا۔ ماہ نور مسکرادی۔ اور پیار سے اس کے گال کا ایک بار پھر سے بوسہ لیا۔

For more visit (exponovels.com)

میرا نام ماہ نور ہے۔اور آپ کا؟

میرا امد (احمد)۔۔۔اس کا نام لیتے وہ پھر سے مسکرایا تھا۔وہ بات بے بات مسکرانے والا بچہ تھا۔

آپ ہنستے بہت کیوٹ ہو احمد۔اس نے کہا تو احمد نے معصومیت سے آنکھیں پٹپٹا کر اسے دیکھا۔اور ہونٹوں پہ زبان پھیرتا گویا ہوا تھا۔کا یوت کیا وتا اے۔(کیوٹ کیا ہوتا ہے۔)اس کے سر کو ہلانے اور بار بار ہونٹوں پہ زبان پھیرنے کے بعد پوچھے گئے سوال پہ ماہ نور مسکرائی تھی۔

کیوٹ احمد ہوتا ہے۔

احمد کے ہاتھ کی غلابی غلابی انگلیوں سے کھیلتے اس نے کہا تو وہ مسکرا دیا۔اسے صرف اپنا نام سمجھ آیا تھا۔

احمد نے پانی پینا ہے؟ماہ نور اس کو بار بار ہونٹوں پہ زبان پھیرتے دیکھ کر پوچھا۔تو وہ مسکرا اس کے کندھے میں منہ چھپاتا، سر ہلانے لگا۔ماہ نور مسکرا دی۔وہ اس سے پانی مانگنے آیا تھا شائد۔

اچھا میں ابھی لاتی ہوں۔جانائیں۔۔۔اسے تاکید کرتے اس نے کہا۔اور پھر کیچن کی طرف بڑھ گئی۔کل سارے مہمان جا چکے تھے۔ولیمے کے بعد ہی سب چلے گئے تھے۔

باجی آپ کو کچھ چاہئے؟اسے اندر آتا دیکھ کر ظفر نے پوچھا تھا۔وہ سر ہلا کر فریج سے پانی کی بوتل نکال کر اور شیلف سے گلاس اُٹھائے واپس باہر آ گئی۔

لاؤنج میں ذریت احمد سے پاس بیٹھا تھا۔اور اس کے گال کھینچ رہا تھا۔جس پہ احمد نالاں نظر آتا تھا۔

ماہ نور کو دیکھ کر احمد کے چہرے پہ شرمیلی سی مسکراہٹ آ گئی۔اور ماہ نور کے پانی پلانے پہ پانی پینے لگا۔وہ رک رک کر پیتا تھا۔اور گھونٹ اتنے بڑے لیتا۔کہ پانی ہونٹوں سے باہر نکل آتا۔ماہ نور کو وہ بچہ بہت پیارا لگتا تھا۔اسے وہ اپنا بچپن لگتا۔وہ پیار سے اُسے دیکھتی رہی۔

شام میں تم ہسپتال جاؤ گی۔ فون پہ میسج کی بجتی گھنٹی دیکھ کر اور میسج پڑھتے اس نے پوچھا تھا۔ ماہ نور نے چونک کر اُسے دیکھا۔ اور سر اثبات میں ہلا دیا۔

ڈرائیور کے ساتھ چلی جانا۔۔۔ فون پہ ٹائپنگ کرتے وہ کہہ رہا تھا۔ ماہ نور نے کوئی جواب نہیں دیا۔

اس کا جواب نہ پا کر اسنے سر اُٹھا کر اُسے دیکھا تھا۔ وہ قالین کو گھورنے میں مصروف تھی۔

میں تم سے مخاطب ہوں۔

اگر آپ میرے ہزبنڈ ہو کر میری ذمہ داری نہیں اُٹھا سکتے۔ تو مجھے کسی ڈرائیور کی مدد کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ میرے ہاتھ پاؤں سلامت ہیں۔ میں خود ہی چلی جاؤں گی۔ اسے ذریت کی بات ایک آنکھ نہیں بھائی تھی۔ اس لئے بغیر کسی لیحاظ کے کہہ گئی۔

پہلے بھی آپ ہر جگہ انکل اور اپنے بھائیوں کے ساتھ نہیں آتی جاتی ہوں گی۔ میسج ٹائپ کرتے وہ مصروف سا کہہ رہا تھا۔

ماہ نور کے ماتھے پہ بل پڑ گئے۔ میرے باپ بھائی کا ذکر مت کریں۔ آپ ان کا ہرگز بھی مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اور اُنہوں نے میری شادی اس لئے آپ سے کی تھی۔ کہ ان کو لگا تھا۔ کہ آپ ان کی بہن کی ذمہ داری اُٹھا لیں گے۔ روکھائی سے کہہ کر وہ اسے حیران سا چھوڑ کر اُٹھ کر کمرے میں آ گئی۔

عورت کی زبان پتہ نہیں کس مٹی کی بنی ہے۔ بڑبڑا کر اس نے سکرین کو گھورا تھا۔ ایک ادھر سر پہ بیٹھی باتیں سُنا گئی تھی۔ تو دوسری میسج پہ دماغ کا قیمہ بنا رہی تھی۔

وہ سر جھٹک کر احمد کو دیکھنے لگا۔ جو جھک کر پاس پڑی کلرنگ بُک کے صفحے پھاڑ رہا تھا۔

میری جان یہ پھاڑنے کے لئے نہیں پڑھنے کے لئے ہوتے ہیں۔ اس نے اسے اُٹھا کر گود میں بیٹھایا۔ اور پھاڑی ہوئی بُک دیکھنے لگا۔ جبکہ احمد کی جان پہ بن آئی تھی۔ وہ ذریت کی گود میں کم ہی سوار ہوتا تھا۔

::::::::::::

آپ کل سے کہاں ہیں؟

وہ اکمل کے آفس سے ابھی فارغ ہو کر باہر نکلا ہی تھا۔ جب نتاشا کی کال آئی تھی۔ وہ آج سیاہ چیک والے کوٹ سوٹ میں ملبوس تھا۔ جیل میں جکڑے بال ہمیشہ کی طرح اس کے ماتھے سے قدرِ اوپر جمے اچھے لگ رہے تھے۔

آفس میں بزی ہوں۔ کیوں؟ کار کا دروازہ کھولتے ہاتھ میں پکڑی چابی کو انگیشن میں لگاتے۔ اس نے بارعب انداز میں پوچھا تھا۔

میرا دل چاہ رہا ہے۔ آج آپ سے ملنے کو۔ کہیں ملتے ہیں۔ اپنے کمرے کے بیڈ پہ چونکڑی مارے بیٹھی۔۔۔ ناخن چباتی نوین اور زرناب کی نظروں سے ٹپکتی شرارت کو محسوس کرتی۔۔۔ پُر عتمادی سے کہہ رہی تھی۔ بظاہر حکم دے رہی تھی۔

نہیں آج میں بزی ہوں۔۔۔ پھر کبھی۔۔۔ اور کچھ؟ اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور آگے سے تکرار کرتی۔ اس نے جھٹ بات ختم کی۔

نہیں مجھے آج رات میں آپ سے ملنا ہے۔ اور آتے ہوئے۔ اپنا وہ ڈارک براؤن کوٹ سوٹ پہن کر آنا۔ ڈھٹائی سے کہہ کر اس نے فون رکھ دیا۔

واہ کیا بات ہے۔۔۔ کہانی اس موڑ تک آگئی اور ہمیں خبر بھی نہیں ہوئی۔ نوین ستائش سے کہتی۔۔۔ صوفے سے اکھٹے کئے گئے پاؤں سیدھے کر کے بولی تھی۔ ساتھ ہی اس نے سامنے پڑی میز پہ پڑی پلیٹ سے پیسٹری اُٹھالی۔

بس نتاشا جو چاہتی ہے۔ حاصل کر لیتی ہے۔ نزاکت سے صوفے پہ بیٹھ کر لٹکتے پاؤں کو جھلاتے اس نے کہا تھا۔

زرناب مسکرا دی۔

سچ بتاؤ۔۔۔ ایسا کیا کیا کہ وہ تمہاری سُننے لگا۔

For more visit (exponovels.com)

میری جان حُسن ایک ایسا آلہ ہے۔ایک ایسا منتر ہے۔جو بڑے سے بڑے چنگیز خان کو مسحور کر دے۔ حسن اور وہ بھی محبوب کا، کچھ تو ایسا ہے ناں۔ جس پہ لاکھوں کی تعداد میں دیوان لکھے گئے۔چلتے کمرے کی دائیں جانب لگے واڈروب کے پٹ کھولتے اس نے کہا تھا۔زرناب اور نوین ہنس دیں۔۔۔اور ساتھ ہی اُٹھ گئیں۔

ٹھیک ہے۔رات میں ڈنر پہ کیا بات ہو گی بتانا۔ابھی ہم جا رہے ہیں۔دونوں ساتھ آئیں تھیں۔اور اب تو آئے بھی دو گھنٹے ہو چکے تھے۔نوین کے کہنے پہ اس نے سر ہلا کر انہیں بائے بولا تھا۔

ذریت کا موڈ اس وقت سخت آف تھا۔اس نے سر جھٹک کر گاڑی آگے بھگا دی۔

مجھے تو بس عورتوں کے ہی کام رہ گئے ہیں۔

:::::::::::::

دادی میرے بابا ٹھیک ہو جائیں گے ناں۔دادی کی گود میں سر رکھے وہ پوچھ رہی تھی۔دادی نے گہرا سانس لے کر اسے دیکھا تھا۔

ہاں میری جان۔۔۔اللہ پاک پہ یقین رکھتے ہیں۔ہم اللہ کے بندے ہیں۔اور اللہ کے بندوں کی سب سے بڑی خوبی یہی تو ہوتی ہے۔کہ وہ ہر طرح کے حالات میں صبر کرتے ہیں۔اور اپنے یقین کو مشکل میں اور مضبوط کر لیتے ہیں۔ان کے لہجے میں بہت نرمی اور مٹھاس تھی۔ماہ نور نے ان سے زیادہ خوبصورت بولنے والی عورت شائد ہی کہیں سُنی ہو۔ان کے الفاظ نے اسے تھوڑا حوصلہ دیا تھا۔وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔اور ان کے دونوں ہاتھوں کو نرمی سے اپنے سفید دودھیائی ہاتھوں میں تھام لیا۔

دادی جان آپ پلیز میرے بابا کے لئے دعا کریں۔میرا دل بہت ڈر رہا ہے۔میں نے کبھی ان کو اس طرح بے بس نہیں دیکھا۔جیسے میں نے اُنہیں کل دیکھا تھا۔مجھے۔۔۔مجھے سوچ سوچ کر وہم ہونے لگتے ہیں۔میرا دل بند ہونے لگتا ہے۔جب یہ خیال کسی ناگ کی طرح میرے ذہن میں آتا ہے۔کہ۔۔۔وہ آگے سے جملہ ادھورا چھوڑ کر ایک بار پھر سے رونے لگی تھی۔آنسوں رکنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔کل رات سے وہ وقفے وقفے سے رو رہی تھی۔اور اس کی

For more visit (exponovels.com)

حالت دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا۔ کہ وہ ایک یادو دن کی دُلہن ہے۔ اس پہ تو بیواؤں کی سی اُداسی چھائی تھی۔ دادی کے دل کو کچھ ہوا تھا۔ اُنہوں نے بے اختیار اپنے پوتے کی لمبی عمر کے لئے دعامانگی تھی۔ اور ماہ نور کو اپنے سینے سے لگالیا۔

بس کرو ماہ نور میری جان۔ بھائی صاحب ٹھیک ہو جائیں گے۔ اللہ ان کو ضرور صحت دیں گے۔ وہ اس کی پشت سہلا رہی تھیں۔ اور دماغی طور پہ اسے پُرسکون بھی کر رہی تھی۔

ارے کیا ہوا؟ مریم آپی ابھی ابھی احمد کو سلا کر ادھر آئیں تھیں۔ دادی کے گلے لگ کر روتی ماہ نور کو دیکھ کر انہیں تشویش ہوئی تھی۔ وہ کل سے اتنا رو چکی تھی۔ کہ اب انہیں خوف تھا۔ کہ کہیں وہ بیمار نہ پڑ جائے۔

مریم آپی کے اس طرح پریشان ہو کر پوچھنے پہ دادی نے مدد طلب نظروں سے انہیں دیکھا تھا۔

مریم آپی سمجھ کر سر ہلا گئیں۔ اور بڑھ کر اسے دادی سے الگ کیا۔

ماہ نور۔۔۔ رونا بند کرو شاباش۔۔۔ انکل ٹھیک ہو جائیں گے۔ اُٹھو شاباش ظہر کی نماز پڑھو۔۔۔ دعا مانگو۔۔۔ بولنے کے ساتھ وہ کو خُد بھی اُٹھ کر کھڑی ہو گئیں تھیں۔ اور ساتھ اسے بھی بازو سے پکڑ کر کھڑا کیا۔

ایک بیٹی کے لئے باپ کیا ہوتا ہے۔ یہ مریم آپی سے زیادہ اچھے طریقے اور کون سمجھ سکتا تھا۔

جس وقت کمرے میں وہ داخل ہوا ماہ نور نماز کے لئے نئیت باندھے کھڑی تھی۔ اور کمرے کے ماحول میں عجیب اُداسی سی تھی۔

وہ ابھی ابھی باہر سے لوٹا تھا۔ اور باہر سے آنے کے بعد عادت کے عین مطابق دادی کے کمرے کی جانب آیا تھا۔ مگر وہاں کی خاموشی اور اُداس فضا نے اسے گھبراہٹ میں مبتلا کر دیا۔

ذریت تم کہاں تھے صبح سے؟ دادی جو تسبیح میں مصروف تھیں۔ پوتے کے بیٹھتے ہی اسے گھور کر دیکھا تھا۔ اور پوچھا۔ وہ گہرا سانس لے کر صوفے سے اُٹھ کر ان کے پاس بیڈ پہ جا بیٹھا۔ اور پاؤں سیاہ بوٹوں سے آزاد کر کے نیوی بلو کوٹ سے وجود کو الگ کر کے ان کہ گود میں سر رکھ لیا۔ دادی نے اس کی جانب سے خاموشی نوٹ کی تھی۔

For more visit (exponovels.com)

ذریت میں نے کچھ پوچھا ہے بچے۔

دادی جان آفس کے سلسلے میں باہر تھا۔اکمل کے آفس چلا گیا تھا۔اس نے نہ جانے کیوں صفائی دی تھی۔

دادی نے اس کی پیشانی کو دیکھا۔اور جھک کر نرمی سے بوسہ لیا۔اس کی کل رات سے بے آرامی سے وہ آگاہ تھیں۔ صبح بھی ہسپتال سے واپسی پہ وہ آرام کرنے کے لئے ایک سیکنڈ کے لئے بھی نہیں لیٹا تھا۔آدھے گھنٹے بعد ہی آفس چلا گیا تھا۔اور اب ظہر کے وقت اس کی واپسی ہو رہی تھی۔

وہ بازو آنکھوں پہ دھرے لیٹا تھا۔جب کسی کی ہچکی کی آواز نے اسے بازو ہٹا کر دیکھنے پہ مجبور کیا تھا۔ماہ نور سامنے ہی سجدے میں جھکی رو رہی تھی۔اس نے دادی کو دیکھا۔جو خود بھی تفکر کی لکیریں چہرے پہ سجائے اسے دیکھ رہی تھیں۔

یہ کب سے ایسے رو رہی ہے؟

صبح سے جب سے تم اسے گھر چھوڑ کر گئے۔۔۔ گہرا سانس لے کر اُنہوں نے کہا تھا۔وہ خاموشی سے ماہ نور کو دیکھنے لگا۔

وہ سجدے میں جھکی مسلسل رو رہی تھی۔ تبھی مریم آپی بھی وضو کر کے کمرے میں داخل ہوئی تھیں۔انہوں نے ذریت کو وہاں دیکھا۔اور پھر بڑھ کر اس کے پاس بیٹھ گئیں۔

ذریت نے آپی کے آنے پہ ماہ نور سے نظر پھیر لی تھی۔اس کا رونے سے چہرا سرخ ہو رہا تھا۔اس نے سائڈ سے اس کے اُٹھتے دیکھ لیا تھا۔

ذریت تھوڑی دیر تک ماہ نور کو ہسپتال لے جانا۔انکل سے دور ہونے کی وجہ سے وہ ایسے بے چین ہے۔اور پلیز تم بھی ایک بار آرام سے نرمی سے سمجھاؤ۔۔۔ کہ اس طرح رو کر خود کو ہلکان نہ کرے۔۔۔ انکل ٹھیک ہو جائیں گے۔اُنہوں نے اسے سمجھایا تھا۔وہ سر اثبات میں ہلانے لگا۔اور پھر ماہ نور سلام پیرتا دیکھا کر وہیں دادی کی گود میں لیٹے لیٹے ہی چہرے کا رخ بدل گیا۔

ماہ نور نے سلام پھیرتے ہی سب سے پہلے آنکھیں بند کئے لیٹے ذریت کو دیکھا تھا۔ اسے دیکھتے ہی ماہ نور کو غصہ آیا۔ وہ رو رو کر اپنے باپ کے لئے ہلکان ہو رہی تھی۔ اور جس کو اس کے سر کی چھت بنایا گیا تھا۔ وہ آرام سے بستر پہ لیٹا ہوا نیند کے مزے لے رہا تھا۔ وہ بہت نرم مزاج اچھی اور مثبت سوچ کی مالک لڑکی تھی۔ مگر ذریت کے صبح کے رویئے نے اسے خاصا بدزن کر دیا تھا۔ وہ وہاں سے اُٹھ گئی۔

ماہ نور بیٹا کھانا کھا کر ہسپتال کا چکر لگا لینا۔ شام میں میں اور مریم بھی آئیں گے۔ ذریت تمہارے ساتھ ہی ہو گا پریشان مت ہونا۔ اور اپنے بابا کے سامنے زیادہ رونا مت۔ وہ پریشان ہوں گے۔ دادی نے اسے اُٹھا دیکھ کر کہا تو وہ اثبات میں سر ہلا کر جائے نماز سمیت کمرے سے نکل گئی۔ باقی کی نماز اس نے اپنے کمرے میں پڑھنے کا سوچا تھا۔

اس کے جاتے ہی ذریت نے آنکھوں سے بازو ہٹا لئے۔ اور سامنے کی کھڑکی سے باہر اُڑتے پرندوں کو دیکھنے لگا۔

ہلکے سروں پہ چلتے میوزک کی آواز کمرے میں بج رہی تھی۔ اور وہ کمرے میں قد آدم شیشے کے سامنے کھڑی میک اپ کر رہی تھی۔ جب کوئی بہت تیزی سے اس کے کمرے میں داخل ہوا تھا۔ داخل ہونے والے نے دروازہ بجانے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔ اس نے تعجب سے ڈیڈ کو دیکھا۔ اور ہاتھ میں پکڑی لپسٹک کو واپس رکھ دیا۔ وہ رات کے ڈنر کے لئے تیار ہو رہی تھی۔

نتاشا یہ میں کیا سُن رہا ہوں۔ کڑے تیوروں کے ساتھ اسے گھورتے وہ کہہ رہے تھے۔ نتاشا نے ذرا چونکی ہو کر انہیں دیکھا تھا۔

کیا ڈیڈ۔۔۔؟

تم نے اسفند اکرام سے منگنی ختم کر دی؟ ان کے لہجے میں نرمی ہلکی سی بھی نہ تھی۔ نتاشا ذرا سی ٹھٹکی اور کچھ سوچ کر سر نفی میں ہلایا۔

نہیں ہر گز نہیں۔۔۔بلکہ اسفند کو خُد ہی مجھ میں اب اٹریکشن فیل نہیں ہوتی۔اس لئے ایسے فضول سے بہانے اور وہ بھی جھوٹے بہانے بنابنا کر رشتہ ختم کرنے کے درپہ ہے۔اس نے صاف جھوٹ بول دیا تھا۔ابھی اس کی اور ذریت کے حالات کے پیشِ نظر شادی ممکن نہیں تھی(یہ ذریت کا خیال تھا۔)اس لئے اس نے بات کو پھیل جانے سے روکا تھا۔

ڈیڈ نے وہیں کمرے کے وسط میں کھڑے کھڑے ایک ابرو اُٹھا کر اسے دیکھا تھا۔

تم جانتی ہو۔وہ ہمارے بزنس کے لئے کتنا ضروری ہے۔اسے ہاتھ سے ہر گز جانے نہیں دینا ہے ہم نے۔اگر وہ ہاتھ سے چلا گیا۔تو ہمارے بزنس کو جو تھوڑی بہت ساکھ ملی ہے۔وہ بھی اس کے پیچھے ہٹتے ہی واپس گر جائے گی۔ان کی بات میں چھپا لالچ صاف محسوس کیا جاسکتا تھا۔اس نے سر اثبات میں ہلا دیا۔

ڈیڈ آپ کی وجہ سے صرف آپ کی وجہ سے میں اسے برداشت کر رہی ہوں۔ورنہ آپ جانتے ہیں شادی وغیرا میں مجھے با لکل بھی دلچسپی نہیں ہے۔اس نے ناک سے مکھی اُڑا کر کہا تھا۔اور ڈیڈ جیسے کھل سے گئے۔

بس میری جان کچھ دیر برداشت کر لو۔پھر میں تمھیں زیادہ دیر اسے برداشت کرنے کو نہیں کہوں گا۔وہ ایک ساٹھ کے ہندسے کو چھوتی عمر کے گریس فل انسان تھے۔ان کے چہرے کی تراشی ہوئی مونچھیں ان کے گندمی سے جھریوں سے پاک چہرے پہ خوب بچ رہی تھیں۔اور ان کی شخصیت کو دیکھ کر کوئی بھی اندازہ نہیں لگا سکتا تھا۔کہ وہ کس قسم کی ذہنیت رکھتے ہیں۔

صرف آپ کی خاطر۔۔۔مسکرا کر اس نے کہا تھا۔وہ مسکرا کر اسے سر سے پاؤں تک دیکھتے واپس مڑ گئے۔

وہ کہاں جارہی ہے۔یہ اُنھوں نے پوچھنا ضروری نہیں سمجھا تھا۔وہ اپنی مرضی کی مالک ہے۔جو چاہے کرے۔یہ ان کا خیال ہے۔

نتاشا نے ڈیڈ کو کمرے سے جاتے دیکھا۔تو اٹکی سانس جیسے بحال ہوئی۔شکر ہے۔۔۔اگر ڈیڈ کو خبر ہو جاتی۔وہ مجھے زندہ نہ چھوڑتے۔بلکہ کوئی شک نہیں کہ اسفند اکرام سے ابھی نکاح کروا دیتے۔ذرا سا کپکپا کر اس نے واپس چہرا شیشے کی جانب موڑ لیا تھا۔

ذریت اس کی زندگی میں کیا اہمیت رکھتا تھا۔ کاش یہ بات کوئی سمجھ سکتا۔ وہ تو اس ے ہر سانس کے ساتھ سوچتی تھی۔ اس کے بس میں نہیں تھا۔ ورنہ وہ کبھی اس کے لئے اتنے دیر خوار نہ ہوتی۔ البتہ یقینِ کامل تو اسے اب بھی تھا۔ کہ وہ اسے چھوڑ کر کہیں نہیں جائے گا۔ بس یہ اگر ڈیڈ نام کی ہڈی نہ ہی ہوتی تو کیا ہی اچھا تھا۔

::::::::::

جس وقت وہ کمرے میں واپس آیا وہ ابھی تک جائے نماز پہ تھی۔ وہ خاموشی سے باتھ روم کی جانب بڑھ گیا۔ اسے کچھ دیر پہلے ہی ابرار کی کال موصول ہوئی تھی۔ انکل کی طبیعت کافی بگڑ رہی تھی۔ وہ کل سے ایمرجنسی میں تھے۔ مسلسل بے ہوشی کے زیرِ اثر تھے۔ اور دل کام کرنے سے انکاری تھا۔

اب ڈاکٹرز کا خیال تھا۔ کہ ان کے دل کی دھڑکن کو نارمل کرنے کے لئے وقتی طور پہ پیس میکر کو لگا دیا جائے جس کے لئے ان کے سینے کا مائنر اپریشن کیا جانا تھا۔ اب اسی کے لئے اُنہیں جانا تھا۔

ماہ نور تیار ہو جاؤ۔ ہم انکل سے ملنے جا رہے ہیں۔ واش روم سے وہ فریش ہو کر نکلا تھا۔ جب گیلے بالوں کو خشک کرتے اس نے ماہ نور کو دیکھا۔ وہ اُداسی سے ہاتھوں کی ہتھیلیاں دیکھ رہی تھی۔ چہرہ ابھی بھی گہرے امرود رنگ دوپٹے کے ہالے میں تھا

میں آپ کے ساتھ نہیں جاؤں گی۔ اسے اس کی صبح کی بات یاد تھی۔ وہ اس سے اس قسم کی سنگ دلی کی ہرگز اُمید نہیں کر سکتی تھی۔ اب اس کے بولنے پہ بھی ماہ نور کا دل صاف نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ جو بال شک کرتا

شیشے کے سامنے کھڑا تھا۔ حیرت سے مڑا تھا۔

اچھا۔۔۔ صبح تو بڑا بول رہی تھی۔ بڑا ذمہ داری۔۔۔ ذمہ داری کر رہی تھی۔ اب کیا ہوا۔ اس نے قدرِ ناگواری سے کہا تھا۔ اسے عادت نہیں تھی۔ نرمی سے بات کرنے کی۔ اس لئے غیر دانستہ بول گیا۔ ماہ نور نے چہرہ موڑ کر بڑے سرد انداز میں اسے دیکھا تھا۔

ہاں تو اگر آپ کو احساس ہوتا۔ تو آپ مجھے واپس لاتے ہی کیوں۔ اور لے آئے تھے۔ تو لے بھی جاتے۔ مگر آپ نے صاف انکار کر دیا۔۔ آپ کو لگا۔ میں آپ کی محتاج ہوں۔

میں زیادہ باتیں سُننے کے موڈ نہیں ہوں۔ چُپ چاپ چادر اُٹھاؤ۔ اور میرے ساتھ آؤ۔ اس نے اب کی بار رُکھائی سے کہا تھا۔ ماہ نور نے سر جھٹک کر چہرہ واپس موڑ لیا۔

جب ماں نہ ہو۔ باپ بستر پہ پڑا ہو۔ تب آپ جیسے ایسے ہی باتیں سُناتے ہیں۔ وہ اس وقت خُدا ترسی کی انتہا پہ تھی۔

میرے جیسے سے کیا مطلب۔۔۔ اور شادی کی خواہش آپ محترمہ کی تھی۔ میں انکار کر چکا تھا۔ اس نے اب کی بار روکھائی سے کہا۔ تو ماہ نور نے ہونٹ بھینچ لئے تھے۔

آپ میں اگر اتنی ہی ہمت تھی۔ تو کر دیتے خود انکار۔۔۔ اور آپ میں کوئی ایسی خوبی نہیں ہے۔ جس کی وجہ سے میں یا کوئی اور احمق لڑکی آپ کے پیچھے اپنے آپ کو ساری زندگی عذاب میں مبتلا رکھتی۔ اس نے صبح کی ساری آگ بھی ابھی نکال دینا ضروری سمجھا تھا۔ ذریت جو ہاتھ میں برش پکڑے کھڑا تھا۔ بڑے غصے سے مڑا تھا۔

اب تم زیادہ بول رہی ہو۔۔۔ انگلی اُٹھا کر لہجے کو دھیمہ رکھتے اس نے کہا تھا۔

ماہ نور اُٹھ کر سامنے آ گئی۔۔۔ نہیں کچھ زیادہ نہیں ہو رہا۔ میں بس آپ کو احساس دلا رہی ہوں۔ کہ مجھے کمزور سمجھ کر کوئی بھی بات بولنے کی یا طنز کرنے کی غلطی بھی مت کیجئے گا۔ کیونکہ اب میں لیحاظ نہیں کروں گی۔ اور اگر آپ نے ذرا سا بھی مجھے رعب دیکھانے کی کوشش کی تو یاد رکھئے گا۔ کہ میں آپی دادی اور ابرار بھائی کو بتا دوں گی۔ وہ ایک ہی سانس میں سب واضح کر گئی تھی۔ ذریت سینے پہ بازو باندھے اسے دیکھتا رہا تھا۔ اس کے چُپ ہونے پہ ایک ناگوار نظر ڈال کر واپس پھر سے شیشے کی جانب مڑ گیا۔

اپنے چھوٹے سے ذہن میں ایک بات بٹھا لو۔ کہ مجھے تم میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ تم جو مرضی کرو میری بلا سے۔۔ اور اب کچھ بھی بولے بغیر باہر نکلو۔۔۔ کچھ دیر میں مجھے ایک میٹنگ کے لئے بھی جانا ہے۔ دادی کی تاکید نہ ہوتی۔ تو وہ کبھی اسے اس قدر بد تمیزی پہ دوبارہ نہ بولتا۔ مگر وہ دادی کی نظر میں بُرا بننا ہر گز افورڈ نہیں کر سکتا تھا۔

For more visit (exponovels.com)

:::::::::::

سورج کی نرم نرم حدت میں بیٹھ کر کینوں کھانا،ایک بہت دلچسپ اءمر تصور کیا جاتا ہے۔وہ بھی اس وقت لان کے وسط میں بیٹھی لان چیئر پہ ٹانگیں اکھٹی کئے کینوں کی ٹوکری جھولی میں دھرے دھڑا دھڑ کینوں چھیل چھیل کر غڑپ غڑپ کھانے میں مشغول تھی۔جب پھوپھو عین اس کے پیچھے آن کھڑی ہوئی تھیں۔

صدقے جاؤں موٹی۔۔۔کیا یاجوج ماجوج سے شرط لگائی ہے کھانے کی؟مسکراہٹ کو ہونٹوں کی دہلیز پہ چھپاتے اُنہوں نے پوچھا تھا۔فرح نے ایک مصنوعی ناگوار نظر ان پہ ڈالی۔مگر پھر کچھ بھی بولے بغیر خاموشی سے کھانے میں مصروف رہی۔

بولو بھی۔۔۔کونٹیسٹ میں انعامی رقم کتنی رکھی گئی ہے؟اس کے کندھوں کو دباتے اُنہوں نے پھر سے چھیڑا تھا۔

کیا ہے پھوپو۔۔۔مائیں تو اپنے بچوں کو کھاتا دیکھ کر جی اُٹھتی ہیں۔اور ایک آپ ہیں۔مجال ہے۔جو مجھے ذرا کچھ اپنی پسند کا شوق سے کھانے دیں۔ناک چڑھا کر اس نے کہا۔تو وہ ہنس دیں۔

ہاں ایسی مائیں بعد میں اپنی تھیلے جیسی لڑکیاں لئے پِھر رہی ہوتی ہیں۔کہ کوئی ان شاہ جہان کی چال ڈھال والی لڑکیوں سے بیاہ رچالے۔بات سُنو۔۔۔ہمارے خاندان مین تو پہلے ہی اگر کوئی لڑکی چھبیس سے اُپر ہو جائے تو اکسپائر سمجھی جاتی ہے۔ایسے میں تم کھا کھا کر اور ڈائناسور بن جاؤ۔تاکہ بعد میں بھوگتنا ہمیں پڑے۔مسکراہٹ سے لہجے کو چھپاتے اُنہوں نے اسے تنگ کرنے کو ایک نیا نُکتا اُٹھا دیا تھا۔

لیں رکھی ٹوکری۔۔۔آپ کو جو چُبھ رہی تھی۔منہ بگاڑ کر اس نے ٹوکری جھولی سے اُٹھا کر زمین پہ پاس ہی پھینکنے کے انداز میں رکھی تھی۔پھوپو ہنس دیں۔

اسلام علیکم۔۔۔

گوری گول مٹول سی شائستہ سی مسکراتی پورے قد کے ساتھ کھڑی مسکرا رہی تھی۔ان کو دونوں کو اپنی جانب دیکھتا پا کر اس نے بھی اپنے قدم آگے بڑھا دئے۔

For more visit (exponovels.com)

وعلیکم السلام شائستہ۔۔۔کیسی ہو بچے؟انیس سالہ شائستہ کو دیکھ کر پھوپو نے نرمی سے اور پیار سے پوچھا تھا۔وہ مسکرا کر سر ہلاتی بیٹھ گئی۔

ٹھیک آپی۔۔۔آپ کیسی ہیں؟اور فری تم کیسی ہو؟میں نے بھائی کو تمہیں پیغام دینے کو بولا تھا۔وہ تو شائد جواب بھی لے آیا تھا۔کہہ رہا تھا۔تم نے آنے سے انکار کر دیا،قسم سے مجھے اتنا دُکھ ہوا۔بھلا مجھ چھوٹی بہن سے کیا غلطی ہو گئی۔کہ آپ نے آنے سے بھائی کے منہ پہ ہی انکار کر دیا۔میں ن نیے سوچا۔آج میں خود جا کر ذرا پوچھ کر تو آؤں۔

کمال کا ضبط تھا دونوں کا۔جو اس کی لمبی لفاظی سُن بھی رہی تھیں ساتھ ہی ساتھ مسکرانے کا کام بھی جاری رکھا ہوا تھا۔

اصل میں پھوپو جی کی شادی کی تیاری چل رہی ہے ناں۔تو گھر میں سو کام ہوتے ہیں۔اس لئے کہیں باہر آیا جایا نہیں جاتا۔اس نے ذرا مروتاً مسکرا کر کہا تھا۔ساتھ ہی ٹانگیں بھی سیدھی کر لیں۔

لے۔۔۔اب ایسی بھی کیا مصروفیت کہ بندہ اپنوں کو ہی بھول جائے۔اس نے ناک سے مکھی اُڑا کر کہا۔تو فرح کو سخت اُلجھن ہوئی۔وہ اسے ہر گز پسند نہیں کرتی تھی۔شائستہ کا عجیب چغل خور عورتوں والا ہی رویہ رہا جب بھی وہ اس سے ملی تھی۔اس لئے وہ اسے کچھ خاص پسند نہیں کرتی تھی۔اثر تو شائستہ ایسی بات کر جاتی تھی۔کہ فرح محض خون کے گھونٹ پی کر ہی رہ جاتی تھی۔مگر خاندان کی وجہ سے منہ بند کر جاتی تھی۔ورنہ کوئی بعید نہیں تھا۔کہ اچھی خاصی کھری کھری سُنا جاتی جیسے کاشف بھائی کو سُنائی تھیں۔مگر جی کیا کریں خاندان کی روایات کا۔۔۔

پھوپو آپ شائستہ کے پاس بیٹھیں۔میں اس کے لئے کافی لاتی ہوں۔اس سے جان چھوڑانے کا بہترین حل اسے یہی لگا تھا۔کہ وہ وہاں سے ہی غائب ہو جاتی۔

نئیں ئیں کیا ضرورت ہے۔میرے لئے یہ کینوں ہی کافی ہیں۔کہنے کے ساتھ اس نے زمین پہ دھری ٹوکری بھی اُٹھا لی تھی۔اور اُٹھا کر مزے سے چھیل چھیل کر کھانے بھی لگی تھی۔فرح اپنا سا منہ لے کر رہ گئی۔

اہسے مہمان کم ہی دیکھے ہوں گے۔جو اس جیسے تھے۔

ہم م بھو کی۔۔۔اپنے کینوں اسے اتنی رغبت سے کھاتا دیکھ کر اس نے منہ بنا کر سوچا۔اور پھر واپس پاؤں اوپر کرسی پہ چڑھا لئے۔

پھوپو اس کے چہرے کے بدلتے زاویئے دیکھ کر ہونٹوں پہ آتی ہنسی بمشکل ہی روک پا رہی تھیں۔

:::::::::

بارش بھل بھل برس رہی تھی۔اور وہ اندر کھڑکی کے سامنے کھڑی ان برستی بارش کے قطروں کو گرتا دیکھ رہی تھی۔اس نے کچھ دیر تک سامنے بھیگتی بالکنی کو دیکھا۔اور پھر سر پہ اونی ٹوپی اوڑھتی کمرے سے باہر نکل آئی۔

سلام علیکم دادی جان ! دادی جان کے کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے باآواز بلند سلام کیا تھا۔کمرے کا ماحول باہر راہداری سے ذرا زیادہ گرم تھا۔

دادی جان معمول کے مطابق کلام اللہ میں مصروف، ساتھ ہی ساتھ ماہ نور کی فرمائش پہ اس کے لئے سویٹر بُننے میں مصروف تھیں۔اس کے سلام پہ مسکرا کر سر کو اثبات میں ہلایا تھا۔

آؤ۔۔ گڑیا بیٹھ جاؤ۔اُنہوں نے اسے دیکھ کر پاس آنے کا اشارہ کیا تھا۔

ابھی نہیں۔۔۔پکوڑے اور چائے نہ ہو۔تو بارش انجوائے کرنے میں مزہ نہیں آتا۔پہلے میں وہ بناؤں گی۔پھر آپ اور میں بیٹھ کر باتیں بھی کریں گے۔اور مریم آپی کو کال بھی کریں گے۔مریم آپی دو دن قبل ہی واپس فرانس لوٹیں تھیں۔اور ان کو دو دن میں اس نے کافی مِس کیا تھا۔

اس نے چہک کر کہا۔تو دادی کا دل پُر سکون سا ہو گیا۔ایک پریشانی اور بے تابی جس نے پیچھلے دو ہفتوں سے اسے جکڑ رکھا تھا۔اب جو وہ پُر سکون ہوئی۔تو دادی کو بھی سکون محسوس ہوا۔ابسام صاحب کی صحت اب پہلے سے کچھ بہتر تھی۔۔اسی لئے وہ بھی پُر سکون تھی۔

جلدی سے آجاؤ پھر تو۔انہوں نے بھی اسی کا انداز میں کہا۔ تو وہ سر ہلاتی کمرے سے نکل گئی۔

کیچن میں جلتے برنر کی بدولت خاصی حدت تھی۔

اس نے کیچن میں کام کرتے ملازم ظفر کو دیکھا۔اور دوپٹے کو دُرست کرتی کیچن میں آگئی۔

ظفر بھائی۔۔۔رات کا کھانا آج میں بناؤں گی۔آپ جانا چاہیں تو چلے جائیں۔طاہر کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں ہے۔طاہرہ ظفر کی بیوی تھی۔

بہت شکریہ باجی۔وہ جیسے پہلے ہی بھاگنا چاہتا تھا۔سُنتے ہی نکل گیا۔ماہ نور نے ایک نظر کیچن کا جائزہ لیا۔اور کیبن کھول کھول کر اندر جھانکنے لگی۔ضرورت طلب سامان جلد ہی مل گیا۔تو اس کے کام میں تیزی آگئی۔اس سے پہلے کہ بارش رکتی۔وہ کام کر لینا چاہتی تھی۔

لاہور شہر میں برستی بارش نے ایک واحد وہ تھا۔جسے بور اور بد مذاج بنا دیا تھا۔وہ جس وقت لاؤنج میں داخل ہوا۔کانچ کی دیوار کے پار کام کرتی ماہ نور نے اسے اپنی جانب متوجہ کر لیا۔یہ اس کے لئے غیر متوقع تھا۔

وہ ایک نظر اسے دیکھ کر دادی کے کمرے میں آگیا۔

::::::::::::::

یہ لیں گرم گرم پکوڑے۔۔۔اس نے کمرے میں داخل ہوتے ہی جوش میں کہا۔مگر سامنے ٹانگیں پسار کر لیٹے ذریت کو دیکھ۔کر منہ بنالیا۔ذریت جو بیڈ پہ لیٹا۔آج بڑی فرصت سے موبائل پہ گیم کھیلنے میں مصروف تھا۔نے ایک نظر اسے دیکھا تھا۔جو اس کے تاثرات تھے۔اس سے خاصا ناگوار ہوا۔

میری شکل کو ایسا کیا ہوا ہے۔جو ایسے منہ بنالیا۔محض سوچا۔

ماہ نور نے ایک نظر دادی کی خالی کُرسی کو دیکھا۔اور پھر سامنے کی میز پہ پکوڑوں کی بھری پلیٹ رکھ دی۔

دادی جان کہاں ہیں؟ وہ اس سے پوچھنا تو نہیں چاہتی تھی۔ مگر پھر پوچھ لیا۔ کہ کہیں پکوڑے ٹھنڈے نہ ہو جائیں۔ اور چائے بھی ٹھنڈی ہو جاتی تو بدمزہ ہو کر اپنا ذائقہ کھو دیتی۔

واش روم میں ہیں۔۔۔ اس نے مختصر بتا کر ایک اچٹتی نگاہ میں انگلیاں چٹخاتی ماہ نور کو بھی دیکھا تھا۔

ماہ نور نے ظفر کے جاتے ہی دوپٹہ سر سے اُتار کر گلے میں ڈال لیا تھا۔ اور اب اونی ٹوپی میں، خوبصورت فروزی کھدر کے سوٹ میں وہ خاصی معصوم اور سادہ سی لگ رہی تھی۔ اس نے یہ بھی اس ایک نظر میں پا لیا تھا۔ کہ اس کی چوٹیا کے کچھ بال اس کی اونی ٹوپی سے باہر جھانکتے اس کی گالوں کا طواف کر رہے تھے۔

دادی جان آپ کی چائے تو اب تک ٹھنڈی ہو گئی ہو گی۔ وہ مزے سے آخر خود بیٹھ کر کھانے میں مصروف تھی، جب دادی جان واپس آئیں۔

میز پہ دھری ان کی چائے کے کپ پہ تیرتی ملائی کی تیہہ کو دیکھ کر اس نے کہا تھا۔

ذریت جو کافی دیر سے اس اُمید میں تھا۔ کہ ماہ نور اسے بھی پوچھ ہی لے گی۔ اور وہ جو آفس سے بھوکا لوٹا ہے۔ انکار کئے بغیر کھا لے گا۔ اپنا منہ لے کر رہ گیا تھا۔ اسے پکوڑے بہت پسند تھے۔ مگر آج شائد اس کی قسمت میں نہ ہوتے۔

ذریت بچے آؤ۔۔۔ ادھر کیوں بیٹھے ہو۔ اسے سیدھے لیٹے ماحول سے یکسر بے نیاز ہو گیم کھیلتے دیکھ کر کہا تھا۔ انہیں حیرت تھی۔ کہ پکوڑے ابھی تک اس کی پہنچ سے دور کیسے ہیں۔

دیکھیں ناں دادی جان۔ میں نے اتنی محنت سے بنائے پکوڑے اور انہوں نے انکار کر دیا۔ وہ جو اُٹھنے والا تھا۔ ماہ نور کے صفاچٹ جواب پہ ہونٹ بھینچ کر رہ گیا تھا۔

جھوٹی۔۔۔ سوچ کر سر جھٹکا۔

ہیں۔۔۔ ذریت نے پکوڑوں سے انکار کر دیا۔ لیکن بچے تم تو پکوڑوں کے بہت شوقین ہو۔۔۔ دادی کو جیسے یقین نہ آیا۔

وہی۔۔۔ میں نے بھی کہا۔ مجھے مریم آپی نے بتایا تھا (اسی لئے تو کہہ رہی ہوں)۔ کہ ذریت کو پکوڑے بہت پسند ہیں۔ ابھی میں نے کہا۔ تو کہتے ابھی بزنس لنچ کر کے آیا ہوں۔ رکھ لو۔ تھوڑی دیر بعد۔۔۔ اس سے پہلے کہ ذریت ہونٹ کھولتا۔ اس نے پھر تیزی سے پکوڑے کو مختلف آئٹمز میں ڈِپ کرتے کہا تھا۔

جھوٹی۔۔۔ پھر سے شوچا۔

جی دادی جان اصل میں آج اکمل سے ملنے چلا گیا تھا۔ اسی لئے لنچ کر کے آیا ہوں۔ اس نے مجبوراً کہا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا۔ کہ دادی جان ان کے جگڑوں سے آشناں ہو تیں۔

ماہ نور کو زور سے ہنسی آئی تھی۔ مگر وہ رو کے بیٹھی رہی۔

اچھا چلو جیسے تمہاری مرضی۔ اُنہوں نے سر اثبات میں ہلایا اور پھر خُد بھی مزے سے کھانے لگیں۔

بہت خوب ماہ نور بچے۔۔۔ دادی جان کی تعاریف پہ اس کا دل خوش ہوا تھا۔ اس نے مسکرا کر سر جھکا دیا۔

دادی جان رات میں کھانا بھی میں بناؤں گی۔

نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔ ظفر کس لئے ہے۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ وہ کیچن کے کاموں میں ن اُلجھے۔

نہیں پلیز۔۔۔ میں بہت بور ہوتی ہوں۔ کھانا وغیرہ مجھے بنانے دیا کریں۔ ان کے قریب بیٹھ کر ان کا ہاتھ دباتے اس نے کہا تھا۔

مگر بچے ابھی تو آپ کی شادی کو دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔ جو ابھی سے کام کرنا ہے۔ پھر بعد میں ساری زندگی بھی تو کرنے ہی ہیں کام۔

ذریت نے چونک کے انہیں دیکھا تھا۔ یہ دادی جان کیا سوچ بیٹھیں تھیں۔ اور وہ کیا سوچ بیٹھا تھا۔ سب گُڈمڈ ہوا۔

ماہ نور نے سر نفی میں ہلا دیا۔ اور برتن لے کر کمرے سے نکل گئی۔

بہت پیاری بچی ہے۔ میں اس ایک ہفتے میں اللہ کا اتنی بار شکر ادا کر چکی ہوں۔ کہ اللہ نے میرے پوتے کا نصیب اس اتنے اچھے اخلاق کی لڑکی سے لکھ دیا۔ دادی جان کی آنکھوں میں خوشی ہلکورے لے رہی تھی۔

دادی جان انسانوں سے اتنا متاثر نہیں ہوتے۔ کچھ سوچ کر اس نے کہا۔ اور ساتھ ہی اُٹھ بھی گیا۔

تبھی فون کی گھنٹی بجی تھی۔ دادی جان جو کچھ بولنے والیں تھیں اسے موبائل پہ آنے والا اہم میسج دیکھ کر سر جھٹک کر رہ گئیں۔

کبھی اس شیطان کی آنت کو چھوڑ بھی دیا کرو۔ انہیں اس سے شکائت ہوئی تھی۔ وہ مسکرا دیا۔

اچھا۔۔ اسی شیطان کی آنت کی بدولت تو آپ کے پوتے کا کام چلتا ہے۔ اس نے کہنے کے ساتھ نتاشا کی بھیجی تصاویر کھولیں تھیں۔

نتاشا آج کسی دوست کی پارٹی پہ فیملی کے ساتھ انوائٹڈ تھی۔ اور وہاں سے تصویریں اسے وٹس اِپ کر رہی تھی۔

پہلی تصویر کھولتے ہی ذریت نے نگاہ پھیر کر دادی جان کو دیکھا تھا۔ ایسے ہی شک گزرا کہ کہیں دیکھ تو نہیں رہیں۔

نتاشا بہت سوں کے درمیان کھڑی سفید میکسی میں تھی۔ جس سے اس کے دونوں کندھے برہنہ ہونے کی وجہ سے دیکھ رہے تھے۔ اس قدر چُست لباس میں وہ ایک شہد کی مکھی کا سا کام کر رہی تھی۔ ذریت ایک ہارٹ بیٹ مِس ہوئی تھی۔

کچھ دیر پہلے کا منظر اب کی بار دوبار جو چلا تھا۔

:::::::::::::

بارش کے متواتر برسنے اور سردی کی شدت نے اسے گھر میں بند کر کے رکھ دیا تھا۔ دادی جان نے ایک سیکنڈ کے لئے بھی اسے گھر سے باہر نکلنے نہیں دیا تھا۔ اور اس گیلے سے موسم نے اس پہ عجیب سی کسل مندی اور بوریت طاری کر دی تھی۔ وہ کمرے داخل ہوا۔ تو ماہ نور اسے لیپ ٹوپ کے ساتھ مصروف نظر آئی تھی۔

اچھا بات سُنیں بھائی۔۔۔

مجھے دادی جان نے آپ کی طرف جانے کی اجازت دی ہے۔ سو شام میں مجھے آ کر لیجائے گا۔

کمرے میں سوندھی سوندی سی خشبو نے ماحول کو خوبصورت بنا دیا تھا۔

ذریت نے کمبل اُڑھتے گہرہ سانس لے کر نئے خریدے گئے ائیر فرشنر کو اپنے اندر اُتارا تھا۔ آج کی خشبو اچھی تھی۔

ہاں تم تیار رہنا لے آؤں گا۔ چلو اب بائے۔ بابر وڈیو کال پہ ماہ نور سے بات کر رہا تھا اور ماہ نور ذریت کی جانب آدھا رخ موڑے صوفے کی پشت تکائے بالوں کو کھولے سر پہ اونی ٹوپی پہنے بیٹی تر تازہ لگ رہی تھی۔

اللہ حافظ۔۔۔ اور سُنیں بابا کو میرے آنے کا مت بتائے گا۔ میں ان کو سرپرائز دینا چاہتی ہوں۔ مسکراتے ہوئے اس نے کال بند کرنے سے پہلے کہا تھا۔

بابا نے محض انگوٹھا اُٹھا کر اوکے کا اشارہ کیا اور پھر کال ڈراپ کر دی۔

ذریت نے جب تک وہ مصروف رہی اس کی پشت کے بالوں کے رنگ کو خوب حفیظ کر لیا تھا۔ اس کے بال بہت زیادہ لمبے نہیں تھے۔ کمر کے آدھ تک آتے تھے۔ مگر وہ اتنے سلکی اور چمک دار تھے۔ کہ ان کا بھاری پن خوب بھلا معلوم ہوتا تھا۔

تم نے بال کیوں کھولے ہیں۔ غیر ایرادی طور پہ آواز میں نرمی کی کمی تھی۔ وہ جانتا بھی نہیں تھا۔ مگر اس کی عادت بن چکی تھی۔ وہ لاکھ نرمی سے بولنے کی کوشش کر لیتا۔ کبھی بھی نرم نہیں ہو پاتا تھا۔

اور ماہ نور کے ساتھ اسے ویسے بھی کوئی پرابلم نہیں تھی۔ ماہ نور کے آنے سے دادی خوش تھیں۔ اس کے گھر والے راضی تھے۔ بس یہی وہ چاہتا تھا۔ ورنہ زندگی اسٹیبلیش کرنے کے بارے میں اس نے کبھی نہیں سوچا تھا۔

کیوں میرے کھولے بالوں سے آپ کو کیا پرابل ہے۔ ویسے بھی آپ کے سرکل میں تو یہ ایک عام سی بات ہے۔ اس نے لیپ ٹوپ بند کرتے مسکراہٹ روکتے کہا تھا۔ ذریت خاموش ہی رہا۔ اور کچھ دیر پہلے والی نتاشا کی تصویر اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم گئی۔

For more visit (exponovels.com)

تم عورتوں کا ایک بہت مسئلہ ہے۔ تم لوگ جب وار کرتی ہو نان۔ تو سب سے پہلے خوبصورتی کا آلہ استعمال کرتی ہو۔ اور ماننا پڑے گا۔ کہ سچ میں آپ لوگ اس میں کامیاب بھی ہوتی ہو۔ نتاشا کے چہرے کو سامنے لاتے اس نے کہا تھا۔ اس کی زندگی بہت نارمل ہوتی۔ اگر نتاشا نہ ہوتی۔ وہ ابھی تک اس کا کچھ نہیں بگاڑ پایا تھا۔ پتہ نہیں کیا بات تھی۔ جو اسے کوئی بڑا قدم اُٹھانے سے روک رہی تھی۔ مگر اب وہ تنگ آچکا تھا اس سب سے۔ وہ اس چیپٹر سے جان چھڑانا چاہتا تھا۔

اچھا میں تو ابھی تک آپکو سحر میں نہیں کر سکی۔ اور ایک بات جو قابل غور ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ آپ عورتوں کے بارے میں بہت تجربہ رکھتے ہیں۔ کیا ماضی میں کسی نے دھوکہ دے دیا تھا۔ زبان کو ترشی سے روکتی اس نے کہا تھا۔

ذریت نے ناگواری سے اُسے دیکھا۔ اور پھر کمبل منہ تک اوڑھ لیا۔

عورت ذات ہے ہی جہنمی۔ جب دیکھو بس زبان کو چلاتی رہتی ہے۔ ناگوار سے ان بڑبڑا کر سوچا اور سر جھٹک دیا۔ آنکھیں بند کرنے سے وہ سیاہ رنگ سی ابشار آنکھوں میں آسموئی تھی۔ وہ محض کروٹ بدل کر رہ گیا۔

:::::::::::

نتاشا میرے سر میں اس وقت درد ہے۔ میں تم سے بعد بات کرتا ہوں۔

ٹیرس پہ کھڑے سگریٹ پیتے اس نے کہا تھا۔ فون کان سے لگا رکھا تھا۔ بولنے سے سارا دھواں باہر نکل کر ہوا میں تحلیل ہوا۔ اور سیاہی میں جب سرمئی شامل ہوا تو۔۔۔ تیز نے سادے کو چاٹ لیا۔

ذریت کیا ہم کبھی کسی اچھے اور رومنٹک کپل کی طرح نہیں بات کر سکتے۔ آپ سے جب میں کال پہ بات کرنے کو بولتی ہوں آپ ایسے ہی کرتے ہو۔ ناخنوں سے کھیلتے اس نے چوکلیٹ کھاتے کہا تھا۔

ذریت گہرہ سانس لے کر رہ گیا۔ اور آسمان کو دیکھا۔ چاند سے پاک آسمان شدید سیاہ اور بھید بھرا تھا۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ اور بس اس کی وقفے وقفے سے گونجتی آواز تھی جو ماحول میں ارتاش پیدا کرتی تھی۔

نتاشامیں بے کار میں لوفر اور سڑک چھاپ لڑکوں کی طرح گھڑ گھڑ کر تمہیں باتیں نہیں سُنا سکتا۔اور نہ ہی بے کار جملے بول سکتا ہوں۔سوری۔۔۔یہ میرے لئے پوسبل نہیں ہے۔اس نے کہا تو فون میں سے ہنسی کی جھنکار سی بج اُٹھی تھی۔اس کی بات پہ وہ خوب دل لگا کر ہنسی تھی۔

آپ جانتے ہیں۔آپ کی جگہ اگر میں آذر کو بولتی ناں کہ میرے لئے گانا گاؤ تو وہ، وہ بھی گا دیتا۔بے اختیار ہی وہ کہہ گئی تھی۔شائد ایسا پہلی بار ہوا تھا۔کہ نتاشا ایسے اس کا ذکر کر رہی تھی۔

ذریت کے دل کو کسی نے مُٹھی میں لیا ہو جیسے۔۔۔اس نے بڑی بے دردی سے ہاتھ کو ٹیرس کی ریلنگ پہ مارا تھا۔

کو۔۔۔کون آذر؟اسے لگا اس کی آواز کسی کھائی سے آ رہی ہے۔

تھا ایک لڑکا۔۔۔پاگل سا۔ہنستے ہوئے وہ جیسے اس انسان کی محبت کا مذاق بنا رہی تھی۔جس کی موت کی ذمہ داری ذریت نے اس کے کندھوں پہ ڈال رکھی تھی۔اور جس سے وہ بالکل ناواقف تھی۔

تھا؟۔۔۔مطلب؟کیا اب کیا ہوا اسے؟وہ نہ جانے کیا کھوجنا چاہ رہا تھا۔

کچھ نہیں۔۔۔بس چھوڑو۔۔۔ایسے ہی پاگل سا تھا۔یونی میں ساتھ ہوتا تھا۔میری محبت میں بھیگا ہوا تھا۔میں نے لفٹ نہیں کروائی تو امریکہ چلا گیا۔اس نے کمال مہارت سے جھوٹ بولا تھا۔اور پُر سکون اتنی کہ ذریت کا ضبط آزما گئی۔اور ایک آنسو بہت خاموشی سے اس کے گال پہ لڑھک گیا۔

نتاشا میں تم سے بعد میں بات کرتا ہوں۔اب مجھے تنگ مت کرنا۔اس نے بغیر اس کی بات سُنے خود کہہ کر کال کاٹ دی اور خود دوزانوں ہو کر ٹیرس کی زمین پہ بیٹھتا چلا گیا۔

اس کی آنکھوں سے بہت سا مائع بہتا چلا گیا۔اور وہ خود پہ ضبط کھوتا روتا رہا۔آذر اس کا دوست نہیں بھائی تھا۔اس کی جان اس کا جِگر تھا۔اور کیسے۔۔۔کیسے وہ دو کوڑی کی لڑکی اس کے بارے میں بات کر گئی تھی۔اس کا دل اس لمحے چاہ رہا تھا۔نتاشا کا قتل کر دیتا۔

For more visit (exponovels.com)

نتاشا تمہیں تمہاری زندگی موقع ضرور دے گی۔ کہ تم مرنے سے پہلے اپنے الفاظ پہ پچھتاؤ۔ اور تمہارا پچھتاوا بھی ایسا ہو گا۔ کہ یاد رکھنا تم مر مر کے جیو گی۔ اور جی جی کر مرو گی۔ آنکھوں سے چھلکتے مائع کو صاف کرتے اس نے عہد کیا تھا۔ نتاشا اس کی زندگی کی وہ شطرنج تھی۔ جس کو ہارنا اس نے اپنے مقدر میں خود لکھا تھا۔ وہ اس لڑکی کو اتنا بھگانا چاہتا تھا۔ کہ بھاگ بھاگ کر اس کا سانس ہی بند ہو جاتا۔ اور اب وہ یہی تو کر رہا تھا۔

::::::::::::

For more visit (exponovels.com)

بابا یہ رہا آپ کا مزے دار سا سوپ۔۔۔ان کے پہلو کے ٹیبل پہ رکھتے اس نے مسکرا کر کہا۔اور پھر خود بھی ان کے بیڈ کی پائنتی پہ بیٹھ گئی۔وہ اس وقت سیاہ اور سفید دھاری دار کھدر کے نفیس سے سوٹ میں ملبوس، سر پہ اونی ٹوپی لئے،اور ہم رنگ چادر سے کندھوں کو ڈھامپے ہوئے تھی۔ابتسام صاحب مسکرا دئے۔

تم روز آجاتی ہو ہمارا سر کھانے۔تمہاری ساس تمہیں کچھ نہیں کہتی۔بابر بیٹھا قریب ہی گیم کھیل رہا تھا۔ماہ نور کو بیٹھتا دیکھ کر چھیڑا۔

آپ میری ساس تک مت جائیں۔یہیں رہیں۔۔۔اور اپنی اور ابرار بھائی کی خیر منائیں۔کیوں کہ میں نے تو سوچ لیا ہے۔کہ آپ دونوں کے بھی ہاتھ اب پیلے کر ہی دینے چاہئیں۔اس نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔بابر جو سامنے ہی صوفے پہ بیٹھا تھا اور گیم کھیلنے میں غرق تھا جھٹ سیدھا ہوا۔

ماہ نور۔۔۔تم کیوں چاہتی ہو۔کہ تمہارا آنا جانا اس گھر میں کم ہو جائے۔موبائل کو پہلو میں صوفے پہ رکھتے ہاتھ کی مُٹھی کو مکا بنا کر تھوڑی کہ نیچے رکھ کر اس نے پوچھا تھا۔ماہ نور ہنس دی۔

ایسا کچھ نہیں ہو گا۔اور بہلانہ بند کریں۔میں نے اور بابا نے سوچا ہے۔کہ آپکی اور بابر بھائی کی شادی کر دی جائے۔

کیوں بابا جان ؟ابتسام صاحب جو سوپ پی رہے تھے۔اس کے پوچھنے پہ مسکرا کر سر ہلا گئے۔

کروا دو مجھے تو کوئی عتراض نہیں۔ہاں البتہ بعد میں اگر تم نے کچھ میری بیوی کے بارے میں کہا۔یا مجھے اس کے خلاف بڑھکانے کی کوشش کی تو یاد رکھنا۔میں چار اپنے پاس سے لگا کر اس کو بتایا کروں گا۔مسکراہٹ روک کر اس نے کہا۔تو ماہ نور مسکرا دی۔

آپ اتنی فکر مت کریں میری۔اپنی طرف دھیان دیں۔پتہ نہیں کوئی آپ جیسے نااہل کو اپنی بیٹی دیتا بھی ہے یا نہیں۔اس نے بھی حساب خوب برابر کیا تھا۔بابر بھائی کا منہ کھول گیا۔ماہ نور بے ساختہ ہنس دی۔

تم مجھے انڈر ایسٹیمیٹ کر رہی ہو۔ورنہ میرے حُسن کے چرچے تو امریکہ میں دور دور تک تھے۔ہاتھ سے دور کا اشارہ کیا تھا۔ماہ نور دھیمے سے ہنس دی

!آپ اور آپ کی باتیں۔۔۔خیر

آ لینے دیں بھائی کو۔پھر ان سے بھی میں بات کرتی ہوں۔اُٹھ کر باہر نکلنے سے پہلے اس نے کہا تھا۔وہ کیچن دیکھنے جا رہی تھی۔آج رات ادھر ہی کھانا کھانے کا پلین تھا اس کا۔

ابتسام صاحب مسکرا دئے۔

اللہ پاک بہتر کریں۔اُنہوں نے ساتھ دعا بھی دی تھی۔

بابا ماہ نور اب کچھ بڑی بڑی نہیں ہو گئی۔۔۔مطلب پہلے اتنی میچور نہیں ہوتی تھی، جتنی شادی کے بعد ہو گئی ہے۔فون کو واپس اُٹھاتے اور

سکرین کو سائڈ کے بٹن سے آن کرتے اس نے کہا تھا۔ابتسام صاحب نے گہرا سانس لے کر سر تکئے سے ٹکا لیا۔

اچھی بات ہے۔بیٹیوں کو سمجھدار اور دور اندیش ہی ہونا چاہیے۔ان کے لہجے میں محسوس کی جانے والی نمی تھی۔بابر انہیں محض دیکھ کے رہ گیا۔

ہلکی بڑھی ہوئی شیو میں براؤن شلوار قمیض میں کمبل اوڑھے وہ چہرے سے ہی بہت بیمار لگتے تھے۔

::::::::::::

ہلکی آہٹ پہ کمرے کا دروازہ کھلا اور وہ کمرے میں داخل ہو گیا۔

For more visit (exponovels.com)

اس کے کمرے میں داخل ہوتے ہی نیم تاریکی نے اسے اپنے حصار میں لے لیا تھا۔اس نے ایک لمبا سا سانس لے کر کمرے کی فضا میں رچی بسی خشبو کو محسوس کیا۔اور پھر وھیں قریب ہی دیوار پہ نسب سوئچ بورڈ کے سارے بٹن گرا دئے۔ٹک کی آواز کے ساتھ ہی روشنی کا سیلاب نمودار ہوا تھا۔

روشنی سے سیراب ہوتے اس نے کمرے پہ نظر ڈال کر جیسے کچھ تلاش کیا۔

کمرے کی ہر چیز اپنی جگہ پہ تھی۔۔۔بس ایک وہی غائب تھی۔وہ خاموشی سے بیڈ کے کنارے بیٹھ کر پاؤں کو بوٹوں سے آزاد کرنے لگا۔یہ ان کی شادی سے تقریباً بیس روز بعد کی بات تھی۔اور اب بیس روز میں وہ اس کمرے میں اس کی موجودگی کا اتنا عادی ہو چکا تھا۔کہ اب اُسے خالی پ کا احساس ہونے لگا تھا۔کچھ دیر بیٹھ کر وہ سر جھٹکتا اُٹھ کر باہر آ گیا۔دادی کے کمرے میں بھی وہ موجود نہیں تھی۔

دادی جان ماہ نور؟ان کے سامنے کھڑے ہوتے اس نے اس انداز میں پوچھا تھا۔کہ دادی جان چونکی تھیں۔پوتے کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔وہ ننگے پاؤں کھڑ سوالیہ نظروں سے اُنہیں دیکھ رہا تھا۔

جوتا کہاں ہے تمہارا۔سردی ہے بچے۔۔۔اس کے سوال کو اگنور کر اسے ٹوکا۔تو وہ میں کچھ بُڑبڑایا تھا۔

آپ کی لاڈلی بہو جوتے کو پتہ نہیں کہاں چُھپا گئی ہے۔بغیر دیکھے ہی اس نے کہا تھا۔یہ وہ سوچے سمجھے بغیر کر رہا تھا۔

ظفر بچے۔۔۔او ظفر بچے۔اونی سویٹر کو بُنتا چھوڑ کر اُنہوں نے ملازم کو پُکارا۔تو وہ ہمیشہ کی طرح بوتل کے جن کے مصدق فوراً آدھمکا۔

جی؟

جاؤ ذریت کا جوتا دیکھ کے دو۔ماہ نور کہیں شائد رکھ گئی ہے۔شام میں آجائے گی۔یہ بات اُنہوں نے ذریت کو دیکھ کے کی تھی۔وہ بغیر کوئی تاثر ظاہر کئے کمرے میں جیسے آیا تھا۔ویسے ہی واپس مڑ گیا۔

For more visit (exponovels.com)

لیں بھائی جی۔۔۔یہ سامنے ہی تو رکھا ہے۔جوتوں کے ریک میں پڑا جوتا اسے منہ چڑا رہا تھا۔وہ محض بولوں میں ہاتھ پھیر کر رہ گیا۔

اور کچھ چاہئے بھائی جی۔ مسکراہٹ روکتے ظفر نے پوچھا تو وہ سر نفی میں ہلا کر باتھ روم کی طرف بڑھ گیا۔

لعنت ہے مجھ پہ۔ شیشے کے سامنے کھڑا ہو کر اس نے خود کو ملامت کی تھی۔

رات کا کھانا لگا کر ابھی وہ لاؤنج کی جانب بابا اور دونوں بھائیوں کو بلانے کو آئی تھی۔جب اینٹرس سے کھدر کے سرمئی سوٹ میں سیاہ کوٹ پہنے اپنی تمام وجاہت سمیٹے ذریت آتا دکھائی دیا تھا۔

اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا۔شادی کے بعد گھر وہ دوسری بار آیا تھا۔

آپ؟ مدھم آواز میں اس نے حیرت سے کہا تھا۔آواز اس تک نہیں پہنچی تھی۔

ارے واہ بڑے بڑے لوگ۔۔۔ذریت بھائی آپ کو آج ہم کیسے یاد آ گئے۔بابر کو ہمیشہ ایسی ہی بے تو کی گفتگو کرنے کی عادت تھی۔اب بھی عادت سے مجبور ہو کر بولا تھا۔ذریت دھیمے سے مسکرا دیا۔

میں انکل سے ہوسپٹل کے بعد مل نہیں سکا تھا۔سوچا آج مل لوں۔ماہ نور مارے حیرت کے آنکھیں سکیڑے اسے دیکھ رہی تھی۔اس نے ایک نظر بھی ماہ نور پہ نہیں ڈالی تھی۔ماہ نور کو تھوڑا بُرا لگا۔مگر اس کے آنے نے اسے کافی خوش کیا تھا۔

اچھا کیا بیٹا آپ نے۔میں تو ماہ نور سے کہہ رہا تھا۔کہ آپ کو کل لنچ یا ڈنر پہ بلا لے۔اور اچھا ہوا۔آج آپ خود ہی آ گئے۔بابا کو اس کے آنے سے حقیقی خوشی ہوئی تھی۔

گڑیا کھانا لگاؤ۔۔۔ابرار بھائی نے اسے کھڑے دیکھا تو مسکراہٹ روک کر کہا تھا۔وہ سر ہلا کر واپس مڑ گئی۔یاد ہی نہیں تھا کہ وہ کھانے کا ہی تو کہنے آئی تھی۔

For more visit (exponovels.com)

بیٹا کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ بھائی صاحب کو بلایا نہیں۔ آنٹی (ملازمہ) کباب کا امیزے کو سٹور کر رہی تھیں۔ جب اسے مسکرا کر اندر آتے دیکھ کر پوچھا تھا۔

آنٹی آپ بلا لائیں مجھے یاد نہیں رہا۔ پانی کا جگ اُٹھاتے کیچن سے بائیں جانب ڈائینگ کی طرف نکلتے دروازے کی جانب جاتے اس نے کہا تھا۔

وہ سر ہلا کر باہر چلے گئیں۔

:::::::::::

نتاشا۔۔۔ نتاشا ڈیڈ کی آواز سارے گھر میں گونج رہی تھی۔ وہ جو ٹیرس پہ کھڑی بادلوں سے اٹے آسمان کو دیکھ رہی تھی۔ ان کی آواز پہ تیزی سے واپس مڑی۔

یس ڈیڈ۔۔۔ واپس مڑ کر اوپر کی راہداری سے ملحقہ ریلنگ سے نیچے جھانتے اس نے پوچھا تھا۔ ان کے ماتھے پہ ناگواری کے بل تھے۔

نیچے آؤ۔۔۔ ان کی آزو میں ضبط سے گزرتے لمحوں کے اثرات تھے۔

جی۔۔۔ خاموشی سے سیڑھیاں اُترتے اس نے صوفے پہ بیٹھتے ٹانگ پہ ٹانگ رکھتے ابرو اُٹھا کر پوچھا تھا۔

نتاشا تم نے خود اسفند سے منگنی توڑی تھی ناں۔ اس کے سامنے پسلیوں پہ ہات رکھتے انہوں نے پوچھا تھا۔

نتاش ادھیمے سے مسکرا دی۔ ہاں! میں نے توڑی منگنی اس سے۔ کمال بہادری سے اس نے کہا تھا۔ ڈیڈ کا منہ صدمے سے جیسے کھول گیا۔

نتاشا تم۔۔۔ تم نے تو کہا تھا۔ کہ تم اس کو نہیں چھوڑو گی۔ انہیں اس کی صاف گوئی پہ حیرت ہوئی تھی۔

ڈیڈ وہ برداشت کرنے والا انسان نہیں ہے۔ مجھے اس سے سخت چڑھ ہے۔۔۔ بلکہ نہیں مجھے اس سے سخت نفرت ہے۔ سمجھے آپ۔ تنفر سے کھڑے ہوتے اس نے جواب میں اس سے زیادہ حقارت سے کہا تھا۔

بکواس مت کرو۔۔۔ میں نے اس ایک رشتے کی بناپر ایک ڈیل بھی سائن کر دی تھی۔اب بتاؤ میں کیا کروں۔اس ڈیل کو پورا کرنے کے لئے کمپنی کے پاس اتنا پیسہ بھی نہیں ہے۔غصے میں ان کا لہجہ ہر قسم کے لیحاظ سے بے بہرا تھا۔

ڈیڈ یہ میرا مسئلہ نہیں ہے۔جب آپ نے ڈیل کی تھی۔تب آپ نے مجھ سے نہیں پوچھا تھا۔اور میں کیوں آپ کے دو کوڑی کے بزنس کی خاطر اپنی ساری زندگی اس سٹوپڑ اور بونگے انسان سے شادی کر کے گزار دوں۔ جس کی شکل ہے نہ عقل۔اس کے اندر کی ساری غلاظت باہر نکل رہی تھی۔

نتاشا کنٹرول۔۔۔ میں نے تم سے کہا بھی تھا۔کہ تم اس سے بس پیسہ نکلوالو۔پھر چاہے بھاڑ میں جائے۔کہا تھا یا نہیں ؟اختتام پہ اس سے تائد بھی چاہی۔وہ اس پہ سختی کر کے معملہ مزید خراب نہیں کرنا چاہتے تھے۔

میں نہیں جانتی ڈیڈ بس میں نے سوچ لیا ہے۔کہ مین اب اس اسفند دے کسی سورت شادی نہیں کروں گی۔چاہے کچھ بھی ہو جائے۔اینڈ پلیز مجھے میری زندگی جینیں دیں۔آخر میں اس نے ہاتھ بھی جوڑ دئے تھے۔

نتاشا تم سے پہلے بھی کہا تھا۔کہ اپنا بچپنا چھوڑ دو۔میرا کوئی بیٹا نہیں ہے۔جو میرا ہاتھ بٹائے۔سب تمہیں ہی دیکھنا ہے۔لاکھ بار کہہ چکا ہوں کے بزنس میں دلچسپی لو۔ورنہ ہم سب دو کوڑی کے ہو جائیں

گے۔بات کو سمجھو۔

ڈیڈ سمجھنے کی کوشش کریں میں کسی اور سے محبت کرتی ہوں۔اور آپ نہیں جانتے وہ انسان میری پوری زندگی کا اصل ہے۔میں۔۔۔میں اس کے بغیر ایک پل بھی گزارنے کا تصور بھی کرتی ہوں تو میرا سانس رکنے لگتا ہے۔میں اس طرح کبھی اسفند کو ٹریپ نہیں کر سکتی۔اینڈ تھینکس ٹو اسفند وہ پہلے ہی سب جانتا ہے۔سو سوری میں آپ کی بالکل مدد نہیں کر سکتی۔

ڈیڈ کا چہرہ مارے ضبط کے سرخ ہو رہا تھا۔

نام کیا ہے اس کا؟آواز میں دبدبا تھا۔

میرا نام ابھی اپنے گھر والوں کے سامنے مت لینا۔) ابھی نہیں بتا سکتی۔ لیکن آئی پرامس جلد بتا دوں گی۔ ہاں اتنا یقین) رکھیں۔ وہ اسفند سے زیادہ قابل اور امیر ہے۔ اتراتے ہوئے اس نے ڈھٹائی سے کہا تھا۔

اپنا سامان باندھو اور چین جانے کی تیاری کرو۔ میں تمہارے انکل کو کال کر رہا ہوں۔ انہیں اس بات سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ کہ وہ جس کے بارے میں بات کر رہی تھی۔ کتنی ملز کا مالک تھا۔ اور دیکھنے میں کیسا تھا۔

اسفند اکرام جو تھا۔ وہ اس ملک میں شائد کوئی نہ ہوتا۔ اور اپنی احمق اولاد کی وجہ سے وہ ہرگز اسے کھو نہیں سکتے تھے۔

نتاشا جواب میں مسکرا دی۔ (میں وہاں بھی آسکتا ہوں مائی ڈئیر) ذریت کا دیا ہوا۔ عتماد ہی تھا۔ کہ جواب میں مسکرا کر شانے ہلا گئی۔

ایز یو وش مائی ڈئیر ڈیڈی۔۔۔ اتنا بول کر وہ وہاں رکی نہیں تھی۔ بلکہ ہنستی سیڑھیاں چڑھ گئی۔

:::::::::::

میں تمہیں ایک بات سمجھا رہا ہوں۔ دوبارہ مجبور مت کرنا کے سختی سے پیش آؤں۔۔۔ گاڑی چلاتے اس نے ہاتھ اُٹھا کر کہا۔ اور ساتھ میں ساتھ بیٹھی ماہ نور کو بھی دیکھا۔

ہم م! حکم دینے کے علاوہ آپ ویسے بھی کچھ نہیں کرتے۔ چلیں بولیں میں سُن رہی ہوں۔ ہر بات کا جواب دینا تو اس پہ فرض ہو چُکا تھا گویا۔ ذرا ہو جو وہ اس سے ڈرتی ہو۔ اور وہ جانتا تھا۔ کہ اتنا اعتماد کس بنا پہ تھا۔ دادی اور آپی دونوں نے اسے سر پہ چڑھا رکھا تھا۔

ماہ نور بی بی میری بات دھیان سے سُنو۔ آئندہ اگر اتنے دن کی چُھٹی پہ گئی ناں۔ تو باقی کا ماندہ سامان بھی پیچھے ہی بھجوا دوں گا۔ رہنا پھر ادھر ہی ہمیشہ۔ تم اس گھر میں دادی کی وجہ سے ہو۔ اور اگر تم ان کی کئیر نہیں کر سکتی۔ تو بے شک اپنے گھر ہی رہو۔ سُلگھ کر موڑ کاٹتے اس نے کہا تھا۔

ماہ نور نے اس قدر بد لیحاظی پہ ہونٹ بھینچ لئے۔ اور آنکھوں کو جھپک کر اُمڈ آنے والے آنسوؤں کو روکا تھا۔

For more visit (exponovels.com)

میں کچھ کہہ رہاہوں بات سمجھ میں آئی یا نہیں؟اس کے نہ بولنے پہ اس نے بلند آواز میں ڈھاڑ کر دوبارہ پوچھا۔توماہ نور کامپ کر رہ گئی۔اور سر اثبات میں ہلا دیا۔

ذریت نے بعد میں کچھ نہیں کہا تھا۔وہ بات کو ختم کر چکا تھا۔ماہ نور نے سر کھڑی کی جانب موڑ لیا۔تاکہ وہ ظالم اس کے چہرے کو دیکھ نہ لے جہاں اس کے الفاظ نے زخم کر دئے تھے۔

میں تو سمجھی تھی۔کہ میں ان بیس دِنوں میں آپ کی زندگی میں آپ کی عادت بن چکی ہوں۔اس لئے آپ مجھے لینے آئے ہیں۔مجھے تو لگا تھا۔کہ میں جو آپ کے آفس سے واپس آنے کی سارا سارا دن منتظر رہتی ہوں۔دادی سے آپ کے بچپن کی باتیں فرمائش کر کے سُنتی ہوں۔مزاق مزاق میں ن آپ کو چڑاتی ہوں۔اس سب نے آپ کی زندگی کو میرے لئے ضرور نارمل بنا دیا ہو گا۔لیکن آپ۔۔۔آپ تو ابھی بھی ویسے ہی سب عورتوں کو ایک ہی ترازو میں تولنے میں لگے ہوئے ہیں۔

ذریت آپ کو اس طرح کے خشک رویئے کی اس قدر عادت ہو چکی ہے۔کہ آپ جب بولتے ہیں تو مقابل کو کاٹ کر رکھ دیتے ہیں۔آپ کے الفاظ تکلیف دیتے ہیں۔مگر آپ اس سب کے بعد خود سکون سے سو جاتے ہیں۔اور میں ساری رات صوفے پہ کروٹیں بدل بدل کر سوچنے میں گزار دیتی ہوں۔میں نے جس میدان کو آسان سمجھ کر شرط لگائی تھی۔وہی موت کا کنواں نکلا۔خود سے مخاطب ہوتے۔اس نے ساری باتیں ذریت سمجھ کے کی تھیں۔اور جب گھر کے گیٹ کے سامنے اس ظالم نے ہارن بجایا تو وہ سیدھی ہوئی۔

اُترنے سے پہلے اس نے مڑُ کر اسے دیکھا تھا۔جو شائد موبائل اُٹھا رہا تھا۔

:::::::::::

آپی ان کا کہنا ہے۔کہ عورت نام ہی دھوکے کا ہے۔

تو آپی ان سے آپ پوچھیں کہ اُن مردوں کا کیا۔جو عورت کو لباس کی طرح بدلتے ہیں۔جو عورت کو پاؤں کی جوتی سمجھتے ہیں۔جن کی نظر میں عورت نام ہی محض رسوائی کا ہے۔۔اور اگر جواب میں وہ کہیں کہ مرد ایک جیسے نہیں ہوتے۔تو

For more visit (exponovels.com)

آپ بھی کہیئے گا۔ کہ تمام عورتیں بھی ایک سی نہیں ہوتیں۔ آنسوں کو روکتے اس نے کہا تھا۔ مریم آپی گہرہ سانس لے کر رہ گئیں۔

ماہ نور رومت میری جان۔۔۔ مجھے گیلٹ ہونے لگتا ہے۔ میں نہیں جانتی تھی کہ میرا بھائی ایسا بھی بول سکتا ہے۔ میں نے اور دادی نے اس کی تربیت ایسی بالکل بھی نہیں کی تھی۔ میں۔۔۔ میں بہت شرمندہ ہوں۔ اتنی شرمندگی تو شائد ہی کہیں اُنہوں نے اُٹھائی ہو۔ اس لئے آنسوان کی آنکھوں میں بھی چمکنے لگے تھے۔

ہم مم ! آپ کے افسوس سے کیا ہوگا۔ میری زندگی مذاق ضرور بن گئی ہے۔ اور میں یہ سب آپ کو شرمندہ کرنے کے لئے ہر گز نہیں بول رہی پلیز آپ شرمندہ مت ہوں۔ وہ ابھی ابھی گھر آئی تھی۔ اس نے ابھی دادی جان سے مل کر کمرے کا رُخ ہی کیا تھا۔ جب اس کا موبائل بجا تھا۔

مریم آپی رات میں اکثر اسے کال کرتی تھیں۔ حال احوال کے بعد وہ اس سے ذریت کے روئے کی بابت استفسار کرنے لگیں تو اس نے بھی چُھپانا مناسب نہیں جانا تھا۔ بے شک ذریت لاکھ اسے منا کرتے۔ مگر اس کی بہن کو پتا ہونا چاہیے کہ وہ کای کر رہا تھا۔ اس لئے اس نے بغیر ڈرے اور گھبرائے سب بتا دیا تھا۔ اچھا تم اب رونا مت۔۔۔ میں اسے بھی فون کرتی ہوں ابھی۔ تم اب آرام کرو۔ صبح وہ تمہیں تمہارے قدموں میں بیٹھا نہ ملے تو بے شک میرا نام بدل دینا۔ آخر میں اُنہوں نے بات کو مزاح کا رنگ دیا تو۔ وہ بھی دھیمے سے مسکرا دی تھی۔ اگرچہ مسکرانے کو دل نہ چاہتا تھا۔

....

نتاشا میں نے تمہیں منا بھی کیا تھا۔ کہ ابھی اس سب کے بارے میں کسی کو مت بتانا۔ اس کے سامنے بیٹھے اس کا ہاتھ پکڑے وہ کہہ رہا تھا۔ جبکہ نتاشا مزے سے کافی کے گھونٹ بھر رہی تھی۔ ساتھ وقفے وقفے سے اسے دیکھ کر مسکرا بھی دیتی۔

ذریت میں بھئی زیادہ دیر چُھپا نہیں سکتی تھی۔ اس لئے بتا کر پہلے ہی ان کا مائنڈ سیٹ کر دیا۔ اب وہ مجھے دھمکی دے رہے تھے۔ کہ مجھے چین بھیج دیں گے۔ مگر میں نے پروا نہیں کی۔ تم جو میرے پاس ہو گے۔ تو پروا کیسی۔

نتاشا میں نے تمہیں بتایا بھی ہے۔ کہ میرے ایک انکل بیمار ہیں میں ان کو اس حال میں چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتا۔ سوری۔۔۔ روکھائی سے کہہ کر اس نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔

نتاشا کو اپنا ہاتھ خالی ارو سونا لگنے لگا تھا۔ اس نے خود جھٹکے سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

ذریت تم م۔۔۔ میرے ساتھ ایسے نہیں کر سکتے۔ تم جانتے ہو میں نے سب کچھ تمہاری وجہ سے چھوڑا ہے۔ اب تم بہانے نہیں بنا سکتے اس کا رونا ذریت کو سکون دے گیا تھا۔ وہ سر جھٹک گیا۔

تم نے کوئی قربانی نہیں دی میرے لئے۔ اس بات کو اپنے ذہن میں بیٹھالو۔ کہ میں انکل کو چھوڑ کر کہیں نہیں جانے والا۔

اور اگر انکل نے میری شادی وہاں اپنے بیٹے سے کر دی تو؟ اندر کا خوف جاگ اُٹھا تھا۔ وہاں جانے کا مقصد وہ اچھے سے سمجھتی تھی۔

اوکم آن نتاشا! مجھے نہیں لگتا کہ وہ اتنے بے وقوف ہوں گے۔ خیر تم خود دیکھ لو۔ ویسے میرا مشورہ ہے۔ کہ تم چلی جاؤ میں تمہیں وہاں سے لے آؤں گا۔ پھر ہم شادی کر لیں گے۔ وہاں بیٹھے بیٹھے ذہن نے نہ جانے کیا بات سُمجھائی تھی۔ کہ وہ کہہ گیا تھا۔ نتاشا پُر سکون ہو گئی۔

ٹھیک ہے۔ مگر جلدی آنا۔۔۔ تم جانتے ہو میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اس کے ہاتھ میں اب بھی ذریت کا ہاتھ تھا۔ جواب میں ذریت نے سر اثبات میں ہلایا۔ اور اُٹھا کھڑا ہوا۔ ابھی میں جا رہا ہوں۔ کل بات ہو گی بائے۔ وہ ابھی کچھ دیر پہلے ماہ نور کو چھوڑ کر خاص طور پہ نتاشا سے ملنے آیا تھا۔ اب کافی پی کر اس کی فضول باتیں سُننے سے زیادہ مناسب گھر جانا ہی تھا۔ سو وہ اُٹھ گیا۔ تو نتاشا بھی سر ہلاتی ساتھ ہی اُٹھ گئی۔

مہندی سے اٹے ہاتھوں کو فضاء میں بلند کئے اس نے کندھے کو ذرا جھٹکا دے کر ڈھلکتے آنچل کو سنبھلا اور سہج سہج کر قدم اُٹھاتی سڑھیاں اُتری۔

گھر بھر میں مہمانوں کے شور و غوں غاں نے اس کے تنے عصاب پہ اور بُرا اثر ڈالا تھا۔ پھوپو کی شادی کا غم جہاں اسے ہلکان کیئے دے رہا تھا۔ وہیں ایک نئ مصیبت نے اس کے گھر کا رستہ دیکھ لیا تھا۔

کاشف نے شادی کے تین روز سے اس کا جینا حرام کر دیا تھا۔ وہ جب گزرتی وہ مسکرا دیتا۔ جہاں دیکھتا سر سے اشارہ کر کے اس کی تیاری کی داد دیتا۔ بلکہ ابھی ابھی اس نے بے غیرتی کے سب ریکارڈ توڑتے ہوئے اپنی ہی بہن کے سامنے منہ پھاڑ کر اسے ایک حسین و دلکش عورت کا خطاب بھی دے دیا۔ یوں جیسے وہ تو بس اسی ایک خواہش کے پیچھے ہلکان تھی۔ کہ محترم کاشی صاحب اس کی تعاریف میں چند قصیدے کہیں۔ غصے اور چڑھ سے اس کا دل چاہ رہا تھا۔ کہ سارے گھر کی حالت خراب کر دے۔ اوپر سے امی جی کی خامخواہ کی گھوریاں۔ اُنہوں نے شادی پہ ماہ نور کو بھی بلانے نہیں دیا۔ اس نے کتنی ضد کی تھی۔ کہ اسے اس کی بہترین دوست کو بلانے کی اجازت دے دی جائے۔ مگر انہوں نے یہ کہہ کہ ٹال دیا۔ کہ وہ اپنی ناک نہیں کٹوانا چاہتیں۔ اس کے پیچھے کیا لوجک تھی۔ یہ اس کی سمجھ سے باہر تھا۔ سو وہ کلس کر رہنے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکی تھی۔

ریہانہ! پھوپو جی کے لئے دودھ لے کر جاؤ۔ ان کے سر میں درد ہے۔ ساتھ یہ سر درد کی دوا بھی لے جاؤ۔

پندرہ سالہ لڑکی کیچن میں برتن دھونے میں مصروف تھی۔ جب فرح کے حکم پہ دودھ گلاس میں اُنڈیلتی باہر کو چلی گئی۔

کیچن میں اب کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ اس نے کیچن میں ارد گرد دیکھا تو بہت سی کھانے کی چیزیں اسے منہ چڑھا رہی تھیں۔

ہم م م بھاڑ میں جائے مہندی۔۔۔ سر جھٹک کر اس نے سِنک سے ہاتھ دھونے میں سیکنڈ نہیں لگایا تھا۔

ہاتھ دھونے کے بعد اس نے مٹھائی کی ٹوکری اُٹھائی اور لے جا کر ڈائینگ ٹیبل پہ رکھ لی۔ خود کرسی کھینچ کر بیٹھی گلاب جامن کھانے لگی۔

بچپن میں اور کچھ ہو نہ ہو شادی پہ جا کر مٹھائی کے ڈبوں سے گلاب جامن نکال کر کھانا اس کا پسندیدہ کام تھا۔

اکیلے اکیلے۔۔۔ تیسری گلاب جامن ابھی اس کے منہ میں جانے کو ہی تھی۔ جب دروازے کی جانب سے آنے والی مردانہ آواز نے باوجود شیرے کے اس کا منہ حلق تک کڑوا کر دیا تھا۔ اس نے ناگواری سے پیس واپس ٹوکری میں رکھ کر قریب ہی پڑے ٹیشو کے ڈبے سے ایک لیف نکال کر ہونٹ تھپ تھپائے تھے۔

بے فکر رہیں امی جی سونے سے پہلے آپ کے گھر بھی ایک پلیٹ ضرور بھجوائیں گی۔ کمال ضبط سے اس نے دانت کچکچا کر کہا۔ تو مقابل اس کی حاضر جوابی پہ کھل کھلا اُٹھا۔

بہت خوب۔۔۔ اگر آپ چُپ رہتیں تو مجھے حیرت ہوتی۔

جی اور آپ اس حیرت سے مر جاتے۔۔۔ اس نے الفاظ اُچک کر مقابل کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے کہا اور پھر سبز لہنگا دائیں بائیں سے چٹکی میں اُٹھاتی دروزے سے ترچھی ہو کر نکل گئی۔ اس نے روائیتی پشاوری کڑھائی والی پیلی کُرتی کے ساتھ جامہ وار کا خوبصورت لہنگا پہن رکھا تھا۔ اور ہلکے غلابی رنگ کے آنچل سے دونوں شانے ڈھک رکھے تھے۔

تو آپ کو میرے مرنے کی فکر تھی۔ سُن کر اچھا لگا۔۔۔ وہ جو جانے والی تھی۔ پشت پہ پڑتی جلا دینے والی آواز میں بولے جانے والے جملے پہ ایڑیوں پہ گھومی تھی۔ ایسا کرنے سے اس کی پُشت پہ ڈھلکی چمبیلی کے چیدا چیدا پھولوں سے سجی چوٹی بل کھاتی اس کے بائیں شانے پہ آٹھری تھی۔

خوش فہمی ہے۔ جیسے مرضی پال لیں۔ کونسا ٹیکس لگنا ہے۔ اور میری بلا سے جو مرضی سوچو۔ کہہ کر ناک منہ چڑھاتی وہ وہاں سے اوپر پھوپو کے پاس ان کے کمرے میں آگئی تھی۔

میری زندگی میں پتہ نہیں کیوں اتنا ٹوسٹ ہے۔ مجال ہے جو میں سکون سے رہ لوں۔ بڑبڑاتے کمرے میں آتے ہی اس نے بیڈ پہ بیٹھ کر غصے میں دوپٹہ اتار کر دور اُچھال دیا تھا۔

اتنا غصہ! خیر تو ہے۔ موٹی! ہاتھوں پہ لگی مہندی پہ عرقِ غلاب لگاتے اُنہوں نے بُڑبڑاتی فرح کو دیکھ کر پوچھا تھا۔

For more visit (exponovels.com)

پھوپوا بھی آپ میرے سے بات مت کریں پلیز۔ ناگواری سے کہہ کے اس نے مڑ کر بھی ایک بار اُنہیں دیکھا تھا۔ وہ شانے اچکا کر واپس سامنے بیٹھی لڑکی کی طرف متوجہ ہو چکی تھیں۔ جو بڑی تندہی سے ان کے ہاتھ پکڑے کام میں مصروف تھی۔ فرح بھنا کر رہ گئی۔

موہی تم باہر جاناذرا پلیز۔ مجھے پھوپو جی سے بات کرنی ہے۔ اُٹھ کر ان دونوں کی کُرسیوں کے قریب کھڑے اس نے لہجے کو قدرِ ہشاش بناتے لڑکی کو ادھر سے بھگانے کی کوشش کی تھی۔

ابھی تو کہہ رہی تھی بات نہیں کرنی۔ مچلتی مسکراہٹ روک کر اُنہوں نے کہا۔ تو وہ موہی کی چھوڑی گئی کرسی پہ دھپ کر کے بیٹھ تھی۔ ساتھ ہی گہرہ سانس بھی لیا۔ جیسے تنے عصاب کو پُر سکون کرنا چاہا ہو۔

میں اس وقت مذاق برداشت نہیں کروں گی۔ اس لئے خاموش رہیں اور میری بات سُنیں۔ ان کی بات کے جواب میں اس نے ان کے پھیلے ہاتھ کو پکڑتے عرقِ غلاب گلاتے ہوئے کہا۔ تو اسے دیکھ کر رہ گئیں۔

اندازہ ہے۔ کہ یہ میرے جانے کے غم سے موڈ خراب نہیں لگتا۔ اس کے جھکے سر اور ماتھے پہ موجود سیکڑوں بلوں کو دیکھ کر اُنہوں نے پوچھا تو وہ اسی پوزیشن میں آہستہ سے سر ہلا گئی۔

سہی اندازہ ہے۔

پھر بتاؤ کیا ہوا ہے۔؟

آپ کے خاندان کے لوگوں نے میرا جینا حرام کر دیا ہے۔ آپ کا وہ اوباش کزن کاشف، وہ سٹوپڈ سی اس کی بہن اور سو کالڈ چچی جان نے میرا جینا حرام کر چھوڑا ہے۔ حرام ہے مجھ پہ جو میں سکون سے کچھ کھا بھی پائی ہوں۔ اس کے لہجے میں غصہ دیکھ کر وہ گہرہ سانس لے کر رہ گئیں۔

اچھا! کاشف نے کیا کہا ہے؟

وہ۔۔۔(منہ میں بڑابڑاتے)واہیات قسم کی گفتگو کرتا ہے جب میں سامنے سے گزرتی ہوں۔بتاتے ہوئے پھوپو کو وہ وہی پُرانی معصوم سی فرح لگ رہی تھی۔جسے بچپن سے اب تک اُنہوں نے ماؤں کی طرح

پالا تھا۔اُنہوں نے اس کے سامنے سے ہاتھ کھینچ لیا۔

فرح نا سمجھی سے اُنہیں دیکھنے لگی۔

فکر مت کرو۔میں بات کرتی ہوں اس سے بھی اور بھابھی سے بھی۔اور اگر کسی اور کو بھی تم سے کوئی تکلیف ہے۔تو اس کا بھی بتاؤ۔چہرے پہ نرمی کا شائبہ تک نہ تھا۔فرح کے حلق میں کچھ اٹکا۔وہ اُٹھ کے ان کے پاؤں میں بیٹھ گئی۔

پھوپو جب آپ چلے جائیں گی۔تب میرا کیا ہوگا۔میری تو ماں کے پاس بھی فُرصت نہیں ہوتی میرے لئے۔کجا کے اپنا غم ان سے بانٹنا۔پھوپو میں جب سے لاہور سے آئی ہوں۔چچی جان بات بے بات عجیب وغریب سے شک میں اُلجھے طعنے مارتی ہیں۔سامنے کی بوا آ کے مجھے پہ انگلی اُٹھاتی ہے۔اور آپ ہر بار مجھے بچا لیتی ہیں۔میری سامنے بیٹھی ماں خاموش رہتی ہے۔اور جب میں اپنے حق میں کچھ بولتی ہوں تو وہ مجھے ڈانٹ دیتی ہے۔پھوپو آپ کے جانے کے بعد میرا کیا ہوگا۔ان کے گھٹنوں پہ ہاتھ رکھے۔آنکھوں میں آنسو لئے وہ لپسٹک سے پاک ہونٹ کاٹتی پوچھ رہی تھی۔زہرہ جو کافی دیر سے آنسو روکے ہوئے تھیں۔ہونٹ بھینچ کر رہ گئیں۔

فری میری جان۔۔۔شادی کر کے جارہی ہوں۔آؤں گی۔ہمیشہ کے لئے تھوڑی جارہی ہوں۔بے فکر رہو۔کوئی کچھ بھی کہے مجھے بتانا۔میں ہوں ناں۔فون بھی ہے۔بے فکر رہو۔۔۔جھک کر اس کے گال پہ بوسہ لے کر اُنہوں نے حوصلہ دیا تھا۔فرح کے آنسو اور تیزی سے بہنے لگے۔

پھوپو آپ ابھی رک جائیں تھوڑی دیر۔ابھی تو میں چھوٹی ہوں۔میں آپ کی فرح آپ کے بغیر کیسے رہے گی۔فرح کو نہ جانے کیا ہونے لگا تھا۔وہ ایک دم سے سر نفی میں ہلاتی ان کا گھوٹنا ہلاتی گویا ضد کر رہی تھی۔پھوپو نے ہونٹ بھینچ لئے۔

فری اگر میں مزید اس گھر میں رکی تو تمہاری ماں اور چاچی مجھے بوجھ سمجھنے لگیں گی۔اور میرے بھائی بے سہارہ۔۔۔مجھے اب ایک مضبوط بیک کی ضرورت ہے۔کاش کہ ایسا ہوتا جیسا تم کہہ رہی ہو۔کچھ روز پہلے کے بڑی بھابھی کے کہے جملے ایک بار پھر سے ان کے کانوں میں گردش کرنے لگے تھے۔

بوا مجھے خوف ہے۔کہ کہیں زہرہ فرح کو بھی اپنے جیسا نہ بنا لے۔اور اب بھی زہرہ کی شادی نہ ہوئی۔تو آپ جانتی ہیں لوگ ہم ہی پہ انگلی اُٹھائیں گے۔اور کل کلاں کو جب میری لڑکی کی باری آئے گی۔تو میں نہیں چاہتی کہ مجھے اس کے معملے میں مصیبت اُٹھانی پڑے۔بیٹی کو اپنے بیٹے کا قاتل سمجھنے والی بڑی بھابھی اس اپنی نند کے بارے میں گفتگو کر رہیں تھیں جس نے ان کی بیٹی کو ہر گرم سرد سے بچانے کی ہر ممکن اور ناممکن کوشش کی۔جس نے محض پانچ سال کے فرق کے با وجود اسے ماں بن کر تربیت دی۔اور جس کی اپنی تربیت وقت نے اس قدر شاندار کی تھی۔کہ اب فرح کو کسی اور کی تربیت کی ضرورت نہ تھی۔وہ عورت نہ جانے کیوں ان سے خار کھائے بیٹھی تھیں۔۔۔اور زہرہ جو سمجھیں تھیں۔اس نے ان کے دل کو خون کے آنسو رلا دیا تھا۔حسد۔۔۔حسد تھا اُنہیں کے زہرہ نے ان سے ان کی بیٹی چھین لی تھی۔اسی جلن نے انہیں ایک ان دیکھی آگ میں جلا کر راکھ کر دیا تھا۔جس میں سے اب چنگاریاں نکل رہی تھیں۔اور اسی خوف کو محسوس کرتے اُنہوں نے شادی کو ہی بہتر حل جانا تھا۔

پھوپو۔۔۔امی جی ایسی کیوں ہیں۔انہیں میرا خیال کیوں نہیں آتا۔انہیں میری فکر کیوں نہیں ہے۔میں ایک بیٹی ہوتے ہوئے کیوں ان سے ضد نہیں کر سکتی۔کیوں انہیں اپنا غم نہیں بتا سکتی۔کیوں نہیں کہہ سکتی۔کہ امی میں۔۔۔میں ایک انجان شخص کے ہاتھوں تین ماہ تک بلیک میل ہوتی رہی ہوں۔امی مجھے چچی تنگ کر۔۔۔روتے ہوئے وہ جو منہ میں آتا جا رہا تھا۔بولے چلے جا رہی تھی۔جب تیزی سے کھولتے دروازے کی دھاڑ پہ وہ چونک گئی۔پھوپو بھی حیرت کو چھپاتیں بھابھی بیگم کو دروازے میں دیکھ کر اُٹھ کھڑی ہوئیں تھیں۔اور فرح اُنہیں۔۔۔

سبز رنگ ریشمی سوٹ پہ گرم نفیس چادر اُڑھے۔آنکھوں میں شرارے بھرے وہ ان دونوں کو کھا جانے والی نظروں سے گھور رہی تھیں۔

فرح بی بی تو یہ دیا ہے۔ تم نے ہم لوگوں کو ہمارے یقین کا صلہ۔ نکلی ناں پھر اسی جیسی جس کی تربیت کا اثر تھا۔ ان کی نظر میں پھوپو کے لئے نفرت ہی نفرت تھی۔ زہرہ پھوپو کی نظر جُھک گئی۔

امی جی آپ۔۔۔ آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔ اسے سمجھ نہیں آرہی تھی۔ کہ وہ کیا کہے۔

تم اپنے ساتھ جو گند لائی ہو۔ اس کا جواز دو بس۔ اس سے پہلے کے بات تمہارے باپ چچا تک پہنچے اس کے کچھ بھی سمجھنے سے پہلے اُنھوں نے اسے کھینچتے، گھسیٹے دروازے کی طرف لے کر جاتے سختی سے کہا تھا۔ فرح کے ہونٹ سل گئے۔ اور پھوپو ڈِھ سی گئیں۔

::::::::::::

نیم اندھیرے میں سوندھی رچی بسی خشبو اور تازہ کیئے گئے شیمپو کی خشبو نے اندر داخل ہوتے ہی اس کو اپنی جانب متوجہ کیا تھا۔ وہ ایک لمبا سانس لے کر کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ اور جائزہ لیتے بیڈ پہ رضائی کے نیچے دُبکے وجود پہ اس کی نظر سب سے پہلے گئی تھی۔

ماہ نور دنیا اور مافیا سے بے خبر سو رہی تھی۔ اور اس کی شرارتی اور معصوم لٹیں کمرے کے وسط میں کھڑے وجود کو دیکھ کر آنکھیں پٹپٹا رہیں تھیں۔ اور مسکرا رہی تھیں۔

ذریت نے آگے بڑھ کر اس کے چہرے سے رضائی ہٹادی۔ اس نے دونوں ہاتھوں کی مُٹھیاں بالکل کسی بچے کی طرح بنا رکھی تھیں۔ اور ٹانگوں کو اکٹھا کیئے وہ شائد باوجود موٹی رضائی کے سردی محسوس کر رہی تھی۔ ذریت نے خاموشی سے ایک نظر اس چہرے پہ ڈالی۔ جہاں دنیا جہان کی معصومیت سموئے اسے اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ اور پھر اس نے ایک جھٹکے سے رضائی برابر کر دی۔ اور جیب سے سیگرٹ نکالتا ٹیرس پہ جا نکلا۔

زندگی کا سکون، آرام اچھی نیند سب اس ایک لڑکی کے آنے کی وجہ سے غارت ہو چکا تھا۔ وہ باوجود کوشش کے اسے اگنور نہیں کر پا رہا تھا۔ وہ شادی کے اس عرصے میں جان چکا تھا۔ کہ ماہ نور ان عورتوں میں سے بالکل بھی نہیں ہے۔ جو دعوتوں میں شہد کی کھیوں کا کام دیتی ہیں۔ وہ ماہ نور نتاشا کو آپس میں کمپئیر کر چکا تھا۔ اور وہ زیادہ وقت گھر پہ نہ رہنے کے

باوجود بھی جانتا تھا۔ کہ ماہ نور کی روٹین کیا تھی۔ وہ جانتا تھا۔ کہ اس کی غیر موجودگی میں گھر میں ظفر کا آنا جانا بھی ماہ نور نے کم کر دیا تھا۔اور جب سے وہ خود کیچن میں جانے لگی تھی۔ ظفر کو وہاں سے بھی بھیج دیتی تھی۔وہ طفر کی موجودگی کی بنا پہ ہنستی بھی کم تھی۔ سر کو زیادہ تر ڈھامپ کے رکھتی تھی۔اور جب بولتی تھی۔ تو ہر قسم کے احساس سے آری ہو جاتی تھی۔ یہ تھی وہ ماہ نور جسے اس نے سمجھا تھا۔ جبکہ دوسری طرف نتاشا تھی۔ ہر وقت اپنی کو خوبصورتی کو کیش کروانے والی۔ خود غرض اور بے حس

۔آرٹیفشل سی۔ ذریت کو دونوں میں زمین آسمان کا فرق نظر آیا تھا۔ مگر عجیب اس کے ساتھ یہ ہوا تھا۔ کہ اس کے اور ماہ نور کے درمیان ایسی دوستی نہیں تھی۔اور بے گانی اور دوری اتنی زیادہ تھی۔ کہ کے باوجود خواہش کے وہ اس سے اپنے مسائل نہیں شئیر کر پار ہا تھا۔ وہ نتاشا سے جان نہیں چھوڑوا پار ہا تھا۔

سیگرٹ کا کش لگاتے اس کی نظر سامنے خالی آسمان پہ تھی۔ جبکہ دل اور سوچ کہیں غائب۔ کہاں تھی۔ یہ وہ نہیں جانتا تھا۔ ہاں اتنا ضرور جانتا تھا۔ کہ اس وقت اس کے پاس موجود نہیں تھی۔

فون کی بجتی گھنٹی کو سُن کے اس نے جیب سے فون نکالا تھا۔ سامنے ہی سمارٹ فون پہ چمکتے ابرار کے نام کو پڑ کر اس نے تیزی سے سیگرٹ زمین پہ پھینک کر بوٹ سے مسلا اور کال اٹنڈ کر کے موبائل کان سے لگایا۔

:::::::::::::::

ماہ نور گہری نیند میں تھی۔ جب کسی کے جھنجوڑنے پہ وہ دہل کے اُٹھ بیٹھی۔اور مندی مندی آنکھوں سے ملگجے اندھیرے میں دیکھنے لگی۔ سامنے ہی ذریت کھڑا تھا۔ماہ نور اندھیرے کی وجہ سے اس کے چہرے کے تاثرات پڑھ نہیں پار ہی تھی۔ البتہ کسی انہونی نے اس کے اندر کی عورت کو سہا ضرور دیا تھا۔ وہ رضائی ہٹاتی۔ اُٹھ گئی۔ اس کے تازہ شیمپو کئے گئے بال بکھرے پڑے تھے۔ گلے میں لپٹے سکارف پہ بل پڑ چکے تھے۔اور لباس بھی کچھ دیر پہلے تبدیل کیا ہوا معلوم نہ ہوتا تھا۔

ج۔۔۔جی! اسے لگا اس کی آواز کسی کھائی سے آرہی ہے۔

ماہ نور انکل!۔۔۔انکل۔نہ۔۔۔ نہیں رہے۔ذریت حسن سے بھی بولنا مشکل ہوا تھا۔

ماہ نور کی آنکھیں پھیل گئیں تھیں۔اس کے ہونٹ ساکت ہوئے۔اور جسم گویا ہوا میں مُنجمد ہو گیا تھا۔اس ایک لمحے میں ذریت نے اسے انسان سے برف کا مُجسمہ بنتے دیکھا تھا۔

اس کی آنکھوں میں جو وحشت اور بے یقینی تھی۔اس نے ذریت کو ڈرا دیا تھا۔

اس نے ماہ نور کا ہاتھ پکڑنا چاہا مگر ماہ نور۔۔۔

دل کا بند ہو جانا۔سانس کا رک جانا۔زمیں کا تھم جانا کیا ہوتا ہے۔یہ اس لمحے وہ سمجھ گئی تھی۔

کچھ دیر پہلے وہ ان سے مل کے آئی تب وہ ٹھیک تھے۔ان سب نے مل کے کھانا کھایا تھا۔

وہ ذریت کے آنے پہ خوش ہوئی تھی۔اور وہ جانتی تھی۔کہ بابا اسے دیکھ دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔

اس کا وجود ہوا میں ایک لمحے کے لئے معلق سا ہو گیا تھا۔اور پھر کی زمین چل پڑی تھی۔زمین نے اپنا چکر اس قدر تیزی سے کاٹا تھا۔کہ وہ چکراتے سر کے ساتھ زمین پہ بیٹھتی چلی گئی۔

ماہ نور۔۔۔ذریت بے اختیار ہی بول اُٹھا۔اور وہیں گھٹنوں کے بل اس کے قریب بیٹھ گیا۔ماہ نور کے دونوں گھٹنے فرش کو چھو رہے تھے۔اور آنکھوں میں بے یقینی تھی۔

ذ۔۔۔ذریت م۔۔۔میرے۔۔۔میرے بابا۔لفظ اس کے منہ سے ادا نہیں ہو پا رہے تھے۔

ذریت نے اس کی آنکھوں میں بے بسی دیکھ کر ہونٹ بھینچ لئے۔اور ماہ نور بُھر بھوری مٹی کی مانند بکھرتی چلی گئی۔

میرے بابا نہیں جا سکتے۔نہیں وہ مجھے چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔

نہیں اللہ پلیز میرے بابا مجھ سے مت لیں۔اللہ مجھے اس امتحان میں مت ڈالیں۔ذریت میرے بابا مجھے لا دو۔مجھے ان کے پاس چھوڑ آؤ۔وہ بلند آواز میں رونے کی کوشش کر رہی تھی۔مگر غم کی شدت اس کے ذہن پہ اثر ڈال رہی تھی۔اور باوجود کوشش کے وہ ایک لِمٹ سے زیادہ اونچا نہیں بول پا رہی تھی۔اس کی آنکھوں سے آنسو بھل بھل بہہ رہے

تھے۔اور وہ اپنے دونوں ہاتھ زمین پہ بیچھے قالین پہ زور زور سے مار رہی تھی۔بکھر بال اور بکھر گئے۔اور رونے میں شدت کے ساتھ ساتھ بے بسی بھی در آئی جیسے اپنی قیمتی چیز کو ہمیشہ کے لئے کھوتے وقت انسان کی یہی حالت ہوتی ہے۔

ماہ نور صبر۔۔۔صبر کرو۔اللہ کی مرضی اسی میں تھی۔وہ بس اتنا ہی بول پایا تھا۔نیم اندھیرے میں ماہ نور پہ نظر پڑتے ہی اسے اپنے الفاظ کھوکھلے لگنے لگے تھے۔

میرے بابا۔۔۔

میں اب ان کو کیسے دیکھوں گی۔اب میری باتیں کون سُنے گا۔اللہ پلیز میرے بابا کو زندہ کر دیں۔اللہ میں ان کے بغیر مر جاؤں گی۔روتے ہوئے وہ ہذیانی انداز میں چیخ رہی تھی۔

ذریت نے بڑھ کر اس کا سر اپنے کندھے سے لگا لیا۔

!ماہ نور صبر

صبر کرو۔اللہ کی مرضی جو ہو۔وہی ہوتا ہے۔آذر کے مرنے کے بعد اسکی حالت کیا ہوئی تھی۔یہ صرف وہی جانتا تھا یا اس کا اللہ۔۔۔اور اب ماہ نور کی حالت دیکھ کر اسے آذر پھر سے یاد آنے لگا تھا۔اسے لگا۔جیسے اس نے بھی آذر کو آج ہی کھویا ہے۔

میں کیسے صبر کر لوں۔۔۔میں نے ان کے ساتھ کھانا کھایا تھا۔اتوار کے روز انہوں نے آنے کا وعدہ کیا تھا۔

اب۔۔۔اب وہ وعدہ خلافی کر گئے ہیں۔

ذریت آج میں نے۔۔۔میں نے اللہ سے ان کی لمبی عمر کی دعا نہیں کی۔میں بھول گئی تھی۔اور۔۔۔

اور دیکھو کیا ہو گیا۔دونوں ہاتھوں کو قالین پہ متواتر مارتے وہ چیخنے کی کوشش کر رہی تھی۔مگر ہائے۔۔۔

بے بسی سی بے بسی۔

For more visit (exponovels.com)

ماہ نور روتے ہوئے سر اس کے کندھے پہ پٹخ رہی تھی۔ اس کا باپ۔۔۔ اس کا دوست اس کا مدد کرنے والا۔ سب کچھ ایک جھٹکے میں اس سے چِھن چکا تھا۔ اور وہ یقین اور بے یقینی کے درمیان کہیں بیچ میں معلق ہو چکی تھی۔

اور پھر اسے لگا زندگی اس کے لئے رکتی چلی گئی ہے۔ یا یوں جیسے زمین ساکت ہو گئی ہو۔

چار دن بعد

رات کا سناٹا پھیل چکا تھا۔

یہ رات کا دوسرا پہر تھا۔ اور ہسپتال کے اس کمرے میں مرگ کی سی خاموشی تھی۔ جس کے سٹریچر پہ لیٹے سفید لحاف میں لپٹے وجود نے آنکھیں کھولی تھیں۔

پانی۔۔۔

پا۔۔۔پانی !

ماہ نور کی آواز پہ ذریت کو کچھ دور صوفے کی پُشت سے سر ٹکائے نیند میں تھا۔ ہڑ بڑا کے اُٹھا تھا۔

ماہ نور کی نیم وا آنکھیں دیکھ کے اسے کتنی خوشی ہوئی تھی۔ کاش اس وقت کوئی اس سے پوچھتا۔ وہ تیزی سے اس کی جانب بڑھا تھا۔

ماہ نور اب تم کیسی ہو۔؟ میں ڈاکٹر کو بلاتا ہوں۔ وہ اس کے بیڈ کی پائنتی کے قریب کھڑا تھا۔ اور چہرے سے معلوم ہوتا تھا جیسے کئی گھنٹوں سے سویا نہ ہو۔

پا۔۔۔پانی۔۔۔ میرا گلا۔ اپنے گلے کو دباتے وہ لڑ کھڑاتے ہوئے پانی مانگ رہی تھی۔ ذریت سمجھ کر تیزی سے پانی کا گلاس بھر لایا۔ اور اسے کندھے سے سہارہ دیتے گلاس اس کے ہونٹوں سے لگایا۔

ذریت بابا، بھائی وغیرہ کہاں ہیں۔ میں کب سے ادھر ہوں۔؟ آنکھوں میں آنے والی نمی کو بار بور ہاتھوں کی ہتھیلی سے رگڑتے وہ پوچھ رہی تھی۔ ذریت اس کے سامنے صوفے پہ بیٹھا دونوں کہنیوں پہ وزن ڈالے آگے کو جُھکے ہوئے تھا۔ اس کے بار بار ہاتھ کی ہتھیلی سے نمی صاف کرتا دیکھ کر اُٹھا اپنا رومال اسے دے دیا۔

ماہ نور نے بھی پکڑ لیا۔

بتایا نہیں آپ نے۔۔۔اس کے جواب میں خاموش رہنے پہ وہ استفسار کر رہی تھی۔

ماہ نور۔۔۔ماہ نور تم سو جاؤ۔ صبح ہم ان کو بلا لیں گے۔

نہیں مجھے نہیں سونا۔ مجھے نیند نہیں آرہی۔ منہ بنا کر اس نے کہا تھا۔

اچھا۔۔۔ابھی تم کچھ کھاؤ گی؟ آج دادی جان نے تمہارے لئے اپنے ہاتھوں سے کھانا بنا کر بھیجا تھا۔ نرمی سے بولتے ہوئے وہ اس کے قریب چلا آیا تھا۔ جب تک اسے خود یاد نہیں آنا تھا۔ کہ انکل اب نہیں رہیے اسے لگا اسے بھی یاد نہیں دلانا چاہیے۔

آپ بس بابا کو بلا دیں پلیز! میرا دل بہت گھبرا رہا ہے۔ آنکھوں میں اُمڈتی نمی کو رومال سے صاف کرتے اس نے مسکرانے کی کوشش کی تھی۔ ذریت نے ہونٹ بھینچ لئے۔

ماہ نور سو جاؤ۔۔۔ تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔ صبح بات ہو گی۔ اس کے بالوں میں آہستہ آہستہ ہاتھ چلاتے وہ اسے سہلا رہا تھا۔ اور ماہ نور کی بند آنکھوں سے باوجود ضبط کے آنسو قطار کی صورت نکل نکل کر اس کی گردن سے نیچے بستر میں جزب ہوتے جا رہے تھے۔ ذریت نے نرمی سے آنسو اپنی پوروں میں چُن لئے۔

ایک تو۔۔۔ پتہ نہیں یہ۔۔۔ یہ آنسو کیوں بار بار آرہے ہیں۔

آپ۔۔۔ آپ پلیز م۔۔ میرے۔۔۔ میرے بابا کو کال کر کے بلا دیں۔ مجھے ان سے ملنا ہے۔ مجھے لگ رہا ہے۔ مین کافی دیر سے ملی نہیں۔ گالوں کو رگڑتے وہ بیچارگی کی انتہا پہ تھی۔ ذریت اس کے قریب وہیں بیڈ پہ بیٹھ گیا۔

ماہ نور جب میں کہہ رہا ہوں۔ کہ سو جاؤ۔ تو شاباش سو جاؤ۔ صبح ہوتے ہی سب آ جائیں گے۔ اب کی بار اس نے جانبوجھ کے لہجے کو سخت بنا لیا تھا۔

سب نہیں صرف۔۔۔ صرف میرے بابا۔ وہ ابھی بھی اسی ضد پہ تھی۔ ذریت گہرہ سانس لے کر رہ گیا۔

ماہ نور آنکھیں بند کرو۔ میں چاہتا ہوں تم کچھ دیر سو جاؤ۔ اس کی آنکھوں کے پٹوں کو اس نے اپنی ہتھیلی سے بند کرنا چاہا تھا۔

ذ۔۔۔ ذریت میرے با۔۔۔ بابا ٹھیک تو ہیں ناں۔۔۔ میں۔۔۔ میں نے ایک خواب دیکھا تھا۔ بہت بہت بُرا خواب۔ ذریت تمہیں پتہ میرے بابا۔۔۔

میرے بابا مر گئے تھے۔ ذریت وہ مجھے چھوڑ کر چلے گئے تھے۔

ذریت کہو یہ جھوٹ ہے۔ وہ ایک بار پھر سے ہذیانی انداز میں چیختے ہوئے التجا کر رہی تھی۔ اس کی بگڑتی حالت کے پیشِ نظر ذریت کو اسے کندھوں سے پکڑ کر واپس بیڈ پہ لٹا دیا۔ اور اس کے شل ہوتے عصاب دیکھتا کمرے سے نکل گیا۔

ڈاکٹر۔۔۔ ڈاکٹر میرے بابا۔۔۔ ڈاکٹر اس کے سامنے کھڑی انجیکشن بھر رہی تھیں۔ اور وہ سفید تکیے پہ ڈھاڑیں مارتی سر پٹخ رہی تھی۔ ذریت سامنے ہی صوفے پہ بیٹھا بائیں ہاتھ کی مُٹھی بنائے دائیں گھٹنے پہ بازو کو کھڑا کئے مُٹھی کو ہونٹوں پہ جمائے بیٹھا تھا۔ ضبط سے اس کی آنکھیں سرخ پڑ رہی تھیں۔

ذریت آپ بہت بُرے ہیں۔ آپ۔۔۔ آپ نے مجھ سے میرے بابا لے لئے مجھے ان کے پاس جانے نہیں دیا۔ روتے ہوئے غنودگی میں جاتے وہ کہہ رہی تھی۔ ڈاکٹر نے گہرہ سانس لے اسے دیکھا۔ اور پھر مڑ کر پشت کی جانب بیٹھے ذریت کو دیکھا۔

مسٹر ذریت! ان کی ذہنی حالت بہت کشیدہ ہے۔ آپ پلیز ان کا خیال رکھیں۔ چار وز سے یہ ہوش و حواس سے بے خبر رہی ہیں۔ دو تین گھنٹوں میں ہوش آ جائے گا۔ براہِ مہربانی خیال رکھیں۔ کہ اب یہ اس ذہنی خلفشار سے محفوظ

For more visit (exponovels.com)

رہیں۔ بُردباری سے کہتے ڈاکٹر فاطمہ نے آخر میں اس ایک نظر تین روز سے جاگتے اس شخص کو دیکھا۔اور کمرے سے نکل گئیں۔

ماہ نور پانچ منٹ بعد واپس گہری نیند میں جاچکی تھی۔ ذریت نے خود کو پر سکون رکھنے کے لئے سر صوفے کی پشت سے ٹکا دیا۔اور آنکھیں موندلیں۔

:::::::::::::

والدین انسان کی زندگی کا وہ عظیم سرمایہ ہیں۔ جس کو کھونے کے بعد دنیا کی کوئی چیز قیمتی سے قیمتی بھی بے شک ہو۔اس کمی کو پورا نہیں کر سکتی۔ زندگی میں خلا آجاتا ہے۔ وہ کبھی کبھی بھی پُر نہیں ہو پاتا۔

پتہ نہیں کیوں ہم اتنے انسانوں کی محبت کے محتاج ہوتے ہیں۔ کہ جب وہ محبت اور محبت کرنے والے ہمارے پاس نہیں رہتے تب دنیا کی ہر چیز خالی محسوس ہونے لگتی ہے۔

اس نے گہرہ سانس لے کر اپنے کمرے کی بالکنی سے ڈوبتے سورج کو دیکھا۔اُڑ کر واپسی کی راہ پہ گامزن پرندوں کو دیکھا۔اور ریلنگ کی طرف آگیا۔

ابرار بھائی آپ کی کافی۔۔۔ وہ دونوں بابا کی ڈیتھ کے بعد اب گھر میں اکیلے رہ گئے تھے۔ خواتین ملازماؤں کو انہوں نے ادھر سے بھیج دیا تھا۔

سب کچھ بدل چکا تھا۔ ہر چیز پرائی اور خالی سی ہو چکی تھی۔اور وہ دونوں اس بڑے سے گھر میں بالکل اکیلے وہ گئے تھے۔

بھائی ہم ماہ نور کو کچھ دن کے لئے اپنے پاس بلالیں۔اس کے ساتھ کھڑے کافی پیتے بابر نے پوچھا تھا۔ ابرار نے سامنے کے منظر سے نظر ہٹا کر پہلو میں کھڑے بھائی کو دیکھا۔ جو بابا کی دیٹھ کے بعد سے شرارتیں کرنا بالکل چھوڑ چکا تھا۔ باتیں بھی

کم کرنے لگا تھا۔۔۔شائذان کی زندگی میں ساری رونق ہی بابا کے دم سے تھی۔اب وہ نہیں رہے تھے۔تو رونکیں بھی ماند پڑ گئی تھیں۔

ماہ نور کو ہسپتال سے آئے ایک ہفتہ ہو چکا تھا۔اُنہوں نے اس سے زیادہ ملنے کا تردد نہیں کیا تھا۔اس سے ماہ نور کی ذہنی حالت مزید خراب ہو سکتی تھی۔ویسے وہ ملنے چلے تو جاتے تھے مگر کم کم۔۔۔تاکہ وہ خود کو جلدی سنبھال لے۔اب سب کو خود ہی اُٹھنا تھا۔اللہ کی مرضی اسی میں تھی۔چاہے لاکھ محبت سہی لیکن وہ جس کے تھے وہ ان کو لے جا چکا تھا۔اور برار یہی سمجھتا تھا۔کہ ماہ نور کو اب اتنا مضبوط بننا پڑے گا۔کہ وہ خود کو خود سنبھالے۔

بابر وہ ابھی ہسپتال سے لوٹی ہے۔یہاں آئے گی تو مزید اس کی طبیعت نہ بگڑ جائے۔

نہیں کچھ ہوتا بھائی۔اب وہ پہلے سے کافی بہتر ہے۔میں کل اس سے ملنے اس کے گھر گیا تھا۔اس میں کافی تبدیلیاں رونماں ہوئی ہیں۔اور ہم کب تک اس کو ادھر آنے سے روکتے رہیں گیں۔پلیز بھائی مان جائیں۔۔۔اس گھر سے اب مجھے ڈر لگنے لگا ہے۔میرا دل نہیں لگتا ادھر۔وہ بزنس جوائن کر چکا تھا۔لاکھ میچور ہو چکا تھا۔مگر ابرار کو اس کے اندر کا چھُپا بچہ پھر بھی نظر آ گیا تھا۔

اس نے گہرہ سانس لے کر اندر کے غم کو کم کرنے کی کوشش کی۔اور سر اثبات میں ہلا کر ہاتھ میں پکڑی کافی کے گھونٹ بھرنے لگا۔نظر سامنے کی جانب تھی۔

بابر بھی پُرسکون ہو گیا۔

کاش تم آج میرے پاس ہوتی۔

کاش میں آج تمہیں ادھر دیکھ سکتا۔

کاش آج تم میرے بکھرے گھر کو سمیٹ لیتی۔

ابرار کے اندر فرح خان سے گفت وشنید جاری تھی۔ بابا کی ڈیتھ کے بعد اس نے اپنی تنہائی فرح کی یاد سے شئیر کی تھی۔ وہ لڑکی اس کی زندگی میں پتہ نہیں کیوں آئی تھی۔ اور اس کہانی کا اختتام کیا ہوگا۔ اس سے وہ بالکل انجان تھا۔

کاش فرح خان تم جان سکتی۔ کہ آج ابرار ابتسام کو تمہاری کتنی ضرورت ہے۔ کاش فرح خان تم محسوس کر سکتی۔ کہ آج ابرار کتنا اکیلا ہے۔ آخری کافی کا گھونٹ لے کر اس نے جُھک کے مگ زمین پہ رکھ دیا۔ اور آنکھوں پہ لگا فریم لیس چشمے کو اُتار کر آنکھوں میں آئی ہلکی نمی کو انگلیوں سے صاف کیا۔ بابر جا چکا تھا۔ شائد ماہ نور کو کال کرنے گیا تھا۔

ابرار اس وقت کریم رنگ کھدر کے شلوار سوٹ میں سیاہ رنگ موٹی چادر لپیٹے ہوئے تھا۔ وقفے وقفے سے چلتی ہوا۔ اس کے ہلکے نم بالوں کو اُڑا رہی تھی۔ اس وقت ڈوبتے سورج کو دیکھتے نارنجی آسمان کے تلے اُڑتے پرندوں کے پیچوں کے نیچے کھڑا وہ شخص ان پرندوں کو بہت تنہا لگا تھا۔ اس کی تنہائی اس کی ذات کے ہر ہر انگ سے پھوٹ رہی تھی۔

بظاہر مضبوط شخص۔۔۔ ضروری نہیں کہ مضبوط ہو بھی۔ جب ایسے لوگ گرتے ہیں تو سب سے زیادہ چوٹ بھی اِنہی کو لگتی ہے۔ جو جیگر کے آر پار ہوتی تکلیف کے ساتھ روح تک کو زخمی کر دیتی ہے۔ ابرار ابتسام کے ساتھ بھی یہی ہو رہا تھا۔ وہ ہوا کے تھپیڑوں کے سامنے کھڑا اپنا ضبط آزمہ رہا تھا۔ مگر اندر وہ کس قدر ڈرا ہوا سہا ہوا تھا۔ اس تنہائی سے ۔۔۔ کاش کوئی سمجھ سکتا۔

:::::::::::

امی جی آپ کو کبھی بھی میرے پہ یقین نہیں رہا۔

تب جب میں چھوٹی تھی۔ بچپن کے اوائل میں تھی۔ تب جب میں کہتی تھی۔ امی جی میں نے رضا کو نہیں مارا آپ تب میرا یقین نہیں کرتی تھیں۔

اور اب جب میں کہہ رہی ہوں۔ کہ امی جی میں نے کچھ نہیں کیا۔ میں نے فون لیا مگر اس کا کوئی غلط استعمال نہیں کیا۔ تو آپ کو تب بھی یقین نہیں آتا۔ قالین پہ بیٹھی تھی وہ۔ امی اس کے سامنے بیٹھیں تسبیح کر رہی تھیں۔ ان کی ٹانگیں نیچے لٹک رہی تھیں۔ اور فرح کے ہاتھ ان کے گھوٹنے پہ تھے۔

فرح تم جانتی ہو۔ تم نے خود عتراف کیا ہے۔ کہ کوئی لڑکا تمہیں بلیک میل کر رہا ہے۔ لڑکی کوئی بھی خامخواہ کسی کو بلیک میل نہیں کرتا۔ تم نے سُنا نہیں بوڑھے بزرگ کیا کہتے ہی۔ کہ تالی کبھی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی۔ آنکھوں میں سرد مہری لئے خشک لہجے میں اُنہوں نے کہا تو فرح ہونٹ کاٹنے لگی۔

امی جی آپ کو تو میرے پہ یقین شروع سے ہی نہیں تھا۔ تو اب میں کیسے دلا دوں۔ جب کہ میرے خلاف گواہی بھی میں خود دے رہی ہوں۔ آنسو اس کی آنکھوں میں جمع ہو رہے تھے۔ امی جی نے دیکھ کے آنکھیں پھیر لی۔

امی جی میری آپ سے ایک درخواست ہے۔ کہ براہِ مہربانی پھوپو کو اس سب میں مت گھسیٹیں۔ وہ کچھ نہیں جانتیں۔ میں نے اُن کو کچھ نہیں بتایا تھا اس سب کے بارے میں۔

اور یقین جانیں وہ لڑکا ایک نو عمر لڑکا تھا۔ جو محض شرارت میں مجھے تنگ کرتا تھا۔ میں نے کالج میں محض فون اس لئے لیا تھا۔ تاکہ آپ سے آسانی سے بات کر سکوں۔ کوئی بھی اپنا فون کسی انجان لڑکی سے شئیر نہیں کرتا۔ میں ایک انجان جگہ ،انجان شہر میں تھی۔ پلیز اس بات کو سمجھیں۔ اور پھوپو کو اس سب سے الگ رکھیں۔ دو زانو ہوتے وہ اُنہیں سمجھا رہی تھی۔

لیکن جب تم فون پہ بات کرتی تھی۔ تب تو تم کہتی تھی۔ کہ فون تمہاری دوست کا ہے۔ آنکھیں سکیڑے وہ اسے اس کا جھوٹ یاد دلا رہی تھیں۔

جی۔۔۔ ایک وہی تو جھوٹ ہے جس پہ مجھے اب ساری زندگی پچھتانا ہے۔ اسی ایک جھوٹ کی وجہ سے میرے بھرم کہاں کہاں ٹوٹے کیا بتاؤں۔ ندامت سے کہتے شہر لاہور میں رہنے والا وہ بردبار سا، بارعب سا شخص اس کی سوچ میں چلا آیا تھا۔

امی جی بس آپ اس بات کو ذہن سے نکال دیں۔ کہ اس سب میں پھوپو کہیں شامل ہیں۔ ابرار کے یک دم ذہن میں بنتے خاکے نے اسے اُلجھا دیا تھا۔ وہ سر جھٹک گئی۔

اس عورت کی حمایت مت کرو، وہی ہے جس نے تمہیں تباہ کیا ہے۔ اندر کا حسد انگڑائی لے رہا تھا۔

For more visit (exponovels.com)

امی جی مت بھولیں وہی عورت ہے۔ جس نے آپ کے بے پروائی سے پھینکنے پہ مجھے سنبھالا۔ جس نے مجھے زمانے کی اونچ نیچ سمجھائی۔ جس کی تربیت کی بدولت میں آج حق وسچ میں فرق کر پا رہی ہوں۔ آپ کو جو بھی ان سے شکائتیں ہیں۔ وہ سب آپ اپنے تک رکھیں۔ آنکھیں رگڑتے اس نے وہاں سے اُٹھنے کی تھی۔ وہ پھوپو کے خلاف ایک لفظ نہیں سُن سکتی۔

امی جی نے ناگواری سے اُسے دیکھا تھا۔ بدتمیزی مت کرو فرح خان ماں ہوں تمہاری۔ انہیں یاد آہی گیا تھا۔ کہ وہ اس کی ماں ہیں۔

اوہ اچھا ہے۔ آپ کو بھی احساس ہوا۔ کہ میں آپ کی بیٹی ہوں۔ لیکن امی جی میری ماں تو وہ پالنے والی بھی ہے۔ اور اگر آپ کو بُرا لگا ہے تو معذرت چاہتی ہوں۔ میں ان کے خلاف دوبارہ سُنوں گی تو تب بھی ایسے ہی بولوں گی۔ اور اب مجھے اجازت دیں۔ آج وہ اور پھوپھا آرہے ہیں۔ مجھے تیاری کے لئے جانا ہے۔ اس نے امی جی کے دل سے ہر ممکن دو دن میں قدورت ختم کرنے کی کوشش کی تھی۔ صدی کا سب سے مشکل کام تھا یہ۔

:::::::::

نکاہت سے چلتے وہ اپنی پیکنگ باوجود تیز کوشش کے تیز نہیں کر پا رہی تھی۔ بابا کی موت نے اس کے ذہن اور عصاب پہ گہرہ اثر ڈالا تھا۔ اور اسی اثر کی وجہ سے اس کے کندھوں کے پٹھے درد کر رہے تھے۔ بابر اسے لینے آیا تھا۔ وہ اس گھر جا رہی تھی۔ جہاں اس نے بچپن سے لے کے لڑکپن تک گزارا تھا۔ ایسی جگہ جہاں سے اس کا باپ ابدی نیند کے سفر پہ نکلا تھا۔ اس بات نے جہاں اسے غمگیں کر دیا تھا۔ وہیں بے چین و بے قرار بھی کر چھوڑا تھا۔ وہ بابا کے آخری وقت پہ ان کے ساتھ نہیں تھی۔ اب وہاں جا کہ ان کو محسوس کرنا چاہتی تھی۔

اوف ہو ایک تو یہ فائل پتہ نہیں کہاں گم گئی ہے۔ کیا مصیبت ہے یار۔۔۔ مجال ہے جو میری زندگی میں کوئی چیز صحیح ہو۔ وہ سخت جھنجلایا ہوا الگ رہا تھا۔ ماہ نور اس وقت اپنی سیاہ رنگ اونی چادر تیہہ لگاتی اپنے بیگ میں رکھ رہی تھی۔ جس میں تقریباً دو ماہ تک گھر سے باہر کا سامان آسانی سے رکھا جا سکتا تھا۔ ماہ نور نے اس کی طرف توجہ نہیں کی۔ آج کل وہ اس کی طرف ویسے بھی اپنے آپ میں غمگیں پھرتی تھی۔ جب سے ہسپتال سے لوٹی تھی۔ ڈھنگ سے کھاتی نہ پیتی اور اگر کوئی مخاطب کر لیتا تو محض مختصر جواب دے کے چُپ کا قُفل باندھ لیتی۔

میں پاگلوں کی طرح دیواروں سے نہیں پوچھ رہا۔ تم نے میری نیلی کور کی فائل کہیں دیکھی ہے تو جواب دو۔ وہ پندرہ منٹ سے مسلسل بولتا خود ہی کھپ رہا تھا۔ کمرے کی چیزوں کی تلاشی لیتے اس نے آخر تنگ آ کر پوچھ ہی لیا۔

ماہ نور نے سر اُٹھا کر اسے دیکھا اور پھر سر نفی میں ہلا دیا۔ بولی کچھ نہیں۔۔۔

منہ میں کیا کچھ ڈال رکھا ہے جو بول نہیں سکتی۔ اس کے اس طرح محض سر ہلانے پہ ذریت کو تپ چڑھی تھی۔ چڑھ کر قدرِ بلند آواز میں جِھڑکا تو ماہ نور نے چونک کے اسے دیکھا تھا۔ وہ سخت لہجے میں ہر وقت رہتا تھا۔ ایک سختی سی اس کے چہرے سے ہر وقت ظاہر ہوتی تھی۔ لیکن وہ چیختا کبھی بھی نہیں تھا۔ نہ ہی ایسے محض فائل گم ہونے جیسی باتوں پہ جھنجھلاتا تھا۔ ایسا صرف تب ہوتا تھا۔ جب اس کے مزاج کے خلاف کچھ ہوتا۔ اب کیا ایسا ہوا تھا جو ایسے چِڑھ رہا تھا۔ ماہ نور نے چلتے ہاتھوں کو روک کر اسے دیکھا۔

ہلکے آسمانی رنگ ہائی نیک شرٹ میں سرمئی جین پہنے بکھرے بالوں کے ساتھ اس کا مزاج بھی بکھرا بکھرا تھا۔

میں نہیں جانتی کہ آپ کی فائل کہاں ہے۔ پیکنگ کر لوں پھر ڈھونڈ دیتی ہوں۔

نہیں پہلے ڈھونڈ کے دو پھر یہ پیکنگ بھی کر لینا۔ ناگواری سے ہاتھ اُٹھا کے اس نے کپڑوں کی طرف اشارہ کر کے منا کیا تھا۔

اور بات سُنو دادی کا خیال رکھنا ہوتا ہے۔ تم تو وہاں چلے جاؤ گی تو وہ کیا کریں گی۔ کچھ سوچا ہے ان کے بارے میں۔ صوفے پہ بیٹھتے اسے ایک دم سے نہ جانے کیا ہوا۔ کہ ناگواری سے کہا۔ ماہ نور کمرے سے نکل رہی تھی رُک گئی۔

ظفر کی بیوی دن میں اور اس کی بہن رات میں رک جایا کریں گی۔ اس کی بہن آج کل ظفر کے ہاں آئی ہوئی ہے۔

ظفر کی بہن یا بیوی دادی کی سگی نہیں ہیں۔ اور سامان تو تم ایسے باندھ رہی ہو۔ جیسے سال کے ٹرپ پہ جا رہی ہو۔ بات سُنو۔۔۔ دادی تمہاری ذمہ داری ہے۔ آنکھوں میں سرد مہری لئے اس نے ماہ نور کو گھورتے کہا تھا۔ ماہ نور آدھا چہرہ موڑے کھڑی تھی۔ سر پہ لپٹا ڈھیلا سا سرخ سکارف اس کے دائیں گال کو ڈھک رہا تھا۔

For more visit (exponovels.com)

ٹھیک ہے! اور کچھ؟

نہیں۔۔۔اس قدر جواب میں سنجیدگی اور بے مروتی نے اسے منہ بگاڑنے پہ مجبور کر دیا تھا۔ اور پھر اس کے جانے تک بلکہ رات تک بگڑا ہی رہا۔ دادی جان نے عزیز پوتے کے بگڑے تاثرات دیکھے ضرور تھے۔ مگر پھر وہ بھی اپنے کام میں مصروف رہیں۔

ذریت نتاشا کو اس کے ڈیڈ نے چین بھیج دیا ہے۔ اب کیا سوچا ہے۔ اکمل دو دن پہلے دوبئی سے لوٹا تھا۔ وہ آج کل نئے بزنس میں مصروف تھا۔

کافی شاپ جو کہ اس کا ہمیشہ سے مسکن تھا۔ وہیں وہ دونوں بھاپ اُڑاتی کافی سے لطف اُٹھاتے آمنے سامنے بیٹھے تھے۔

سیاہ نیلی جین میں، سیاہ جیکٹ کے نیچے سے جھانکتی سفید شرٹ پہنے وہ میز کی سطح کو دیکھتا کسی سوچ میں مگن دکھتا تھا۔

ذریت۔۔۔ اکمل نے دھیرے سے کندھے سے پکڑ کر ہلایا۔ وہ اس کی بات نہیں سُن رہا تھا۔

ہم م م۔۔۔ چونک نے اس نے ابرو اُٹھا کر اسے دیکھا تھا۔ وہ وہاں موجود ہی نہیں تھا۔ اکمل نے آنکھیں سکیڑ کر اسے دیکھا۔

یار میں کچھ پوچھ رہا ہوں۔ اور تم ہو کہ پتہ نہیں کہاں گُم ہو۔

سوری یار کچھ سوچ رہا تھا۔ دوبارہ پوچھو۔ ڈھیلا سا وہ کرسی کی پُشت سے پُشت ٹکائے بائیں ٹانگ سیدھی کیئے بیٹھا تھا۔ سیدھا ہو بیٹھا۔ اور کوہنی کھڑی کرتا چہرہ اوپر ٹکالیا۔ اب پوچھو۔۔۔

اکمل خفیف سا ہو کر سر جھٹک گیا۔

میں پوچھ رہا تھا بھابھی واپس کب آئیں گی۔ سر جُھکا کر کپ اُٹھاتے اس نے جانبوجھ کے بات کا رُخ بدل دیا۔

ذریت نے فوراً چہرہ ہتھیلی سے اُٹھا کے بازو سیدھا کر لیا۔

میں نہیں جانتا۔

For more visit (exponovels.com)

تو یار تم نے پوچھا نہیں کب تک واپس آئیں گی ؟ اکمل نے ہونٹ سے مچلتی مسکراہٹ بمشکل روکی۔

نہیں۔ مختصر جواب۔

یار پوچھ لو۔

کیوں ؟

لو۔۔۔ جس طرح تم منہ لٹکا کے بیٹھے ہو۔ مجھے لگ رہا ہے۔ تم اُنہیں کافی یاد فرما رہے ہو۔ اس لئے بجائے انتظار کے آرام سے فون اُٹھا کے پوچھ لو۔ اختتام پہ ایک دل جلاتی مسکراہٹ بھی دیکھائی۔ اور ساتھ ہی کافی کا گھونٹ لیا۔

ذریت اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ میں نے فون نہیں کرنا۔ جب آنا ہو گا آجائے گی۔ ویسے بھی وہ اپنے بابا کی وفات کے بعد پہلی بار گھر گئی ہے۔ پتہ نہیں کب واپس آتی ہے۔ میز پہ وہیں پاس ہی اس کی کار کی چابی پڑی تھی۔ وہ اُٹھا کے میز کی سطح کھرچنے لگا۔ اکمل نے چابی پکڑ لی۔ وہ اس کی ذہنی حالت سے واقف ہو رہا تھا۔ وہ نتاشا کی وجہ سے ڈبل مائنڈ ہو رہا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ کہ وہ ماہ نور پہ یقین کرے یا نہ۔

ابھی تو اس نے نتاشا کو بھی کچھ نہیں کہا تھا۔ لاکھ منصوبہ بندی کے باوجود ذریت کچھ ایسا نہیں کر پاتا تھا جس سے نتاشا کو تکلیف پہنچ سکے۔ اس نے سوچا تھا۔ نتاشا کی تمام تصویریں اسفند کو دے گا۔ تو وہ نتاشا سے بدلا ضرور لے گا۔ کہ وہ اسے دھوکہ دے رہی تھی۔ مگر اسفند نے اس دھوکہ کے بعد منہ موڑ لیا ایسا کچھ نہیں سوچا۔ اُنہوں نے اسے ورغلانے کی بھی کوشش کی تھی۔ اکمل نے اسے بہت پمپ کیا۔ مگر اس کی ایک جگہ ہی تان اڑی رہی کہ وہ کسی سے بدلہ نہیں لے گا۔ نتاشا کا اپنا فیصلہ تھا۔ اور وہ زبردستی کو پسند نہیں کرتا۔ اس کے بعد ذریت نے سوچا کہ وہ نتاشا کو اپنے پیچھے اتنا تھکائے گا کہ وہ بھاگتی بھاگتی ہی ختم جائے گی۔ مگر اس سے پہلے ہی اس کے ڈیڈ کو ساری حقیقت کا پتہ چل گیا۔ اور نتاشا چین چلی گئی۔ اس اُمید پہ کہ ذریت اسے وہاں سے شادی کر کے لے آئے گا۔ ذریت نے بھی اسے یہی کہا تھا۔ اور کہا تھا۔ کہ آنے سے پہلے وہ ماہ نور کو چھوڑ دے گا۔ اور اب وہ سوچ رہا تھا۔ کہ وہ نتاشا کے پاس نہیں جائے گا۔ بلکہ وہ اسے وہیں رہنے دے گا۔ آگے کیا ہو گا اس کا فیصلہ نہیں کیا تھا۔

نتاشا کا بتاؤ۔ اس کا کیا بنا۔؟

شکر ہے تمہیں وہ بھی یاد آئی۔ مسکرا کر اس نے چھیڑا تو وہ اسے گھورنے لگا۔ بکو مت اور بات کو سیدھی طرح کرو۔

! یار میں سیدھا ہی کر رہا تھا۔ خیر

بات یہ ہے۔ کہ محترمہ کا ایک جلادی قسم کا کزن ہے۔ اور کچھ عجیب سی شخصیت کا حامل ہے۔ اس کے چچا کا بڑا بیٹا اسی کی عمر کا ہے۔ خیر اب دیکھتے ہیں۔ کہ وہاں کیا بنتا ہے۔ اور ایک بات شائد ہمیں اپنا ریکارڈ خراب نہ کرنا پڑے۔ سنجیدگی سے اس نے کہا تھا۔ ذریت گہرہ سانس لے کر سر ہلاتا کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ سردی میں دن بدن شدت آتی جا رہی تھی۔ اور دھند میں جکڑے ماحول میں چمکتے چاند کی روشنی بہت خوبصورت اور بھلی معلوم ہو رہی تھی۔

اور اسی چاند کی چاندنی کو دیکھتی وہ اپنے باغیچے کی ٹھنڈی، نرم اور نم گھاس پہ چل رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ہلکی نمی اور درد تھا۔ آنکھوں کے نمکین پانیوں میں چاند کی منعکس ہوتی روشنی اپنا رنگ چھوڑ رہی تھی۔ جو روشنی کی لہر اس کی آنکھوں میں بہتے دریا میں ڈبکی لگاتی نکلتی تو یو لگتا جیسے لہر کا رنگ بدل کر اپنا آپ کھو چکا ہو۔

ہلکے نارنجی اور سبز پجامہ قمیض سیاہ سویٹر پہنے، ایک شانے پہ سوٹ کے دونوں رنگوں سے امتزاج کھاتی شال لٹکائے وہ چل رہی تھی۔ اور جب چلتی تو اس کی شال کا ایک سرا زمین پہ بیچھی گھاس کو چھوتا۔۔۔

بابا مجھے لگتا ہے۔ میں آپ کے بعد بالکل اکیلی ہو گئی ہوں۔ میرے پاس ابرار بھائی اور بابر بھائی تو ہیں۔ لیکن بابا وہ تو بھائی ہیں۔ باپ تو آپ ہی تھے ناں۔ چاند اس کے ساتھ ساتھ سفر کر رہا تھا۔ اور وہ چاند کی طرف چہرہ اُٹھائے اپنے بابا سے مخاطب تھی۔ یوں جیسے وہ وہیں بیٹھے اُسے سُن رہے ہوں۔

بابا میں نے زندگی میں اتنی تھکاوٹ محسوس نہیں کی جتنی شادی کے بعد آپ سے دور ہو جانے کے بعد محسوس کی۔ بابا آپ نے جس کو میرے لئے منتخب کیا۔ وہ بھی میرا نہیں۔ میں کس کے پاس جوؤں کس کو کہوں کہ مجھے دُعا کی ضرورت ہے۔

! میری زندگی میں بہت تنہائی ہے۔ بابا

For more visit (exponovels.com)

میں نے بیماری کے عرصے میں آپ کے جانے کے بعد صرف یہی سوچا ہے۔اور پتہ ہے۔آپ مجھے بہت یاد آتے ہیں۔

اس نے رک کر باغیچے کے اختتام پہ رک کر چاندارد گرد دیکھا۔اور پھر بائیں جانب پڑے سنگی بینچ پہ بیٹھ گئی۔ٹانگیں دونوں اوپر اُٹھا کراس نے کندھے پہ جھولتی چادر ٹانگوں پہ ڈال لی۔وہ بیس منٹ سے کھڑی تھی۔اوراب جب بیٹھی تو ٹانگوں کو سکون سا ملا۔

اس نے سر پیچھے ٹکا کر نظر چاند پہ جمادی۔بابا کے بعد زندگی میں عجیب سی ویرانی اور خاموشی سی آگئی تھی۔

بابا اپنی گڑیا کے لئے دعا کریں۔

ماہا۔۔کافی۔۔۔بابراس کے قریب کھڑا تھا۔ہاتھ میں دو کپ بھاپ اُڑاتی کافی کے تھے۔ایک کپ اس نے ماہ نور کی طرف بڑھایا تواس نے خفیف سا ہو کر کپ پکڑ لیا۔

بھائی مجھے بتادیتے کافی پینی تھی تو۔ماہ نور نے ٹانگیں اب بھی نیچے نہیں کی تھیں۔ویسے ہی ذرا کھسک کر بھائی کے لئے جگہ بنادی۔بابر بیٹھ گیا۔

کیوں تمہیں اچھا نہیں لگا کہ تمہارا بھائی تمہارے لئے کافی بنا کر لاتا۔اس کے ساتھ بیٹھتے بابر نے سنجیدگی سے کہا۔تو وہ سرنفی میں ہلاتی سراس کے کندھے پہ ٹکا گئی۔

بھائی مجھے بابا بہت یاد آتے ہیں۔اسکے لہجے میں غم تھا۔دکھ کی آنچ تھی۔بابر نے آنکھیں بند کر کے کھولیں۔

ماہا میری گڑیا۔۔۔بابا کا بس اتنا ہی وقت تھا۔اب ہمیں صبر کرنا ہی ہوگا۔اللہ پاک کی یہی مرضی تھی۔اپنے آپ کو سنبھالو۔بابر نے بہت سنجیدگی سے ہاتھ میں پکڑے مگ کو دیکھتے اسے بڑے بھائی کا فرض ادا کرتے ہوئے سمجھانا چاہا۔کپ کے ہالے سے بھاپ نکلتی عجیب سے چہرے بنا رہی تھی۔اس نے نظر پھیر لی۔

For more visit (exponovels.com)

بھائی آپ پہلے اتنے سنجیدہ نہیں تھے۔اب جب سے میں آئی ہوں۔آپ نے اور ابرار بھائی نے ایک بار بھی ہنس کے نہیں دیکھا۔مجھے آپ دونوں کو دیکھ کے رونا آتا ہے۔اب کی بار بات کے اختتام پہ اس نے بات کے تاثرات دیکھنے کو چہرہ بھی اُٹھا کر بھائی کو دیکھا۔اور پھر سیدھی ہو کر کافی کا گھونٹ لینے لگی۔

اچھا۔۔۔پہلے تم تو کہتی تھی۔کہ میں بولتا بہت ہوں۔وہ مسکرایا نہیں تھا۔ماہ نور اسے دیکھ کے رہ گئی۔

بھائی آپ چُپ مت رہو۔میں تو ایسے ہی بکواس کرتی تھی۔پلیز آپ اور بھائی ہنسا کرو۔اور آئیں اب آپ اور میں اندر بھائی کے پاس چلیں۔وہ اکیلے ہوں گے۔اس کے بھائی بالکل تنہا تھے اس بات نے اسے بہت دُکھ دیا تھا۔وہ فوراً سیدھی ہوتی

اُٹھ کھڑی ہوئی۔بابر سر ہلا کر کھڑا ہو گیا۔

ماہا ایک بات پوچھوں؟ کھڑے ہوتے اس نے اسے جاتے پیچھے سے آواز دے کر روک لیا تھا۔ماہ نور روک گئی۔

پوچھیں۔

تم ذریت بھائی کے ساتھ ٹھیک ہو؟

کوئی مسلہ تو نہیں؟

اگر کوئی بھی ہو مجھے بتانا۔وہ ساکت کھڑی تھی۔اسے اپنے کچھ دیر پہلے کے کہے الفاظ یاد آئے۔اس نے سر اثبات میں ہلایا اور تیزی سے واپس مڑ گئی۔

:::::::::::

ذریت تم کب آ رہے ہو۔

یہ انکل کا بیٹا بہت جنگلی ہے۔ فون پہ وہ مدھم آواز میں بول رہی تھی۔ اور ساتھ ہی ساتھ مڑ مڑ کر راہداری میں جاتے کمرے کے بند دروازے کو بھی دیکھ لیتی۔ ذریت اس وقت اپنے آفس کی کرسی پہ بیٹھا پیپر ویٹ گھومارہا تھا۔ دھیمہ سا مسکرادیا۔

جب تم کہو۔۔۔

تو ابھی آجاؤ۔۔۔ وہ لمبے لمبے سانس لیتی مڑ کر دروازے کو دیکھتی بول پڑی۔ ذریت نے نیچے کا ہونٹ دبا کر مسکراہٹ روکی۔ اب آئی تھی اونٹنی پہاڑ کے نیچے۔۔۔

سوری بے بی ابھی ممکن نہیں ہے۔ آفس میں بیٹھا ہوں۔ اور ایک عزیز ترین دوست کے گھر بھی جانا ہے۔ آذر کی والدہ سے ملنے وہ جارہا تھا آج۔

نتاشا نے منہ بگاڑا۔

ذریت وہ مجھ سے اتنے کام کرواتا ہے۔ انکل اسے کچھ نہیں کہتے ڈیڈ بھی میری بات نہیں سُنتے اور تو اور ان لوگوں نے مجھ سے میرا فون تک چھین لیا ہے۔ یہ لوگ بہت جانور ہیں۔ گھر سے بھی نہیں نکلنے دیتے۔ اس کی آواز میں ہلکی نمی کی آمیزیش تھی۔ ذریت نے کرسی سے پُشت ٹکا کر آنکھیں موندلیں۔ اور کُرسی جھولنے لگا۔ اسے نتاشا کا یہ حال سکون دے رہا تھا۔

نتاشا ابھی تمہیں کچھ روز انتظار کرنا ہے۔ میری بیوی کے والد کی وفات ہوئے کچھ روز ہوئے ہیں۔ اور ابھی گھر سے نکلنا میرے لئے ممکن نہیں ہے۔ مسکراہٹ کو ہونٹوں تک آنے سے روکتے اس نے کہا تو نتاشا چونک گئی۔

کیا اب تم نے کہا کہ۔۔۔ نتاشا کو یقین نہیں تھا۔ وہ اُلجھی ہوئی لگی۔

میں صرف اتنا کہہ رہا ہوں کہ وہیں رہو۔ اور میرا انتظار کرو، میں جلد تمہیں اُدھر سے نکال لوں گا۔ ویسے ایک بات تو بتاؤ۔ تمہارا کزن تم پہ اتنی نظر کیوں رکھتا ہے۔ اور باقی سارے خاندان کا رویہ۔

نتاشاتم۔۔۔الفاظ ابھی اس کے منہ میں ہی تھے۔جب اس نے فون کی دوسری جانب نتاشا کا چیخنا شور مچانا سُنا تھا۔

تم کس سے بات کررہی تھی۔اس کے کزن کی آواز میں ناگواری تھی۔جبکہ غصہ الفاظ سے واضح تھی۔

میں جس سے بھی بات کروں تمہیں اس سے کیا۔اور تم میری جان چھوڑ دو۔وہ بھی غصے سے دھاڑی تھی۔اس نے ان دونوں کی آوازیں سُن کر فون واپس رکھ دیا۔معملہ کیا تھا اس کا کزن اتنا شور کیوں مچارہا تھا۔بات سمجھ سے باہر تھی۔مگر خیر سمجھنے میں اسے کوئی دلچسپی تھی بھی نہیں۔مسکرا کر اس نے رسیور رکھا۔اور پھر میز پہ دھرا اپنا موبائل اُٹھا کر ماہ نور کے گھر کا نمبر ملانے لگا۔اس کا مقصد اسے اُمید کی ڈور تھمانا تھا۔جس میں وہ کامیاب ہوا تھا۔

:::::::::::

!اسلامُ علیکم ذریت بھائی

وہ تینوں لنچ پہ ساتھ بیٹھے تھے۔ماہ نور نے آفس سے دونوں بھائیوں کو لنچ پہ گھر بلا لیا تھا۔وہ اکیلے گھر رہنے سے گھبرائی لگتی تھی۔

چائے بنانے کی غرض سے ماہ نور باورچی خانے کی جانب بڑھی ہی تھی۔جب فون بجا تھا۔بابر فون کے قریب تھا۔سواسی نے اُٹھایا۔اور ذریت کی فون پہ موجودگی نے اسے کافی خوشی دی تھی۔اسے لگا تھا۔ماہ نور ذریت کے ساتھ ٹھیک نہیں ہے۔اس ایک کال نے سارے خدشے مٹادینے کی کافی حد تک کوشش کی تھی۔بابر نے دیکھا تھا۔کہ ماہ نور شادی کے بعد کافی بدلی ہے۔مگر اس کی وجہ خوشی نہیں محسوس ہوتی تھی۔اس نے رات بھی ماہ نور سے اس کی پریشانی جاننے کی ہی کوشش کی تھی۔اور ڈھکے چُھپے انداز میں اس کے گھر کے حالات اور ذریت کے رویئے کو جاننے کی کوشش کی تھی۔مگر ماہ نور نے کوئی جواب نہیں دیا۔وہ اُلجھا ضرور تھا۔مگر ابھی ذریت کی کال اور پھر ماہ نور کو فون پہ آنے کو بولنے کا جب اس نے کہا تو اسے اپنے خیالات وہم لگے۔

ابرار صوفے پہ سامنے ہی بیٹھا تھا۔اور اخبار پڑھ رہا تھا۔اس نے کوئی خاص نوٹس نہیں لیا تھا۔

ماہ نور ذریت بھائی کی کال ہے۔ آ کے بات سُن لو۔ شائد کوئی اہم بات کرنی ہے۔ وہ چائے کا پانی چولہے پہ چڑھائے کام میں مصروف تھی۔ جب پُشت پہ پڑتی بابر کی آواز پہ مڑی۔

اُنہوں نے میرے سے کیا بات کرنی ہے ؟ ذریت کی فون کال سُن کر اسے قدرِ حیرت ہوئی تھی۔ اور یہ ایک فطری بات ہی تھی۔ کیونکہ اس کے اور ذریت کے رشتے میں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ کہ وہ ایک دوسرے سے بات کر کے اپنی اپنی کہتے سُنتے۔ وہ تو دادی کا کوئی کام پوچھنے یا حال چال بھی پوچھنا چاہتا تو کبھی بھی اسے فون نہیں کرتا تھا۔

اب یہ میں کیسے بتا سکتا ہوں۔ شوہر تمہارا ہے۔ اور سوال تم ایسے مجھ سے پوچھ رہی ہو۔ شانے اُچکا کر جانے سے پہلے بابر نے جواب دیا۔ اور واپس مڑ گیا۔

ماہ نور اس وقت گھر کے عام سے سرخ رنگ کھدر کے سوٹ میں ملبوس تھی۔ آج دھوپ نکلنے کی وجہ سے اس نے سویٹر پہننے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ تبھی دوپٹے کو دائیں شانے پہ سنبھالتی باہر نکل آئی۔ اور صوفے پہ بیٹھ کر رسیور اُٹھالیا۔ بھائی دونوں اپنے کاموں میں مصروف تھے۔

خیر کون جانے کے بابر تب بھی اس کی باتیں سُننا چاہ رہا ہو۔

اسلامُ علیکم !

ماہ نور۔۔۔ کیسی ہو؟

وہ اصل میں۔۔۔ میں تمہیں تنگ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ لیکن وہ۔۔۔ فون پہ اٹک اٹک کر اس کے جملے یا تو اس تک پہنچ رہے تھے۔ یا پھر وہ بول ہی ایسے رہا تھا۔ ماہ نور سمجھ نہ سکی۔

جی۔۔۔ جی میں سُن رہی ہوں۔ اسے لگا۔ وہ جو کہہ رہا ہے۔ اسے لگا وہ سمجھے گا وہ سُن نہیں رہی۔

ماہ نور آج شام میں تم میرے ساتھ باہر چل رہی ہو۔ سو ریڈی رہنا۔

کہاں جانا ہے؟ وہ پوچھ رہی تھی۔

آذر کی امی سے ملنا ہے۔ اُمید ہے۔ کہ تم وقت پہ تیار رہو گی۔ اسی طرح کی چند اور باتوں کے بعد اس نے فون واپس رکھا تو دل میں کوئی ایسی تبدیلی رونماں ہوئی معلوم نہیں ہوئی تھی۔ اسے لگا تھا۔ کہ وہ اسے کہے گا۔ کہ جلد واپس آنے کی کوشش کرنا۔ یا یہ کہ میں تمہارے بغیر اس جگہ بہت اکیلا محسوس کر رہا ہوں۔ مگر اُمیدیں تو وہاں باندھی جاتی ہیں جہاں کوئی عہد و پیماں ہوئے ہوں۔ جہاں ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھائی گئی ہوں۔ جبکہ ان کی زندگی میں ایسا کچھ تھا ہی نہیں۔ ان کا رشتہ اس سب سے بالکل الگ تھا۔ وہ بس دونوں ایک ہی کشتی کے مسافر الگ الگ منزل کی خواہاں معلوم ہوتے تھے کیا کہے رہے تھے ذریت بھائی؟ بابر کو خاصی دلچسپی تھی۔ تبھی پوچھ بیٹھا۔ ابرار نے اب کی بار چھوٹے بھائی کو ہلکا سا گھورا تھا۔ مگر وہ دیکھ کہاں رہا تھا۔

کہہ رہے تھے۔ کہ شام میں آئیں گے۔ شائد کسی جاننے والے کو ملنے جانا ہے ہمیں۔

اچھا۔۔ بابر نے سر ہلا کے سامنے کی ٹیبل سے لیپ ٹوپ اُٹھا لیا تھا۔ اب ان کا واپس آفس جانے کا کوئی ایرادہ نہیں تھا۔ سو وہ وہیں آفس کا کام بیٹھ کے کرنے لگا۔ اور ماہ نور ان دونوں کو دیکھ کر واپس کیچن کی جانب چلی گئی۔ کہ چولہ وہ بند کر آئی تھی۔ اور اب چائے کا کام دوبارہ سے کرنے والی تھی۔

::::::::::::

ٹھنڈے ٹھار دن کے وسط میں سورج آ نکلا تھا۔ اور ایک پرُ حدت سی روشنی ایک عجیب سی راحت و فرحت بخش رہی تھی۔

ڈائننگ حال میں اس وقت بہت سے مہمان جمع تھے۔ ان سب کو پھوپو کی شادی کے بعد کے پہلے کھانے پہ بلایا گیا تھا۔ لمبی ساری میز کی گرد پڑی کرُسیوں پہ تقریباً شہر میں موجود تمام رشتے دار ہی بیٹھے تھے۔ ان کے بیشتر مہمان اگرچہ سوات میں تھے۔ مگر پھر بھی پشاور میں ان کے بہت سے عزیز موجود تھے۔ اور وہی اس دعوت میں اپنے رنگ بکھیرے ہوئے تھے۔ جن میں فرح کی دور پرے کی جہاں جاننے والی تھیں وہیں چچی کی دو بہنیں بھی مدعو تھیں۔ جو بڑ چڑھ کر ہر کام میں حصہ ڈال رہی تھیں۔ فرح نے ان کے رویئے کو دیکھ کر کوئی نوٹس نہیں لیا تھا۔ اسے اس بات سے کوئی سروکار

نہیں تھا۔ کہ کون آرہا تھا۔ اور کون جارہا تھا۔ اور کس کا کس سے کیا تعلق اور رشتہ ہے۔ امی جی کے رویئے نے اسے بہت تکلیف پہنچائی تھی۔

فری تم نے اکیا سوچا ہے؟ آگے کیا کرو گی؟ سر جھکائے وہ چاول پلیٹ میں ڈالے ان کا ساتھ کھیلنے میں مصروف تھی۔ جب پھوپو کی نند نے اسے مخاطب کیا۔ فرح نے نا سمجھی سے اسے دیکھا۔

آگے کا کیا منصوبہ ہو گا۔ بس جتنا پڑھنا تھا۔ پڑھ لیا۔ اس سے پہلے کے وہ منہ کھولتی امی جی نے تیزی سے کہا۔ وہ منہ بنا کر واپس سر جھٹک کر کھانے پہ جُھک گئ۔

ویسے فرح نے کبھی ہمیں بتایا نہیں لاہور میں کیا کرتی رہی ہو۔ آج موقع بھی ہے اور وقت بھی۔ آج ہمیں وہاں کے قصے سُنانا۔ چچی اس کے سامنے کی کُرسی پہ بیٹھیں اپنے بیٹے کو کھانا کھلانے میں مصروف تھیں۔ اُنھوں نے لہجے کو سنسنی خیز بناتے ہوئے۔ بظاہر دلچسپی دیکھاتے ہوئے کہا۔ تو بہت سی آنکھیں مسکراتی اُسے دیکھنے لگیں۔

وہاں کیا ہونا۔ میں ہوسٹل میں رہتی تھی۔ اور پڑھائی کرنے گئ تھی۔ وقعات کیا سُناتی۔ چچی کو ایک نظر دیکھ کر اس نے بظاہر مسکراتے حقیقتاً جتاتے ہوئے کہا۔ تو چچی مسکرا دی تھیں۔

ارے فری ڈیئر تم تو آپی کی بات کا بُرا منا گئ۔ ان کا مطلب تم شائد غلط لے گئ۔ ان کا مطلب تھا۔ کہ کبھی کبھی ہوسٹل سے بندہ باہر بھی نکلتا بھی ہی ہے۔۔۔ چچی کی چھوٹی بہن سدرہ بھی اُنھی کی پر تو تھی۔ فرح نے بے پروائی سے شانے اُچکا دیئے۔

میں ویسے کبھی بھی ہوسٹل سے نہیں نکلی تھی۔ خیر۔۔۔

فری تم نے وہ پوڈنگ نہیں کھلائی۔۔۔ جاؤ وہ تو لاؤ۔ پھوپو کی آواز نے اس کی بات بیچ میں ہی کاٹ دی تھی۔ فرح نے پھوپو کو دیکھا۔ اور پھر سر ہلاتی کرسی سے اُٹھ گئ۔

وہ میں نے اور فرح آپی نے مل کے بنائی تھی۔ بلکہ سارا کام ہی میرا تھا۔ فرح آپی کو تو کچھ پتہ ہی نہیں چل رہا تھا۔ شائستہ نے شائستہ لہجے میں بات کو ایک نیا رُخ دیا۔ تو پھوپو نے اسے جاتے دیکھا تھا۔ اسے جیسے کوئی فرق ہی نہیں پڑا تھا۔

پانی ایک جگ مل سکتا ہے۔ کاشف کی آواز پہ وہ مڑی تھی۔ وہ ڈرائینگ روم سے آیا تھا۔ مرد حضرات ادھر کھانا کھا رہے تھے۔

فرح نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس خاموشی سے اس کا رکھا جگ اُٹھا کر پانی بھرا اور اس کی جانب بڑھایا تھا۔ نظر اس کی دوسری جانب تھی۔

گولڈن اور میرون رنگ کلیوں والے لمبے سے فرک میں گولڈن دوپٹے سے دونوں شانوں کو ڈھکے بالوں کو فرنچ چوٹی میں مُقید کئے کسی بھی طرح کے میک اَپ سے پاک چہرہ لئے کمال کی معصوم لگ رہی تھی۔ کاشف نے بجائے پانی کا جگ پکڑنے کے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ فرح کو بجلی کا تیز جھٹکا بھی لگتا تو بھی شائد وہ ایسے نہ بُدکتی جیسے اس کا ہاتھ پکڑنے پہ بُدکی۔ اور اس کا انجام یہ نکلا کہ ہاتھ سے جگ چھوٹ کر اس کے خود کے ہی پاؤں پہ آ لگا۔ کانچ کے کئی ٹکڑے اس کے پاؤں پہ لگتے زخمی کر گئے۔ اور وہ باوجود کوشش کے زمین پہ خود کو گرنے سے بچا نہیں پائی تھی۔

جگ کے گرنے کی آواز نہ ہونے کے برابر تھی۔ اسی لئے کسی کا اندر کی جانب دھیان نہیں گیا۔ اور وہ ساکت نظروں سے اپنے زخمی پاؤں کو دیکھتی تکلیف سے دوچار تھی۔ دوسری طرف کاشف بھی حیرت سے اسے اور اس کا زخمی پاؤں کو دیکھتا دوزانوں ہو بیٹھا۔

یہ آپ نے کیا کیا؟ اپنے آپ کو ہی زخمی کر لیا۔ پتہ بھی ہے۔ آپ کا تکلیف میں ہونا کسی کو بہت تکلیف دے سکتا ہے۔ افسوس سے سرہلاتے اس نے اس کے پاؤں کے قریب پڑے سارے کانچ چُننے شروع کر دئے۔ فرح کی آنکھ سے ایک آنسو بہت خاموشی سے نکلا تھا

دور ہٹو۔۔۔ ضبط کرنے کے باوجود اس کے لہجے کی پھنکار میں کافی شدت تھی۔ کانچ چنتے کاشف کے ہاتھ تھم گئے۔ اس کی آنکھوں میں کیا ہے۔ کونسے رنگ ہیں فرح نے دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ اور باوجود پاؤں میں اُٹھتی ٹیسوں کے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

آپ کی ہمت کیسے۔۔۔ کیسے ہوئی میرا ہاتھ پکڑنے کی۔ غصے سے اس کی آواز کامپ رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا۔ جیسے اس کے ہاتھ میں آگ جل اُٹھی ہو۔ وہ اپنے ہاتھ کو اپنے دوپٹے سے صاف کر رہی تھی۔ اور اس بات کا اسے خود بھی اندازہ نہیں تھا۔

میں۔۔۔ میں معذرت چاہتا ہوں۔ پلیز تم ادھر بیٹھ جاؤ۔ تمہارے پاؤں سے خون بہہ رہا ہے۔ اس کی آنکھوں سے آنسو اب متوتر نکل رہے تھے۔ کاشف نے پریشانی سے سمجھاتے ہوئے کرسی اس کے لئے کھینچ دی۔

چُپ۔۔۔ بس نکل جاؤ ادھر سے۔ فرح کا بس نہیں چل رہا تھا۔ اس بندے کا سر پھاڑ دے۔ اس کی ہمت ہوئی تو ہوئی کیسے۔

فرح ریلیکس۔۔۔ میں۔ اس نے فرح کے بہتے آنسو صاف کرنے کو ہاتھ بڑھایا تھا۔ فرح نے غصے سے اس کا ہاتھ جھٹک دینا چاہا تھا۔ جب اس کی سانس اور آنکھیں دونوں کے دونوں ساکت ہوئے تھے۔

سدرہ منہ پہ ہاتھ رکھے کھڑی تھی۔

سدرہ۔۔۔ کیا ہوا؟۔ تبھی چچی ہاتھ میں برتن اُٹھائے وہاں آئی تھیں۔ اور ان کے پیچھے ہی پھوپو تھیں۔ اور وہاں ان تینوں کی آنکھوں میں کیا تھا۔ فرح خان کو دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی۔ سدرہ منہ پہ ہاتھ رکھے کھڑی تھی۔ چچی کی آنکھیں اور ہونٹ مسکرا رہے تھے۔ جبکہ پھوپو کی آنکھوں میں بھی بے یقینی سی بے یقینی تھی۔ فرح کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔ اور گھڑوں پانی پڑا تھا۔ کاشف نے اسے سہا ہوا دیکھ کر پیچھے دیکھا تو ان تینوں کو دیکھ کر وہاں سے نکل گیا۔ جبکہ فرح بے قصور ہو کر بھی قصوروار بن رہی تھی۔

فرح یہ سب کیا تھا؟ سب سے پہلی آواز چچی کی تھی۔ فرح نے ان کی آنکھوں میں بھسم کر دینے والی آگ دیکھی۔

چچ۔۔۔ چچی وہ۔۔۔ میں۔ اسے سمجھ نہیں آئی وہ کیا کہے۔

اوہو۔۔۔ آپی آپ بھی عجیب سوال کر رہی ہیں۔ کبھی چور نے چوری کے بعد مانا ہے۔ آپ کو تو چاہے۔ ایسی لڑکی کو اپنے گھر ہی نہ رکھو۔ جس کا کوئی کردار ہی نہ ہو۔ توبہ توبہ۔۔۔ آپ کے گھر میں یہ سب ہوتا ہے۔ مجھے نہیں پتہ تھا۔ سدرہ کے

For more visit (exponovels.com)

ہونٹ طنز سے مسکرا رہے تھے۔ اور اس کے جملے تھے کہ زہر جو فرح کو اندر سے کھا رہے تھے۔ اس نے سر جھو کا دیا۔ اس کے پاس کہنے کو کچھ نہیں تھا۔

پھوپو نے اس کے جُھکے سر کو دیکھا۔ اس کے بہتے آنسو دیکھتے تو تیزی سے اس کی جانب بڑھی تھیں۔ ماضی کی آگ ان کی جانب بڑھ رہی تھی۔

بس بھئی نصیب ہی خراب ہیں۔ پہلے پھوپی اب یہ۔ میں کیا کر سکتی ہوں۔ چچی کہاں چپ رہنے والی تھیں۔ ابھی تو اُنہیں موقع ملا تھا۔ کیسے جانے دیتیں۔

بھابھی یہ آپ کیسی باتیں لے کے بیٹھ گئیں ہیں۔ پھوپھو نے نظر چوراتے ہوئے کہا۔ تو چچی کا قہقہہ جانداری سے نکلا۔

ارے ذہرہ تم بھی کیسی بات کر رہی ہو۔ تمہاری چہیتی دن ڈھلے کیا کر رہی ہے۔ بجائے اس سے پوچھنے کے تم ہم سے الجھ رہی ہو۔ ارے بی بی اپنا کیا مت بھگتنا اب تم۔

بس بھابھی بہت ہوا۔ تماشا مت لگائیں۔ فرح نے کچھ نہیں کیا۔ اور جاؤ سدرہ کام کرو جا کے اپنا۔ پھوپھو کی برداشت جواب دے گئی تو وہ ضبط کرتی بولی تھیں۔

اللہ ایک تو چوری اوپر سے سینہ زوری۔ آپی آپ کی اور بھائی جی کی شرافت ہے جو ایسے لوگوں میں رہ رہے ہو۔ ایسی ڈھٹائی۔ سدرہ کو تو آگ ہی لگ گئی تھی۔ فرح اور تیزی سے رونے لگی۔

پھوپو میرے سے قسم لے لیں میں نے کچھ نہیں کیا۔

مجھے پتہ ہے۔ ان سب کو تو ویسے ہی عادت ہے۔ آؤ میرے ساتھ۔ اس کا ہاتھ پکڑتے اُنہوں نے حوصلہ دیا اور پھر پکڑ تیں باہر لے گئیں۔ چچی اور سدرہ ایک دوسرے کو دیکھ کے مسکرائی تھیں۔

اب آئے گا اصل مزہ۔

::::::::::
::::::::::

For more visit (exponovels.com)

سیاہ اور گولڈن شلوار قمیض پہن کر اس نے اپنے عکس کو شیشے میں دیکھا۔ تو باوجود کسی خواہش کے اس کے ہونٹوں پہ ہلکی سی مسکراہٹ آ کے معدوم ہوئی تھی۔ کسی خیال کے تحت مڑ کر اس نے بیڈ پہ پڑے فون کو اُٹھایا اور ذریت حسن کا نمبر نکال کر کال کی۔

دوسری ہی بیل پہ کال اُٹھالی گئی۔

ہیلو۔۔۔؟ کاغذ پہ پین گھسیٹتے اس نے مصروف سے انداز میں پوچھا تھا۔ ماہ نور نے اس کی آواز سُننے کے بعد سوچا تھا کہ اس نے بات کیا کرنی تھی۔ اس نے اپنے نیچلے ہونٹ کو دانت سے کاٹا۔

وہ۔۔۔ میں نے پوچھنا تھا کہ آپ کو آنے میں کتنا وقت لگے لگا۔ کچھ سوچ کر اس نے بات گھڑ دی۔ ذریت سیدھا ہوا۔ پین میز پہ کھلا چھوڑ دیا۔ پہلا اتفاق تھا۔ کہ وہ خود کال کر رہی تھی۔ اس نے بھی تو صبح پہلی بار کال کی تھی۔

آ۔۔۔ تم۔۔۔ ابھی تیار ہو؟ اس نے سامنے دیوار پہ لگی گھڑی کو دیکھا۔ شام ہونے کو تھی۔ وہ دھیمے سے مسکرا کر سر جھٹک گیا۔ وہ شائد اس کا انتظار کر رہی تھی۔

ہاں۔۔۔ وہ۔۔۔ نہیں میرا۔۔۔ مطلب ہے کہ ہو جاؤں؟

اچھا تو ابھی ہونا ہے؟

ہاں ابھی ہو جاتی ہوں۔ اگر آپ ابھی آئیں۔۔۔ الٹے سیدھے لفظ منہ سے دھکے سے ہی نکلے جا رہے تھے۔ شیشے میں اپنے ہلکے پھلکے نفیس سے لباس میں پھولے بالوں کے ساتھ وہ اچھی لگ رہی تھی۔ ہونٹوں پہ پہلی بار ذریت سے بات کرتے ہوئے مسکراہٹ آئی تھی۔ حلانکہ بات ایسی کوئی تھی بھی نہیں۔ ذریت نے سر ہلا دیا۔ جیسے وہ دیکھ ہی رہی ہو۔

میں بیس منٹ میں آ رہا ہوں۔

ٹھیک ہے۔ میں انتظار۔۔۔ نہیں وہ۔۔۔

اچھا آجائیں۔۔۔ایک نام کے ساتھ منسوب ہونا۔پہلی بار اسے خوشی دے رہا تھا۔اور اب اسی خوشی میں وہ بوکھلا رہی تھی۔

ٹھیک۔۔۔تم تیار رہو میں آتا ہوں۔اس نے فون واپس رکھا اور واپس پین اُٹھا کر کام کرنے لگا۔ماہ نور نے فون واپس ڈریسنگ ٹیبل پہ رکھا۔اور برش اُٹھا کر بال برش کرنے لگی۔سیاہ قمیض کے گلے پہ گولڈن تلِے کی کڑھائی بلب کی روشنی میں خوب چمک رہی تھی۔اور اس چمک سے کہیں زیادہ ماہ نور کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

ماہ نور نے سر جھٹک کر پُشت پہ پھیلے بال سیدھے کیئے۔اور پھر ان کو بل دے کر اوپر کی جانب سمیٹ لیا۔

ماہ نور۔۔۔ابرار تھا۔

جی بھائی آجائیں۔دروازے پہ ابرار بھائی کی آواز سُن کر اس نے مڑ کر صوفے سے دوپٹہ اُٹھا کر سلیقے سے شانوں کو ڈھانپا۔اور بیڈ پہ بیٹھ کر قریب پڑے سینڈل پہننے لگی۔

تم جا رہی ہو؟اسے تیار دیکھ کر دھیمے سے مسکرا کر اس نے پوچھا تو ماہ نور نے سر ہلا دیا۔

اچھا۔۔۔وہ سامنے صوفے پہ بیٹھ گیا۔اور غور سے اسے دیکھا۔

ماہا۔۔۔مجھے تم سے ایک بات کرنی ہے۔پُر سوچ انداز میں اسے دیکھتے بھائی نے کہنا شروع کیا۔تو وہ جو جوتا پہن رہی تھی۔سیدھی ہوئی۔

جی بھائی کہیں۔۔۔اسے ان کے چہرے پہ سنجیدگی دیکھ کے غم سا ہوا تھا۔اُنہیں مسکرائے کافی دن ہو چکے تھے۔

ماہ نور بابا کے جانے کے بعد میں تم دونوں کا بڑا ہوں۔تمہاری اور بابر کی ساری ذمہ داری میرے کندھوں پہ ہے۔میں چاہتا ہوں۔کہ تم دونوں ہمیشہ خوش رہو۔۔۔تم دونوں کو جب میں خاموش اور غمگیں الگ الگ دیکھتا ہوں مجھے بہت دُکھ ہوتا ہے۔تم اور بابر کوشش کرو نارمل زندگی کی طرف آنے کی۔اگر بابا زندہ ہوتے تو تم دونوں کو ایسے دیکھ کے اُنہیں بہت دُکھ ہوتا۔

بھائی آپ بھی تو بدل گئے ہیں۔ان کو دیکھتے اس نے نرمی سے کہا تو ابرار سر جھٹک گیا۔

مجھے چھوڑو۔ابھی بات تم دونوں کی ہوری ہے۔اور تم اب خوش رہا کرو۔اللہ پاک کا فیصلہ تھا۔ہم کچھ نہیں کر سکتے۔اس لئے اب نارمل ہو کر رہو۔اللہ ہمیں صبر عطا فرمائیں۔آمین۔۔۔وہ اسے بالکل بابا کی طرح سمجھا رہا تھا۔

ما نور اُٹھ کر ان کے برابر جا بیٹھی۔اور ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔

بھائی آپ شادی کر لیں۔میں نے اور بابا نے آپ کے لئے یہ بہت پہلے سوچا تھا۔آپ کو اور اس گھر کو بہت ضرورت ہے۔نرمی سے ان کا ہاتھ سہلاتے وہ کہہ رہی تھی۔ابرار مسکرا دیا۔اور پھر بہن کو دیکھا۔

اچھا۔۔۔اور بابر۔۔۔بابر کا کیا؟

آپ کے بعد ان کی بھی باری آجائے گی۔پر پہلے آپ۔اشتیاق دیکھاتے وہ بھائی کو دیکھ رہی تھی۔

ابھی نہیں گڑیا۔کچھ دیر رُک گاؤ۔پھر کسی وقت۔۔۔فرح کا چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے آرہا تھا۔اس نے سر جھٹک دیا۔اس طرح کے فیصلے یک طرفہ تھوڑی ناں ہوتے ہیں۔

پھر کب؟

کیا آپ کسی لڑکی کو پسند کرتے ہیں؟اگر ہاں تو پلیز آپ مجھے بتائیں۔اس نے ان کی آنکھوں میں جانے پہچانے رنگ دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔ابرار ہنس دیا۔

ہاں کرتا ہوں۔۔۔بہت ساری لڑکیاں مجھے اچھی لگتی ہیں۔پر بات یہ ہے۔کہ ان کو تمہارا بھائی شائد پسند نہ آئے۔

بھائی۔۔۔یہ کیا بات ہوئی۔آپ کو لگ رہا ہے۔میں مزاق کر رہی ہوں۔

نہیں مجھے ایسا بالکل نہیں لگ رہا۔اور اب باقی باتیں بعد میں۔تم تیار ہو۔ذریت آنے والا ہو گا۔اُٹھ کر جانے سے پہلے اس نے بہن کا سر تھپتھپایا اور کمرے سے نکل گیا۔ماہ نور نے ایک شکوے سے بھری نظر ان پہ ڈالی اور اُٹھ گئی۔

:::::::::::::
:::::::::::::

رات کا فسوں پھیل رہا تھا۔ سڑک پہ اندھیرے میں چمکتی روشنیوں کو دیکھتے اس کی نظر ساتھ بیٹھے وجود پہ پڑی تو ذرا اُلجھ کر واپس لوٹی۔

سیاہ سوٹ میں سیاہ ہی بڑے سے دوپٹے سے سکارف باندھے گولڈ کی چوڑیاں اور دو انگوٹھیاں پہنے کسی بھی قسم کے پاک چہرہ لئے وہ خاموش بیٹھی تھی۔ ذریت نے دوسری بار اسے اتنے بار غور سے دیکھا تھا۔ پہلے بار ولیمے کے سوٹ میں اور دوسری بار اب سیاہ میں۔

اور اس نے اس لمحے سوچا تھا۔ کہ ماہ نور کو پہنا ہر رنگ اچھا لگتا ہے۔

خاموشی میں بیٹھے دونوں نفوس پہلی بار ایسے باہر نکلے تھے۔ مگر ایک دوسرے سے بہت انجان دکھتے تھے۔

کیا تم بور ہو رہی ہو۔؟ کافی دیر خاموشی کے بعد جب ماہ نور نے مڑ کے اس کی جانب نہیں دیکھا۔ اس کی طرف متوجہ نہ ہوئی تو اسے مجبوراً پوچھنا پڑا۔ جس میں اسے کامیابی بھی ہوئی۔ وہ شیشے سے سر ٹکائے باہر دیکھ رہی تھی۔ سیدھی ہو بیٹھی۔

نہیں میں بس ٹھیک ہوں۔ کچھ سوچ رہی تھی۔۔۔ اس کی طرف ایک اچٹتی نظر ڈال کر اس نے نگاہ جُھکاتے ہوئے کہا۔ تو اس نے سر اثبات میں ہلا دیا۔

پھر ایک لمبی خاموشی۔۔۔۔

ماہ نور نے اب کی اسے دیکھا تھا۔ وہ ڈارک براؤن کوٹ سوٹ میں ملبوس سنجیدہ دکھتا نظر سامنے سڑک پہ ٹکائے ہوئے تھا۔ اس کے بال ہمیشہ کی طرح جیل سے جکڑے ہوئے تھے۔ ماہ نور نے اس کے بالوں کو جیل کے بغیر بہت کم دیکھا تھا۔

کیا ہوا؟ وہ اسے ذرا حیران سی تھوڑی شرماتے شرماتے دیکھ رہی تھی۔ جب یک دم وہ مڑا۔ اور ماہ نور فوراً سیدھی ہوئی۔

نہیں کچھ نہیں۔ اسے اپنے اس طرح اسے دیکھنے پہ شرمندگی ہوئی تھی۔ ذریت نے اسے شرمندہ ہوتے نوٹس کیا تو ذرا سا مسکرا دیا۔ لیکن کہا کچھ نہیں۔

For more visit (exponovels.com)

بیس منٹ میں ان دونوں نے ایک دوسرے سے ایک دو باتوں کے سوا کوئی بات نہیں کی۔اور جب کار ایک خوبصورت مگر چھوٹے سے گھر کے سامنے جا کر رکی تب اس نے اترنے کو بولا تھا۔اور پھر خود بھی گاڑی باہر ہی پارک کرتا اتر گیا۔

گھر کا چھوٹا سا گیٹ پارک کرتے ہی سامنے بڑے سے ایل ای ڈی بلب کی روشنی میں دائیں جانب کا چھوٹا سا لان واضح دیکھائی دے رہا تھا۔اور وہیں لان کے اندر سے گزرتے سامنے ہی اندر کی جانب جانے کا رستہ بنا ہوا تھا۔پتھروں کی چھوٹی سی روش۔

لاؤنج کے کھولے دروازے میں ایک عمر رسیدہ خاتون کھڑیں ان دونوں کو دیکھ کر کھل کھلا اُٹھیں تھیں۔ماہ نور نے دور سے ہی ان کے چہرے پہ چمکتی روشنی دیکھ لی تھی۔ماہ نور ان سے شادی پہ مل چکی تھی۔

گھر کے اندر جاتے ہی ذریت کے قدموں کو ٹائر لگ چکے تھے جیسے۔وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا خاتون تک گیا۔اور دھم سا مسکراتا جُھک گیا۔اُنہوں نے اس کے سر پہ ہاتھ رکھ کر پیار دیا اور پھر ماتھے پہ ہلکے سے بوسہ لیا تھا۔ماہ نور بھی تب تک وہاں پہنچ چکی تھی۔

اسلامُ علیکم ماہ نور نے ان کے گلے لگ کر مسکرا کر سلام کیا تو وہ نہال ہوتیں اس کے اس کا ماتھے پہ بوسہ لے گئی تھیں۔ماہ نور مسکرادی۔اس کے مسکرانے پہ اُنہوں نے اس کے چہرے کا ہالہ بنا کر ایک پل کو اسے دیکھا۔

دُلہن تم تو بالکل کسی حور سی ہو۔

ذریت تم بہت خوش قسمت ہو۔بالکل پری ہے۔اس کے چہرے پہ بے ساختہ ہی سرخی اُمڈ آئی تھی۔آذر کی امی ہنس دیں۔اور اس کا چہرے چھوڑ دیا۔

تم شرماتی ہوئی بہت معصوم لگتی ہو۔

ذریت کے منہ سے جو جملہ نکلا تھا۔اس کا شور آنٹی تک تو نہیں گیا۔پر ماہ نور ضرور جاتے جاتے رک گئی اس نے سُنا۔اور اسے لگاس کے اندر سے شور سا ایک دم سے بلند ہوا ہو۔

For more visit (exponovels.com)

ذریت نے پہلی بار اس کی تعاریف کی تھی۔اور وہ کہہ کر خود وہاں رکا نہیں تھا۔بس کہا اور چلا گیا۔اور ماہ نور منہ کھولے ذرا حیران سی وہاں کھڑی رہ گئی۔

گواہوں کی موجودگی میں۔۔۔جب سوال کرنے والا ادھیڑ ادھیڑ کر سوال کرے اور عام تاثر یہ ہو۔کہ گواہی کے لئے منتخب شخص جھوٹ نہیں بولتا۔تو ملزم کو مجرم بننے سے کوئی نہیں روک سکتا۔

عدالت ؑ سجی گواہی سُنی اور فیصلہ کر دیا گیا۔

باورچی خانے سے پھوپوا سے پھک پھک کر روتی کو اپنے کمرے میں لائی تھیں۔اس کا دم گُھٹ رہا تھا۔اور اس سب سے الگ انجانے میں وہ امسلسل اپنے ہاتھ کو دوپٹے سے رگڑنے میں مصروف تھی۔چچی جان اور سدرہ اب کیا کریں گیں۔وہ دونوں اس سے انجان تھیں۔لیکن پھوپوا یک بات کو جانتی تھیں۔کہ اب کی بار اگلی پیچھلی راکھ میں چُھپی سب چنگاریاں ایک ساتھ بھامبڑ کی شکل اختیار کرلیں گی۔

فری مجھے بتاؤ کیا ہوا ہے ؟اصل صورتحال کیا بنی وہ نہیں جانتی تھیں۔بس آنکھوں دیکھے چند مناظر کے سوا اُنھوں نے دیکھا ہی کیا تھا۔

آنکھوں دیکھی بات سچی ہو لازم نہیں۔

پھوپو میں نہیں جانتی کہ آپ۔۔۔آپ نے کیا دیکھا۔پر۔۔۔

پلیز آپ مجھ پہ شک مت کریں۔میں نے کچھ نہیں کیا۔اس کی آنکھوں کے سامنے پھوپو کی بے یقین نگاہیں اب بھی گھوم رہی تھیں۔اس نے بے چین ہوتے ہوئے ان کے ہاتھوں کو تھامتے کہا۔تو وہ اس کو اپنے کندھے سے لگا کر سہلانے لگیں۔

فرح مجھے بتاؤ کیا بات ہوئی۔؟میں جانتی ہوں تم نے کچھ نہیں کیا۔لیکن تم مجھے بتاؤ۔تاکہ میں کچھ کر سکوں۔تاریخ اپنے آپ کو دوہرائے یہ میں ہونے نہیں دوں گی۔اس کے سر کو سہلاتے اس کے بولوں پہ نرمی سے بوسہ لیتے شفقت سے

اُنھوں نے کہا۔ بلکہ یقین دلایا تو فرح خان نے سب سچ سچ بتا دیا۔ اور پھوپو کو یاد آنے لگا۔ کہ کس طرح شادی پہ بھی وہ پریشان رہی تھی۔ کس طرح منہ لٹکائے وہ ساری شادی میں گھومتہ بلکہ چُھپتی رہی۔

پھوپو جی میں نہیں جانتی یہ سب کب اور کیسے ہوا۔ لیکن میرا یقین کریں میرا کوئی قصور نہیں ہے اس سب میں۔ روتے بِلکتے اس نے ایک بار پھر سے اپنی صفائی دی تو پھوپو اسے دیکھنے لگیں۔

اچھا تم چُپ کر جاؤ۔ کچھ نہیں ہوگا۔ اتنی بڑی بات نہیں ہے۔ اس کو حوصلہ دلانے کو اُنھوں نے کہا۔ تو فرح اُنہیں دیکھنے لگی۔ اسے پھوپو کی آنکھوں میں ماضی کے سائے لہراتے صاف نظر آرہے تھے۔ ان کے چہرے پہ درد کی لہریں وہ واضح دکھ سکتی تھی۔

تب وہ انیس بس کی تھیں۔۔۔

ہاں شائد۔۔۔

نہیں بلکہ وہ سچ میں اُنیس برس کی تھیں۔ اسے یاد تھا۔ وہ کیسے بھول سکتی تھی۔ تب ۱۴ سال کی تھی۔

اس شام کا واقع ہے۔ جب شبِ بارات کے آنے پہ وہ ان سے ضد کر کے اپنے لئے حلیم بنوا رہی تھی۔ انیس سال کی عمر میں بھی وہ ایک سمجھدار اور واضعدار لڑکی معلوم ہوتی تھیں۔ سہج سہج کر قدم رکھتیں۔ نرمی اور حلاوت کو لہجے میں سموئے بولتیں۔ اس کی ذہرہ پھوپو۔

پھوپو آپ نے میرے کپڑے دیکھے؟

پونی کو جھولاتی فرح کے دونوں گال سرخیاں جھلکا رہے تھے۔

بلوری آنکھوں نے مڑ کر اس جھلاتی پونی والی لڑکی کو دیکھا۔ اور مُسکرا دیں۔ اس لڑکی کو دیکھتے ان کی آنکھوں کی چمک دوچند ہو جایا کرتی تھی۔ جیسے ابھی ہوئی۔

نہیں لیکن تم دیکھاؤ گی تو میں ضرور دیکھوں گی۔

For more visit (exponovels.com)

چمچ کو دائیروں میں گھوماتے اس کی طرف آدھے چہرے کو موڑے اُنہوں نے کہا۔ تو فرح سمجھداری سے سر ہلاتی ان کے برابر جا کھڑی ہوئی۔ اور اُچھل کر بائیں جانب شیلف پہ بیٹھ گئی۔ یوں الگتا تھا۔ جیسے وہ ایسا ہر روز کرتی ہو۔

پھوپو کل ہم مُنا کے گھر چلیں؟ مُنا فرح کی اکلوتی دوست تھی۔

ہم م م۔۔۔ سوچ کے بتاؤں گی۔ وہ کبھی بھی کسی بھی بات پہ فوراََ سے پیشتر فیصلہ نہیں کیا کرتی تھیں۔

آپ جانتی ہیں۔ مُنا نے کل کلاس میں سب بچوں کو چوکلیٹس دیں۔ سارے بچے خوش تھے۔ مجھے بھی اس کی چوکلیٹ اچھی لگی۔ وہ مزے کی تھی۔

اس کے بابا لندن سے آتے ہوئے لائے تھے۔ وہ بولتی اچھی لگ رہی تھی۔ اور پھوپوا سے سُنتی۔۔۔

وہ ایسے ہی بغیر بریک کے بولا کرتی تھی۔

پھوپو جی۔۔۔

ہم م۔۔۔

جب آپ لاہور جائیں گیں۔ مجھے اپنے ساتھ لے کے جائیں گی ناں؟ وہ جانتی تھی۔ کہ اُنہیں لاہور سے گریجویشن کرنے کا کس قدر شوق تھا۔

پتہ نہیں۔۔۔

لیکن آپ نیک کہا تھا۔ کہ آپ مجھے ہر جگہ اپنے ساتھ رکھیں گیں۔ ان کے پتہ نہیں کہنے پہ اسے غصہ آیا تھا۔ وہ ان کے ساتھ جانا چاہتی تھی۔

میں نے وعدہ کب کیا؟ میں نے تو بس یہ کہا تھا۔ کہ دیکھیں گے۔ کہ تمہیں ساتھ لے کے جانا ہے یا نہیں۔ اس کے چہرے پہ موجود بگڑے تاثرات سے لطف اُٹھاتے اُنہوں نے کہا۔ تو وہ منہ بگاڑ کر نیچے کود گئی۔ اور برنر بند کر دیا۔

ارے پاگل یہ کیا کیا؟

For more visit (exponovels.com)

آئیں میرے ساتھ میرا فرک دیکھیں۔وہ کل ہی سکول میں پہننے کے لئے نیا سوٹ لائی تھی۔اوراب بضد تھی۔کہ وہ دیکھ کے بتائیں۔کہ ٹھیک ہے؟آیا کہ اس پہ جچتا بھی کہ نہیں؟

بات سُنیں۔۔۔

راہداری سے گزرتے وہ کمرے کی جانب جارہی تھیں۔زہرہ فرح کی کسی بات پہ ہنس رہی تھیں۔جب پُشت سے پڑتی آواز پہ اُنہوں نے مڑ کر دیکھا۔اور پھر اگلے ہی لمحے سامنے کھڑے نوجوان کو دیکھ کر نظر نیچے کرکے سر پہ دوپٹہ ڈالا۔

کیا مجھے ایک کپ چائے مل سکتی ہے؟تئیس برس کا چھوٹی بھابھی کا بھائی ان کے گھر ایک ہفتے سے رہ رہا تھا۔وہ ادھر کس لئے آیا تھا۔زہرہ نے جاننے کی کوشش نہیں کی تھی۔

کیوں آپ کی بہن کو نہیں آتی؟فرح نے ناک چڑھا کر آنکھیں گھوما کر قدرِ ناگواری سے کہا۔تو وہ گڑبڑا گئے۔

آتی ہے۔لیکن وہ ابھی پتہ نہیں کہاہیں۔اور میرے سر میں شدید درد ہے۔کہنے کے ساتھ اُنہوں نے ماتھے کو بھی مسل ڈالا۔

اچھا میں بنا کے بھجوا دیتی ہوں۔فرح جاؤ تم کمرے میں۔میں بس دو منٹ میں آتی ہوں۔مہمان کا خیال کرکے اُنہوں نے کہا۔تو فرح منہ بسور کر چل دی تھی۔البتہ جانے سے پہلے اس نوجوان کو ضرور دیکھا تھا۔جو اسے کبھی اچھا نہیں لگا تھا۔

شکریہ۔۔۔

چائے کے ساتھ اگر ایک سر درد کی دوا بھی بھجوا دیں تو بہتر ہے۔وہ واپس مڑ رہی تھیں۔جب آواز پہ پھر رکیں۔اب کی بار جواب میں اُنہوں نے محض سر ہلانے پہ ہی اکتاف کیا۔اور کیچن کی جانب آگئیں۔

چائے بنا کر مازمہ کو پکڑانے کی غرض سے اُنہوں ے ارد گرد نظر دوڑائی تو دور نزدیک اسے نہ پا کر وہ باہر نکلی تھیں۔

ملازمہ بڑی بھابھی کے کمرے میں بیٹھی ان کی ٹانگوں کی مساج میں مصروف تھی۔جب سے رضا گیا تھا۔تب سے بھابھی بیگم نے بالکل چُپ سادھ لی تھی۔ہر وقت کمرے میں رہتیں۔

خود ہی دے آتی ہوں۔ ملازمہ گھر میں ایک ہی تھی۔ اسے مصروف دیکھ کر اُنہوں نے دروازے سے ہی چائے اور دوائی پکڑانے کا سوچا اور واپس باورچی خانے سے چائے کا کپ اُٹھا کر ٹرے میں رکھتے اُوپر آ گئیں۔

ہلکی دستک پہ دروازہ خود بخود کھلتا چلا گیا۔ کمرہ نیم تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ اور بھابھی کا بھائی اوندھے منہ لیٹا شائد سو چکا تھا۔

وہ اندر جانے سے جھجکتی معلوم ہوتیں تھیں۔ کہ اُنہوں نے راہداری سے پاؤں نہیں اُٹھائے۔

آ جائیں۔ دروازہ بجنے کے بعد مسلسل خاموشی کو پا کر اس نے یوں ہی لیٹے لیٹے کہا تو ذہرہ نے گلا کھنکارہ تھا۔

بولو لی کچھ نہیں۔

اس کے کھنکارنے پہ اس نے سر گھوما کر ان کی جانب دیکھا اور پھر مسکرا کر سیدھا ہوتا بیٹھ گیا۔

آپ کی چائے۔۔۔

شکریہ پلیز ادھر رکھ دیں۔ اس نے اسے وہیں کھڑے دیکھ کے سامنے کی میز کی جانب رکھنے کو اشارہ کرتے کہا۔ تو وہ ذرا دیر کو ٹھٹکیں اور پھر بارعب چال چلتیں آگے بڑھ گئیں۔

کیا آپ یہ مجھے پکڑا دیں گیں۔۔۔ پلیٹ میں رکھی دوائی کی طرف اس کا اشارہ تھا۔ ذہرہ نے گہرہ سانس لے کر پلیٹ اس کی جانب بڑھا دی۔

بہت معذرت چاہتا ہوں۔ آپ کو میری وجہ سے زحمت اُٹھانی پڑی۔ مسکرا کر پلیٹ سے اُٹھا کر دوا میں میں رکھتے اس نے کہا۔ تو اُنہوں نے جواب میں کوئی تاثر ظاہر نہیں کیا اور واپس مڑی ہی تھیں۔ جب پشت کی آواز پہ رُکیں۔

کیا آپ کو میرا یہاں رُکنا پسند نہیں؟ عجیب سے سوال پہ اُنہوں نے مڑ کر اسے دیکھا تھا۔

جی نہیں ایسا کچھ نہیں ہے۔ آپ کی بہن کا گھر ہے۔ میں آپ کون ہوتی ہوں آپ کو۔۔۔

اچھا۔۔۔

بڑی باتیں آگئی ہیں تمہیں بھی۔ذہرہ میں تو تمہیں معصوم ہی سمجھتی تھی۔ چھوٹی بھابھی کی آواز پہ وہ جو دروازے کی جانب پُشت کیئے کھڑی تھیں۔ایڑیوں پہ گھومیں۔

کیا مطلب؟ وہ اُن کا مطلب سمجھ نہیں سکی تھیں۔

مطلب تو اب تم اپنے بھائی سے پوچھنا۔ بہت سر چڑھ گئی ہو۔ تبھی نہ تہذیب رہی نہ عقل۔ان کے بھرپور طنز پہ بلبلا اُٹھی تھیں۔

بھابھی بیگم آپ کہنا کیا چاہ رہی ہیں۔؟

تم اتن معصوم نہیں ہو۔اپنے آپ کو بچہ سمجھنا چھوڑ دو۔ تمہیں نہیں معلوم کے غیر مرد کے کمرے میں منہ اُٹھا کر نہیں چل پڑتے۔ بھابھی کی بات پہ ان کا منہ کھول گیا تھا۔

لیکن بھائی صاحب نے خود۔۔۔

آپی میں نے ان سے چائے منگوائی تھی۔اس سے پہلے کہ وہ بات پوری کرتیں۔بھابھی کا بھائی خود ہی کہنے لگا۔بھابھی دانت کچکچا کر رہ گئیں۔

تم چپ کرو۔ میں نہیں کیا جانتی اس کو۔ایک نمبر کی ڈرامے باز اور مکار لڑکی ہے۔اور اگر تمہیں چائے پینی تھی تو مجھے کہہ دیا ہوتا۔بھابھی کی آنکھوں سے شرارے پھوٹ رہے تھے۔

ذہرہ منہ پہ ہاتھ رکھ کر اپنی سسکیاں روکتیں کمرے سے نکل گئیں۔

اس واقع نے ان کی زندگی پہ بہت گہرہ اثر ڈالال تھا۔اس واقع کے ٹھیک تین ماہ بعد بھابھی کی امی نے اپنے بیٹے کے لئے اس کا رشتہ مانگا تو گھر میں ایک بار پھر سے شور اور تماشا ہوا اور پھر انکار پہ اس معملے کا نبٹا دیا گیا۔

بھابھی نے اسی رات بھرے لاؤنج میں ان کی خوب بھائیوں کے سامنے عزت اُچھالی۔ مگر بھلا ہو۔ بڑے خان کا جن کی وجہ سے وہ بچ گئیں۔اُنہیں اپنی بیٹی جیسی بہن پہ یقین تھا۔

For more visit (exponovels.com)

بھابھی بات بڑھنے کی نہیں ہے۔ پر آپ جا کر خود بھی تو کچھ پوچھیئے۔ چچی بولتی راہداری میں آ رہی تھیں۔ ان کے ساتھ گھر کے سب موجود تھے۔ اور فرح کے رونے میں روانی آ چکی تھی۔ خان اپنی عزت کے معملے میں کتنے حساس ہوتے ہیں۔ یہ بات وہ بہت اچھے سے جانتی تھی۔ وہ پھوپو کے کندھے ست چمٹ کر رونے لگی۔

پھوپو کا دل بڑی شدت سے دھڑک رہا تھا۔ شادی کے تیسرے روز وہ آئیں تھیں۔ گھر مہمانوں سے بھرا پڑا تھا۔ ایسے میں بھابھی جانبوج کے بات کو ہوا دے رہی تھیں۔ اُنھوں نے کندھے سے لگی فرح کی پشت سہلائی۔

فرح۔ امی جی کی آواز میں غصہ تھا۔ شدید غصہ فرح مزید سُکڑ گئی۔

فرح۔۔۔ باہر آؤ۔ وہ غصے سے بھری دروازے کی روہداری میں کھڑی تھیں۔ فرح نے سر ہلا دیا۔

امی۔۔۔ امی جی میں نے کچھ نہیں کیا۔ میں نے کچھ غلط نہیں کیا۔

فرح میں جو کہہ رہی ہوں بس وہ کرو۔ پھوپو کے کندھے سے الگ کرتے وہ چیخی تھیں۔ فرح مکینکی انداز میں کھڑی ہو گئی۔

راہداری میں سب مہمان ہونک بنے کھڑے تھے۔ جن میں سدرہ سب سے نمایاں تھی۔ اس نے جانبوج کے بات کو ہوا دی تھی۔ اور جا کر چھوٹی دادی کے سامنے واقع کو افسانہ بنا کر سُنایا تو وہ امی جی کو ڈانٹنے لگی تھیں۔ اور اب اسی کا انجام نکل رہا تھا۔ کہ شور کی آواز سُن کر گھر کے مرد بھی جمع ہو چکے تھے۔

کاشف ان میں موجود نہیں تھا۔ شائستہ البتہ وہیں تھی۔ اور بھائی کو بچانے کے لئے بڑھ چڑھ کر اسکے کرادار کے خلاف گواہیاں دے رہی تھی۔

خان لالہ میرا بھائی ایسا بالکل نہیں ہے۔ بلکہ آپ کی ہی صاحبزادی نہیں جینے دے رہی تھی اسے۔ ساری شادی میں میرے بھائی کا جینا حرام کر چھوڑا۔ کہہ رہی تھی۔ میرے ساتھ تصویر لو اپنی سہیلی کو بھیجنی ہے۔ لاؤنج کے وسط میں کھڑی وہ کیا کہہ رہی ہے۔ فرح نے ڈبڈبائی آنکھوں سے سُنا تھا۔

شائستہ جھوٹ مت بولو۔ میری فرح ایسی نہیں ہے۔

اور خان لالہ بات تو اتنی بڑی ہے بھی نہیں جتنا چھوٹے بھا کی سالی بڑھا رہی ہے۔ آج چپ ہونے کا مطلب تھا۔ کہ فرح کی اگلی ساری زندگی کو سوالیہ نشان بنا دینا۔ وہ ہرگز برداشت نہیں کر سکتی تھیں کہ ان کی لاڈلی پہ کوئی انگلی اُٹھائے۔

تم نے جو پرورش کی ہے۔ تم تو یہی کہو گی۔ کہ بات تم تک نہ آئے۔۔۔ اور تمہارا بھی سب کو خوب معلوم ہے۔ تمہارے بھی۔۔۔

بس بہت ہوا۔ چلو لڑکی تم اپنے گھر چلو۔ چھوٹی دادی مسلسل شائستہ کو بولتا دیکھ کر غصے سے کہہ گئی تھیں۔ سدرہ نے سر جھٹکا۔ تو شائستہ نے بھی جانے کی۔

دادی بی۔ ان کو سمجھائیں خامخواہ ہم پہ لزام نہ لگائیں۔ جو دیکھا وہی آپ کو بتایا۔ ہم تو آپ کے گھر کی عزت کی خاطر کہہ رہے ہیں۔ آج آپ کو احساس ہو گا تو۔ کل کو ایسی کوئی بات نہیں ہو گی۔ جس سے آپ کو شرمندہ ہونا پڑے۔ سدرہ کی زُبان فراٹے بھر رہی تھی۔ پھوپو نے گھر کے تمام نفوس پہ نظر ڈالی۔ ان کے شوہر بھی وہیں تھے۔ اور صورتِ حال کو سمجھنے کی کوشش میں لگتے تھے۔ مریم نے ان کے بازو کو پکڑ رکھا تھا۔ وہ چہرے سے پریشان لگ رہی تھی۔

خان لالہ اپنی بیٹی کا چہرہ مسلسل دیکھ رہے تھے۔ ساتھ ہی چھوٹے خان بیٹھے تھے۔ اور خاموش تھے۔ ہمیشہ کی طرح۔

بابا میں ن کچھ نہیں کیا۔ یہ سب۔۔۔

چپ کر جاؤ فرح۔ تم اب کچھ مت بولو۔ امی جی صوفے پہ بیٹھی تھیں۔ بڑے خان کے بائیں جانب۔ ان کے کہنے پہ اُنہوں نے بہت غصے سے اپنی بیوی کو دیکھا تھا۔

امی جی میں نے کچھ نہیں۔

فرح بی بی تم کہو۔ کہ جھوٹ ہے اس مردود نے تمہارا ہاتھ نہیں پکڑا۔ تمہارے آنسو صاف نہیں کئے۔

ارے میں کہتی ہوں۔ کس کندے خاندان میں مجھے بیاہ دیا اباجی نے۔ چچی کی دہائی ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھیں۔

بس کرو۔۔۔ بات کا کچھ پتہ چلے۔ بلکہ تم جاؤ کمرے میں۔ چھوٹے خان کو اپنی بیوی کی عادتوں کا خوب علم تھا۔ خامخواہ اُنہیں اتنے مہمانوں کے سامنے ڈرامہ لگانے کا موقع درکار تھا۔

کیوں میں کیوں جاؤں۔ اس کو کیوں نہیں بھیجتے۔ شوہر کی جانب سے اس ذلت پہ وہ بلبلا اُٹھی تھیں۔ سب مہمان اس خاندانی ڈرامے کو دیکھ رہے تھے۔ اور بہت کچھ سمجھ بھی رہے تھے۔

فرح نے روتے ہوئے بابا کو دیکھا تو اس کا دل کٹ کر رہ گیا۔ بابا کا سر جُھکا ہوا تھا۔ اسے لگا اس کی ساری دنیا بھی اگر اس سر کا غرور واپس لوٹانے میں لگادی جائے تو بھی کم ہے۔ باپ کی عزت بیٹی کے دم سے ہوتی ہے۔ بیٹی کوئی بھی غلط قدم اُٹھائے۔ اس سے باپ چاہے وزیرِ اعظم ہی کیوں نہ ہو اپنی عزت کی اُچھلتی پگڑی کو بچا نہیں سکتا۔ نہ تھام کر واپس سر پہ پہن سکتا ہے۔

فرح خاموشی سے واپس مرے قدموں کے ساتھ مڑی اور بھاگ کر اپنے کمرے میں گُھس کر دروازہ بند کر لیا۔ وہ مر کر بھی ان کا سامنا نہیں کر سکتی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا۔ خودکشی کر لے۔ سارے خاندان نے اس کے بابا کی عزت پہ داغ دیکھا تھا۔ اس کے بابا کا نام تھا مکام تھا۔ وہ مر رہی تھی۔

اس نے بیڈ پہ گر کر منہ پہ تکیہ رکھ لیا۔

:::::::::::

چائے۔۔۔

کھلے آسمان کے تلے وہ کھڑی تھی۔ جب پُشت پہ پڑتی آواز پہ وہ مڑی۔ آپی مومنہ تھیں۔ بھاپ اُڑاتے کپ کو اس نے تھام لیا۔

کیا ہوا۔ اندر تم بور ہو رہی تھی۔؟

کھانے کے بعد وہ وہاں سے اُٹھ آئی تھی۔ اکمل اپنی منگیتر اور بہن کے ساتھ آیا ہوا تھا۔ اور ان کے آتے ہی ذریت کو جیسے ہوش نہیں رہا تھا۔ اسے اُمید تھی۔ کہ وہ آج اس کی تعریف کرے گا۔ اگرچہ اس نے میک اُپ کے نام پہ لپسٹک تک نہیں لگائی تھی۔ مگر پھر بھی وہ اتنا تو جانتی تھی۔ کہ اللہ نے اسے سادگی میں بھی بہت حُسن دیا تھا۔ مگر ذریت کے رویئے نے اسے کافی حیران اور تکلیف سے دوچار کیا تھا۔ اسی لئے وہ اُن سب کو ان کے یادگار ماضی کے ساتھ چھوڑ کر خود یہاں چلی آئی تھی۔ کہ آیا کہ اسے اس کی یاد آتی بھی ہے یا نہیں۔

وہ تو نہیں آیا مگر مومنہ آپی ضرور آگئی تھیں۔ وہ مریم آپی جیسی تھیں۔

نہیں میں بور نہیں ہو رہی تھی۔ لیکن حبس ضرور تھا۔ جس نے مجھے وہاں بیٹھنے نہیں دیا۔ ورنہ وہاں سب اتنی مزے کی باتیں کررہے تھے۔ کہ بوریت کا سوال ہی نہیں بنتا۔ جواب میں مسکرا کر چائے کا گھونٹ لیتے اس نے تفصیل سے بتایا تو وہ بھی مسکرا دیں۔

ہاں۔۔۔ ان تینوں کا بچپن بہت اچھا تھا۔ میں اور مریم بھی بہت مزے کرتے تھے۔ ہمارے گھر ایک دوسرے کے قریب تھے۔ اس لئے آتے جاتے رہتے تھے۔

ہم۔۔۔ دادی جان آپ کو اور آنٹی کو بہت یاد کرتی ہیں۔ شفٹنگ کے بعد آپ نے چکر ہی نہیں لگایا۔ میں آئی ہوں۔ اب آپ بھی آنا۔ وہ سادگی سے گویا ہوئی تو آپی مسکرا دیں۔

ہاں ضرور۔

تم بتاؤ۔ ذریت تمہارا خیال تو رکھتا ہے ناں۔ ویسے یہ سوال مجھے پوچھنا تو نہیں چاہیے۔ کہ مین جانتی ہوں وہ ہمیشہ سے ہی کئیرنگ ہے۔ لیکن تم بتاؤ۔

ماہ نور نے گہرہ سانس لے کر تلخی چھپائی۔

ابھی تک توسب معمول پہ ہے۔بے ساختہ ہی اس نے وہ کہہ دیا جو وہ کہنا نہیں چاہتی تھی۔آپی مومنہ نے اُلجھ کے اسے دیکھا۔

کیا ہوا؟ماہ نور کوئی۔۔۔

آپی آپ نے تو میری بیوی کو رکھ ہی لیا ہے۔واپس کر دیں اب۔اس سے پہلے کے آپی کچھ کہتیں۔ذریت کی بات پہ مڑ کر اسے دیکھا۔اور ہنس دیں۔ذریت نے اسے بازو سے پکڑ کر اپنی جانب کھینچ لیا۔ماہ نور کے ہاتھ میں پکڑے کپ سے گرم چائے چھلک کر اس کے انگوٹھے کو جلا گئی۔وہ کراہ کر رہ گئی۔

لو ماہ نور تمہارا میاں تو مجھ پہ الزام لگانے لگا۔

رکھو میاں مجنو اپنی بیوی میں جا رہی ہوں۔مسکر اس چھیڑ چھاڑ سے اُنہوں نے پہلو بچا یا اور اندر کی جانب بڑھ گئیں۔ماہ نور نے بہت غصے سے اسے دیکھا۔جو اس کا کپ پکڑ کر اب چائے پی رہا تھا۔اور خاموش تھا۔

اس کے ہاتھ پہ جلن بڑھ گئی۔

آپ نے میرا ہاتھ جلا دیا۔

اوہ سوری۔مجھے اندازہ نہیں ہوا۔چونک کر اس نے ہاتھ بڑھا کر روشنی میں دیکھا۔جلد تھوڑی سرخ تھی۔

آپ کو ویسے بھی پروا نہیں ہوتی۔بڑا منہ بنا کر اس نے ناگواری سے کہا۔تو ذریت کو عجیب سا لگا۔

ک۔۔۔کیا مطلب؟

نہیں کچھ نہیں۔ماتھے پہ بل لئے وہ واپس مڑ گئی۔

تم کچھ کہہ رہی تھی۔کہو بھی۔میں سُن رہا ہوں۔

ہاں تو سُنیں ان ہواؤں کو۔ان فضاؤں کو۔وہ اپنی جگہ پہ کھڑا تھا۔اس نے جاتے ہوئے مڑے بغیر رک کر کہا۔تو ذریت دھیمے سے مسکرا دیا۔

For more visit (exponovels.com)

لگتا بیگم صاحبہ غصہ کر گئیں۔

::::::::::::

For more visit (exponovels.com)

رات کا وقت تھا۔ سب اس کے کمرے میں موجود اسے دیکھ رہے تھے۔ جو بابا کے سامنے ان کے گھوٹنے پکڑے بیٹھی تھی۔

بابا میں نے کچھ نہیں کیا۔ امی جی، آپ میرے لئے بہت اہم ہیں۔ آپ کی عزت میرے لئے اپنی جان سے زیادہ اہم ہے۔ میرا یقین کریں۔ اسے اپنے باپ کا جھوکا سر رولا رہا تھا۔ بابا نے اس کے ہاتھ جھٹک دئے۔

قصور تمہارا نہیں ہے فرح۔ تمہاری ماں نے جب کسی کی بیٹی کے بارے میں بات کرتے ہوئے نہیں سوچا۔ تو آج میں کیسے اس تکلیف سے اس رسوائی سے بچ جاتا۔ جو کل تمہاری ماں نے بویا۔ اب تمہیں وہ کاٹنا پڑے گا۔ ان کے لہجے میں فیصلے لے بعد کا سخت تاثر تھا۔ امی جی پہلو بدل گئیں۔

خان لالہ اپنی اولاد کے ساتھ کون ظلم کرتا ہے۔ آپ جانتے ہیں قصور اس کا نہیں پھر بھی آپ یہ سب بول رہے۔ پھوپو وہ واحد انسان تھیں جو اس نکاح کے خلاف تھیں۔

لڑکی چپ رہو۔ یہی فیصلہ مناسب ہے۔ کاشف سے نکاح کر کے اسے کے ساتھ بھیج دو۔ چچی دادی کی بات سُن کے فرح کا دل کامپ اُٹھا تھا۔ وہ ایک ناگوار اور تکلیف دے شخصیت کا حامل انسان تھا۔ دھوکے باز۔ لڑکیوں کو ورغلانے والا۔ اور عین موقع پہ چھوڑ کر بھاگ جانے والا۔ اس سے شادی کر کے وہ اپنے ماں باپ کو کبھی سُکھ نہیں دے سکتی تھی۔

بابا جان۔۔۔ وہ اچھا نہیں ہے۔

پلیز امی جی۔ میری بات کو سمجھیں۔ اس کا دل چاہ رہا تھا۔ روئے دنا کو تہس نہس کر دے۔

ہاں تم تو جیسے بہت اچھی ہو۔ چچی کا وار بھرپور تھا۔

جاؤ فرح اپنے کمرے میں۔ وہ لوگ آتے ہی ہوں گے۔ بابا کے لہجہ مضبوط تھا۔ پھوپو نے بڑھ کر اسے کندھوں سے تھام لیا۔

اس نے بہت شکوہ کرتی نگاہوں سے اُنہیں دیکھا تو وہ نگاہ پھیر گئیں۔

جس وقت وہ کمرے میں آئی پھوپو کے ساتھ پھوپھا جی بھی تھے۔

ذہرہ یہ سب کیا چل رہا ہے۔ مجھے تو سمجھ نہیں آ رہی۔ آپ کی فیملی بچی کی بات کو سمجھ ہی نہیں رہی۔ انہیں بھی اس فیصلے پہ احتجاج تھا۔ اسی لئے اس کے باتھ روم میں جاتے ہی پھوپو کے سامنے کہہ دیا۔ پھوپو نے نظر چورائی۔

میں نہیں جانتی کیا کروں۔

آپ کر بھی کیا سکتی ہیں۔

کر تو سکتی ہوں۔ اگر آپ میری مدد کریں۔ ان کا لہجہ ذو معنی تھا۔ وہ اُلجھے۔

کیا مطلب ؟

میں اسے پالا ہے۔ اس کی پرورش کی ہے۔ میں اسے اس طرح آگ میں کودنے نہیں دے سکتی۔ پلیز میری مدد کریں۔ ان کی آنکھوں میں نمی اترنے لگی تھی۔ وہ بس خاموشی سے اُنہیں دیکھتے رہے۔

کیا چاہتی ہیں آپ ؟

ہم اسے لے جاتے ہیں۔ لاہور میں اسے ہوسٹل میں بیج دیں گے۔ خان لالہ کو جب احساس ہوگا۔ تو صورتِ حال بھی بدل جائے گی۔ میں اسے ساری زندگی کے لئے اس جزباتی فیصلے کی نظر نہیں کر سکتی۔ ان کا لہجے بتاتا تھا۔ کہ وہ اس فیصلے پہ ڈٹ چکی ہیں۔

آپ جانتی ہیں اس کا انجام کیا ہوگا۔ آپ کا خاندان آپ سے ناراض ہو سکتا ہے۔ ادھر آنا جانا آپ کا بند ہو سکتا ہے۔ وہ دور اندیش اور سمجھدار انسان تھے۔

قیسر پلیز آپ بات کو سمجھیں۔ میں نہیں چاہتی وہ اس انسان کے ساتھ رہے۔ جو مشکل وقت میں دُم دبا کر بھاگ گیا۔ اگر کچھ تھا بھی تو اسے چاہیے تھا۔ کہ سامنے آتا۔

اس کا تو یہ بھی نہیں پتہ۔ کہ آیا کہ گھر پہ وہ ہے بھی کہ کہیں چپ گیا۔ کمرے کی گھمبیر خاموشی میں ان دونوں کی مدھم سر گوشیاں نمایاں تھیں۔

سوچ لیں۔۔۔

آپ بس ساتھ چلنے کا وعدہ کریں۔

چلیں پھر بلائیں آپ اُنہیں۔ میں مریم کو گاڑی میں بیٹھاتا ہوں۔ وہ عہد کر چکے تھے۔ اُنہیں ان کا ساتھ دینا تھا۔ ان کی شریکِ حیات کو ان کے ساتھ کی ضرورت تھی۔ وہ انکار نہیں کر سکتے تھے۔

فرح جس وقت باہر آئی پھوپو اس کا بیگ پیک کر چکی تھیں۔ اسے دیکھ کر وہ اس کی جانب بڑھیں اور اس کا چہرہ تھام کر اسے دیکھا۔

فری میں تمہیں لے کر جا رہی ہوں۔ تم کاشف سے شادی نہیں کرو گی۔ یہ میرا فیصلہ ہے۔ اس کی آنکھوں میں دیکھتے اُنہوں نے کہا تو اس کی آنکھیں ساکت ہو گئیں۔ اور پھر سر مکینکی انداز میں نفی میں ہلا۔

نہیں۔۔۔ نہیں پھوپو۔ میں ایسا نہیں کروں گی۔ میں بھاگوں گی نہیں۔

بھاگ نہیں رہی۔ تم میرے ساتھ جا رہی ہو۔ میں فون کر کے لالہ کو بتا دوں گی۔

نہیں پھوپو۔ میں ان کا مان اور نہیں توڑ سکتی۔

اُنہیں تم پہ مان اب ہے بھی نہیں۔ تم نہیں جانتی جب ایک بار اعتبار ٹوٹ جائے تو دوبارہ نہیں جُڑتا۔ ضدمت کرو۔ اور چادر اُٹھاؤ۔ وہ اس کی منت کر رہی تھیں۔

نہیں میں نہیں جاؤں گی۔ بعد میں جو میرے کردار پہ کیچڑ اُچھلے گا۔ وہ میں برداشت نہیں کر پاؤں گی۔

فرح خان یہاں کوئی کسی کو زیادہ دیر تک یاد نہیں رکھتا۔ اور میں تمہیں کہہ رہی ہوں۔ کہ میں تمہاری پالنے والی تمہیں لے کر اپنے ساتھ جا رہی ہے تو کوئی مجھے نہیں روک سکتا۔ اُنہوں نے الماری کھول کر اس پہ چادر بھی دے دی تھی۔

For more visit (exponovels.com)

. پھوپو آپ مجھے اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتیں۔میں وہاں لوگوں کی باتوں کا مقابلہ نہیں کر پاؤں گی۔ پلیز۔۔۔

میں تمہیں کراچی نہیں لے کر جا رہی۔ تم لاہور میں رہو گی۔ ہوسٹل میں۔ میں جانتی ہوں کہ تمہارا میرے ساتھ جانا تمہارے لئے سہی نہیں ہے۔ لیکن تم اگر لاہور میں رہو گی تو تم محفوظ رہو گی۔ میرے پہ بھروسہ رکھو۔اُنہوں نے اسے یقین دلایا اور اس نے کر لیا۔

:::::::::::::::

کیا تم ابھی دادی سے ملو گی۔ گاڑی کا دروازہ بند کرتے اس نے پوچھا۔ تو وہ جو پہلو میں بیٹھی تھی۔اسے دیکھنے لگی۔ذریت کچھ بدل بدل سا گیا تھا۔

میں اُن سے کل مل لوں گی۔

کیوں؟

بھائی میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ نظر جھوکاتے اس نے ہاتھ کی ہتھیلی مسلتے ہوئے کہا۔ تو وہ سر ہلا کر انگیشن میں چابی لگا نے لگا۔

کیا وہ نہیں جانتے کہ اس وقت تم اپنے شوہر کے ساتھ ہو۔اور تمہیں واپسی پہ دیر ہو سکتی ہے۔ گاڑی کا رُخ موڑتے اس نے سارا دھیان سڑک کی جانب رکھتے ہوئے پوچھا تھا۔ماہ نور نا سمجھی سے اسے دیکھنے لگی۔

آپ کہنا کیا چاہتے ہیں۔ماتھے پہ ناگواری کے بل تھے۔

کچھ نہیں! سیدھی سی بات کر رہا ہوں۔

مجھے سیدھی باتیں سمجھ نہیں آتیں۔

اچھا۔۔ بڑی عجیب ہو پھر تو۔ مسکرا کر اس نے ایک ابرو اُٹھا کر کہا تو وہ منہ بنا کر شیشے سے باہر دیکھنے لگی۔

For more visit (exponovels.com)

آپ کا اور میرا ایسا کوئی رشتہ نہیں ہے۔ کہ آپ مجھ سے فری ہوتے پھیریں۔ بغیر سوچ سمجھے اس نے ایک ایسی بات کہی تھی۔ جسے کوئی بھی عقل مند سُنتا تو اس کا وہی حال ہوتا۔ جو اس کا اس وقت ہوا تھا۔

ہاہاہاہاہا۔ کیا۔۔۔ کیا کہہ رہی ہو۔ گاڑی چلاتے ایک دم سے ذریت کو ہنسی آئی تھی۔ تم جانتی بھی ہو۔ تم کیا کہہ رہی ہو۔ اسے لگا وہ مذاق کر رہی ہے۔

یہ کوئی مذاق کی بات نہیں ہے۔۔۔

اچھا پھر کیسی بات ہے۔ آج کی تاریخ کا سب سے اچھا جوک ہے یہ۔

ہاہاہاہا بہت مزا آیا۔۔۔ اسے اس کا ہنسنا ایک آنکھ نہیں بھایا تھا۔ ذریت مسکراہٹ روک کر سامنے کے شیشے سے باہر دیکھتا رہا۔

غالباً اس قسم کی یہ اُن کی پہلی گفتگو گی تھی۔ اگرچہ کم وقت میں کی گوئی مختصر سی گفتگو۔ مگر ذریت کو اسے تنگ کرنے میں مزہ آیا تھا۔ شائد نتاشا کے چلے جانے سے اس پہ جو زنگ سا چڑھنے لگا تھا۔ وہ اب آہستہ آہستہ اُتر رہا تھا۔

تمہارے پاس میرا فون نمبر تو ہے ناں۔۔۔ وہ پوچھ رہا تھا۔ یا بتا رہا تھا۔ یا پھر کچھ جتا رہا تھا۔ بلکہ بہت کچھ جتا رہا تھا۔ ماہ نور نے نا سمجھی سے دیکھا۔

کیا۔۔۔؟

فون۔۔۔ فون نمبر ہے؟ ڈیش بورڈ پہ پڑے فون کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ وہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔ اور سر اثبات میں ہلا دیا۔ جی! ہے۔۔۔

کوئی بھی مسلہ ہو۔ یا پھر کچھ چاہئے ہو۔ تو مجھے کال کر دینا۔۔۔ گاڑی کا رُخ گھر کی جانب موڑتے اس نے کہا۔ تو ماہ نور نے ذرا گلا کھنکارا۔

ایک بات پوچھوں؟

For more visit (exponovels.com)

پوچھو۔۔۔

کیاآپ سے مریم آپی نے کچھ کہاہے۔ لیکن میں نے اُنہیں کچھ نہیں کہا۔

کیاوہ غصہ ہوئیں۔ پروہ کیوں ہوں گیں۔ ایک سوال دوسراجواب۔۔۔

کیاتم ہمیشہ سے ایسے بولتی ہو۔

کیامطلب؟

کچھ نہیں۔۔۔ مجھے کسی نے کچھ نہیں کہا۔ اور ہاں۔ دادی تم سے ملناچاہ رہی تھیں۔ اس لئے میں نے پوچھاتھا۔ بغیر کسی لگی پلٹی کے اس نے سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔ توماہ نور نے اسے ایسے دیکھا۔ جیسے کہہ رہی ہو۔ ہاں جانتی ہوں۔ تم کہاں اتنے سگھے میرے۔ وہ خاموش ہی رہی۔ اسے ویسے بھی ذریت سے کوئی اُمید نہیں تھی۔ شادی سے پہلے کاامپریشن وہ اتنابُرابنا چکاتھا۔ کہ وہ اس سے اُمیدیں کم ہی لگاتی تھی۔ مریم آپی اسے کال پہ اکثر سمجھاتی رہتی تھیں۔ مگر وہ بس سُن کر خاموش ہی رہتی۔ اُس کاخیال تھا۔ کہ اگراُن کابھائی اسے کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ تواسے بھی کوئی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ناک کامسلہ توہمیشہ سے ہی تھا۔

اس کے گھر کے سامنے آکراُس نے گاڑی روکی۔ تووہ خاموشی سے سیٹ بیلٹ ہٹاتی، دروازہ کھولتی باہر آگئی۔ اس نے کچھ کہانہ ماہ نور نے۔

::::::::::::

لاہور آنے کے بعد پھوپو نے گھر باباکوفون کرکے سب بتادیا۔

اُنہوں نے یہ کہا۔ کہ وہ فرح کواپنے ساتھ لے آئی ہیں۔ اور جب تک وہ چاہیں گیں۔ فرح ان کے پاس ہی رہے گی۔ اور اگرفرح کادل چاہاتووہ اسے لاہور بھیجوادیں گی۔ مختصر کال میں اپنے بھائی کواُنہوں نے وہ سب سمجھادیاتھا۔ جو حقیقت

رکھتا تھا۔اور جس وقت اُنہوں نے کال بند کی۔ فرح ہوسٹل کا گیٹ پار کر چکی تھی۔ صبح ہی صبح اسے ہوسٹل کے سیٹنگ میں دیکھ کر وارڈن تھوڑی حیران ہوئی۔ لیکن پھر پھوپو کو ساتھ دیکھ کر اس کے لئے کمرہ کھلوادیا۔

تم پریشان مت ہونا۔ میں تمہیں کال کرتی رہوں گی۔اور ہاں جب تک معملہ حل نہیں ہو جاتا تم یہیں رہنا۔اُن کا انداز سمجھانے والا تھا۔وہ خاموشی سے کپڑوں والا بیگ تھامے کھڑی فرش کو دیکھتی رہی۔

کچھ کہو گی نہیں۔اسے مسلسل خاموش دیکھ کر اُنہوں نے پوچھا۔تو اس نے سوال کرتی نظروں سے اُنہیں دیکھا تھا۔

مجھے ادھر کب تک رہنا پڑے گا۔اس کی آواز میں ہلکی کپکپی تھی۔ پھوپو نے غور سے اسے دیکھا۔جب تک کاشف اپنی غلطی نہ مان لے۔

کیا یہ ضروری ہے؟

ہاں۔۔۔ میرے لئے تمہارا کردار بہت اہم ہے۔

اس نے خاموشی سے اُنہیں دیکھا۔اور پھر سر جُھکاتی اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔

سُنو۔۔وہ ابھی راہداری پار بھی نہیں کر پائی تھی۔جب اُن کی آواز پہ رکی۔اور اترے چہرے کے ساتھ مڑ کر اُنہیں دیکھا۔

جی؟

یہ موبائل رکھ لو۔ایک ہاتھ میں پکڑے سیاہ چمکتی سکرین والے موبائل کو اس کی جانب بڑھاتے اُنہوں نے کہا۔تو اس نے سر نفی میں ہلادیا۔

سارا فساد ہی اس موبائل کا ہے۔

فساد اس کا نہیں اُن شیطانی ذہنوں کا ہے۔جو ہمارے ارد گرد موجود ہیں۔اور اب خاموشی سے اسے اپنے پاس رکھو۔ میں فون کروں گی۔ان کی تاکید یا حکم جو بھی تھا۔پہ اس نے سر ہلا کر موبائل تھام لیا تھا۔

زندگی میں شائدٗاس نے اتنا بڑا قدم اُٹھانے کا کبھی سوچا ہوتا۔جو اس بار اس نے اُٹھا لیا تھا۔۔۔وہ سمجھ رہی تھی۔اس نے یہ فیصلہ محض پھوپو کے دباؤ کی وجہ سے نہیں کیا تھا۔وہ اس لمحے خود غرض ہوگئی تھی۔اسے ایسے انسان کے ساتھ بالکل نہیں بندھنا تھا۔جس کا کردار غیر یقینی سا تھا۔اور جس کی وجہ سے وہ بھرے خاندان کے سامنے رسوا ہوئی۔

والدین جب بے عتباری کی دیوار کو اپنے اور اپنے بچوں کے درمیان حائل کر لیتے ہیں تب ایسے ہی ہوتا ہے۔

ایک طرف مانور تھی۔جس کے بابا کے اعتبار نے اسے ڈھارس دئے رکھی۔تو وہ ذریت جیسے سخت دل انسان کے ساتھ چل پڑی۔جبکہ۔۔۔

جبکہ دوسری طرف فرح خان تھی۔جس کے ایک رشتے نے بھی اسے اعتبار نہیں دیا۔اس کو گھر سے بے گھر ہونا پڑا۔

اس نے ہوسٹل میں آنے کے بعد پھوپو سے اجازت لے کر ایک پرائویٹ سکول میں نوکری شروع کردی۔سکول دس منٹ کی پیدل مسافت پہ ہی واقع تھا۔اور ہوسٹال کی وارڈن کی جاننے والی کا تھا۔یہ اس کی زندگی کا ایک نیا باب تھا۔اور اس نئے باب میں ابھی ماہ نور اور ابرار ابتسام کا کوئی تعلق نہیں تھا۔

:::::::::::

یہ آذر کی والدہ سے ملنے کے ٹھیک دو دن بعد کی بات ہے۔

صبح کا روشن دن اپنا آغاز کیا چاہتا تھا۔وہ ابھی وہیں اپنے بھائیوں کے پاس تھی۔اور ابھی کچھ دن مزید رُکنے کا سوچے بیٹھی تھی۔جب وہ آگیا۔

ماہ نور نے چائے پینے کے بعد کپ خاموشی سے دھویا۔اور اپنے کمرے میں آگئی۔بابر بھائی اور ابرار بھائی دونوں آفس جا چکے تھے۔

کمرے میں گندگی نام کو نہ تھی۔ہر ایک چیز ایک ترتیب کے ساتھ سنوری ہوئی تھی۔وہ دروازے میں کھڑی کچھ دیر کچھ سوچتی رہی اور پھر واپس وہیں مڑ کر ابرار کے کمرے میں آگئی۔

بیڈ کور بے شکن تھا۔ بلینکٹ ویسے کا ویسا تہہ لگا پڑا تھا۔ مطلب وہ سوئے نہ تھے۔ جوتوں کے سٹینڈ پہ موجود ترتیب سے جوتے دھرے تھے۔اور کمرے کی ہر چیز ایک ترتیب لئے ہوئے تھی۔ایک سوائے اس میز کے جس پہ بہت سے کاغذات بکھرے اپنی حالت پہ رو رہے تھے۔

وہ آگے بڑھ کر انہیں اکٹھا کرنے لگی۔

کاغذات کو ایک ترتیب سے رکھ کر اس نے اُنہیں ایک فائل میں سیٹ کیا۔اور پھر وہیں میز کی دراز کھول کر اندر فائل رکھنے لگی۔ ابھی فائل رکھ کر وہ دراز بند کرنے ہی والی تھی۔ جب سامنے پڑی چمکتی سکرین کو دیکھ کر ہاتھ وہیں تھم گیا۔

وہ موبائل فرح کا تھا۔

لیکن یہ ابرار بھائی کے پاس کیا کر رہا ہے۔اس نے موبائل باہر نکال لیا۔اور سائڈ کے بٹن سے آن کیا۔موبائل کی سکرین پہ کمپنی کا لوگو گھومنے لگا۔اور فون وائبریٹ ہوا۔

چمکتی صاف سکرین کو دیکھ کر اس نے چند لمحے ہونٹ کاٹتے ہوئے سوچنے میں لگائے اور پھر موبائل کو آگے پیچھے انگلی پھیر کر کچھ دیکھنے لگی۔ تبھی بہت مدھم سی دروازے کی دستک پہ اس نے چونک کر سر اُٹھا کر سامنے دیکھا۔ایش گرے پینٹ کوٹ میں بائیں ہاتھ کو پینٹ کی جیب میں ڈالے۔دائیں ہاتھ کو دروازے پہ رکھے۔وہ سنجیدہ سا کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ماہ نور اسے وہاں دیکھ کر حیرت ہوئی۔ جس کا برملا اظہار کرنے میں اس نے آر محسوس نہیں کی تھی۔

آپ یہاں۔۔۔؟

ہاں۔۔۔وہ۔

کیا تم بزی ہو؟ ذرا سا اُلجھ کر اس نے پہلے سوال کا جواب دئے بغیر اگلا سوال کیا۔تو وہ اسے ایک نظر دیکھ کر آگے بڑھی اور موبائل آف کر کے اس کی جگہ پہ رکھ دیا۔

خیر گھر میں انسان کیا کر سکتا۔ عجیب جواب۔

For more visit (exponovels.com)

آپ کھڑے کیوں ہیں۔آئیں باہر لاؤنج میں چلتے ہیں۔کیا آپ چائے پئیں گے ؟اسے اس کا اس طرح سے آجانا عجیب سا لگ رہا تھا۔

کیوں کیا آپ مجھ سے خوفزدہ ہیں ؟لاؤنج کی جانب اُترتی سیڑھیوں سے اترتے اس نے مسکرائے بغیر پوچھا۔تو ساتھ چلتی ماہ نور خاموشی سے اسے دیکھا۔

مجال ہے۔جو یہ بندہ سیدھے سے کسی بات کا جواب دے دے۔اس نے محض سوچا۔

جی نہیں میں کیوں آپ سے ڈروں گی۔آپ ادھر آئیں ہیں۔تو یقیناً کام سے ہی آئے ہوں گے۔

کام۔۔۔کام تو ہے۔خیر۔تم چائے کا پوچھ رہی تھی۔لاؤنج میں بیٹھتے اس نے موبائل کو کوٹ کی جیب سے نکالتے ابرو اُٹھا کر پوچھا۔تو وہ حیرت چھُپاتی کیچن میں � آگئی۔

کیا۔۔۔یہ کسی کے گھر جانے کا یہ کوئی وقت ہے۔پین میں پتی ڈالتے کا انداز اُلجھن لئے ہوئے تھا۔

سر جھٹک کر اس نے چائے بنائی اور ساتھ میں کچھ اور چیزیں رکھ کر ٹرالی گھسیٹتی باہر آگئی۔

وہ متوتر فون پہ مصروف تھا۔ماہ نور نے ایک نظر اسے دیکھا۔اور چائے کا کپ میز پہ رکھا۔ایسے کے رکھتے کپ کی آواز سُنائی دے۔

ذریت البتہ تب بھی متوجہ نہیں ہوا تھا۔

شوخے ناں ہوں تو۔منہ بنایا۔

کچھ لمحے خاموشی سے سرکے۔مگر وہ صاحب بہادر فون پہ متوتر مصروف تھے۔اور ان کے ٹائپ کرنے کی آواز اس وقت ماہ نور کے عصاب پہ بار ڈال رہی تھی۔

کیا یہ ٹک ٹک آپ دس منٹ بعد نہیں کر سکتے۔بہت غیر ارادی طور پہ اس نے اس کے ہاتھ سے موبائل پکڑا۔اور سامنے میز پہ رکھ دیا۔ذریت تو دیکھ کر رہ گیا۔مگر وہاں پرا کسے تھی۔

میں ایک اہم بات کر رہا تھا۔

کس سے ؟ابرو اُٹھا کر پوچھا۔

ہاآں ں س۔اسے لگا۔اسے سُننے میں غلطی ہوئی ہے۔

میں نے پوچھا کس سے بات کر رہے ہیں۔اور آپ کو معلوم تو ہو گا ہی۔کہ آدابِ مہمانی کیا ہوتے ہیں۔دوپٹے کو نماز کی طرح لئے۔وہ مکمل عتماد سے، سنجیدگی لئے ہو اُستانی جی لگ رہی تھی۔ذریت نے خاموشی سے چائے کا کپ اُٹھالیا۔

میں اپنے سیکٹری سے بات کر رہا تھا۔اس نے اس کا انداز دیکھ کر ذرا گلا کھنکار کر کہا۔تو وہ کچھ اور سیدھی ہوئی۔

لڑکی ہے یا آدمی ؟اگلا سوال اسے ذرا دلچسپ لگا۔ہاتھ میں پکڑا کپ سامنے کی میز پہ رکھا اور ذرا گھوٹنوں پہ جُھکا۔

کیوں ؟کوئی پرابلم ہے کیا؟

سوال کا جواب سیدھے سے دیا کریں۔جو پوچھا وہ بتائیں۔پورا بیویوں والا انداز تھا۔

تم نے کچھ روز قبل خود ہی تو کہا تھا۔کہ تمہیں سیدھی باتیں سمجھ نہیں آتیں۔

میرا وہ مطلب نہیں تھا۔وہ جھنجھلا گئی۔وہ جانبوج کر بات کو طول دے رہا تھا۔

اچھا۔۔۔پھر کیا مطلب تھا۔؟

خیر ہم ایک بے کار بات کو لے کر اُلجھ رہے ہیں۔آپ کس لئے آئیں ہیں۔؟کام کا سلسلہ بتائیں۔وہ ضرورت سے زیادہ یا تو سمارٹ بن رہی تھی۔یا پھر اوور کنفی ڈنٹ۔ذریت نے نچلا ہونٹ دانت کے نیچے دبا کر ذرا گلا کھنکارا اور پھر اس کا جھولی میں دھرا ہاتھ پکڑا کیا۔وہ اس کے لئے تیار نہیں تھی۔گڑبڑا گئی۔

کیا تم میرے ساتھ گھر چلو گی ؟

ک۔۔۔کس۔کس لئے ؟گلا شک ہوا۔سارا اعتماد ہوا ہوا تھا۔ذریت کو ہنسی آئی۔مگر بظاہر سنجیدہ تھا۔

کیا تم ساری زندگی یہیں رہو گی۔اس کے لہجے سے بالکل بھی چُلبلاپن نہیں جھلک رہا تھا۔ماہ نور کا دل ڈگمگا یا۔

کیا تم ڈر رہی ہو؟اس کی جُھکی نگاہ دیکھ کر اندر جھانکنے کی کوشش کرتے اس نے پوچھا۔تو ماہ نور کی پیشانی عرق آلود ہو گئی۔اور ماتھے پہ ناگواری کے بل بھی پڑے۔

ڈر۔۔۔ڈر کس بات کا۔اور کام نہیں بتایا آپ نے۔وہ اب پھر سے بظاہر اپنا اعتماد بحال کر چکی تھی۔

بتایا تو! لینے آیا ہوں۔تیاری پکڑو۔

کس لئے۔

کس لئے کا کیا مطلب؟

مطلب یہ کہ جلدی احساس ہو گیا۔آپ کو میں بھی ہوں۔وہ چاہتی نہیں تھی۔مگر جو منہ سے نکلا وہ دل میں ضرور تھا۔مگر زبان سے غلط وقت پہ ادا ہوا۔جس کا اندازہ اسے جلد ہی ہو گیا۔

مجھے دادی نے بھیجا ہے۔مریم آپی کے سسرال سے کچھ لوگ ملنے آرہے ہیں۔اس کا ہاتھ چھوڑ کر موبائل کو واپس اُٹھاتے مکمل سرد مہری سے کہا۔تو ماہ نور اپنا سا منہ لے کر رہ گئی۔

لانت ہو ماہ نور۔ذریت کے چہرے سے صاف لگ رہا تھا۔کہ اسے ماہ نور کی بات پسند نہیں آئی۔

لیکن۔میں نے ابھی بتایا نہیں بھائی کو کہ۔۔۔

میں جب بول رہا ہوں۔تو تمہیں سمجھ جانا چاہئے۔اس کی بات کاٹ کر اس نے ذرا سختی سے کہا۔تو ماہ نور خاموشی سے اسے دیکھنے لگی۔

آپ بات نہیں سمجھ رہے۔گھر پہ کوئی بھی نہیں ہے۔آپ کے ساتھ میں چلی گئی تو۔۔۔

بات کو تم نہیں سمجھ رہی۔مسز! میں روز روز آپ کے پیچھے بھاگا نہیں پھر سکتا۔ایک بار ہی بتا دو۔آنا ہے یا نہیں۔دادی ہر روز مجھ سے پوچھتی ہیں۔میرا کام آسان ہو۔اس کے لہجے میں خشکی نمایاں تھی۔ماہ نور منہ بناتی اُٹھ گئی۔

For more visit (exponovels.com)

اپنی بار کتنا بُرا لگتا ہے۔ سوچ کر اس نے اسے ایک آخری بار دیکھا۔ اور اُٹھ کر اپنے کمرے کی جانب آ گئی۔ اس کا ارادہ بابر بھائی کو فون کے گھر بلانے کا تھا۔

:::::::::::

ہوسٹل کی زندگی میں انسان کو بہت سے تجربات ہوتے ہیں۔ انسان ایک طرح کی ذاتی تعمیرات سے گزرتا ہے۔ انسان کو انسان کی خبر ہو جاتی ہے۔

فرح تمہیں وارڈن اپنے کمرے میں بلا رہی ہیں۔ وہ سکول جانے کے لئے تیار۔ ہوسٹل کے ڈائنگ میں ابھی آ کر بیٹھی ہی تھی۔ جب رِدا نے آ کر اسے بتایا۔ رِدا اس کے کمرے کے ساتھ والے کمرے میں اپنی تین سہلیوں کے ساتھ رہ رہی تھی۔ اور کافی اچھی تھی۔ اپنی باقی سہلیوں کی نسبت۔ فرح نے سُن کر سر ہلایا۔ اور ابھی جو بیٹھی تھی۔ واپس اُٹھ کر وارڈن کے دفتر کی جانب آ گئی۔

وارڈن کے کمرے کے باہر رک کر اس نے باہر کھڑی وارڈن کی ذاتی ملازمہ کو دیکھا۔ جو اسے اندر جانے سے روک رہی تھی۔

ابھی آپ اندر نہیں جا سکتیں۔ اس نے روکا۔ فرح نے ذرا حیرت سے اسے دیکھا۔

میڈم نے مجھے بلایا ہے۔ اس نے دانت کچکچا کر کہا۔ تو وہ دھیمے سے مسکرا دی۔ تپا دینے والی مسکراہٹ۔

میڈم ابھی مصروف ہیں۔ دس منٹ بعد آ جانا۔۔۔

میں کہہ رہی ہوں۔ میڈم نے بلایا ہے۔ اور آپ۔۔۔

دیکھو۔۔ ابھی میڈم کسی کے ساتھ مصروف ہیں۔ اور اُنہوں نے ہی جانے سے منا کیا ہے۔ فرح کو سکول سے پہلے ہی دیر ہو رہی تھی۔ اور اس چکر میں وہ ناشتہ بھی نہیں کر پائی تھی۔ اور اب ایک نیا ڈرامہ۔۔۔ وہ گہرا سانس لے کر ویٹنگ روم میں آ گئی۔

ویٹنگ روم میں ہلکا ہیٹر چل رہا تھا۔اور ماحول کافی اچھا تھا۔اس نے گہرہ سانس لے کر دونوں ہاتھوں کو جرسی کی جیبوں میں ڈالا اور کرسی پہ بیٹھ کر خالی کمرے کو دیکھنے لگی۔

روم کی دیواروں پہ مختلف اقسام کی خوبصورت پینٹنگز لگائی تھیں۔چہرے۔۔۔روتے، بگڑتے، مدد مانگتے۔

یہ میڈم سائیکو ہے کیا؟ منہ بنا کر سوچا۔اور سر جھٹ دیا۔عجیب وغریب تصویریں دیکھ کر کوئی بھی یہ سوچ سکتا تھا۔روتے بلکتے چہرے۔۔۔

ویسے میڈم کی دوست بھی کچھ عجیب سی ہے۔اور پتہ نہیں کونسی میٹنگز میں مصروف رہتی ہے۔جو سکول آنے کا بھی وقت نہیں ہوتا۔وہ اس وقت اپنے سکول کی ڈائریکٹر کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

اے۔۔۔

جاؤ میڈم بلا رہی ہیں۔وہی ملازمہ مسکراتی اب کھڑی کہہ رہی تھی۔فرح نے ایک ناگوار نظر اس پہ ڈالی اور اُٹھ گئی۔

ابھی کہہ رہی تھی۔کہ بعد میں آنا۔اللہ پوچھے۔۔میرا وقت برباد کر دیا۔

پہلے کیوں نہیں بتایا۔کہ میڈم نے کہہ کر بلایا تھا۔دروازے سے گزرتے دل جلاتی مسکراہٹ کے ساتھ اسے کہتے سُنا تو وہ اسے گھور کر گزر گئی۔

وہ جانبوجھ کے ایسی حرکتیں کرتی تھی۔پتہ نہیں کیا تکلیف تھی اس میڈم کی چمچی کے ساتھ۔جانبوجھ کے ہر لڑکی کی جاسوس کرتی۔اور خامخواہ ناک میں دم کئے رکھتی۔یہ سب پہلے نہیں تھا۔پچھلی وارڈن بہت اچھی تھی۔ملازمہ تب بھی یہی تھی۔لیکن تب اسے میڈم سیٹ رکھتی تھیں۔اب جب سے وارڈن بدلی تھی۔تب سے ہوسٹل کا ماحول بہت عجیب سا ہو گیا تھا۔ایک خشک اور سہمی سے فضا ہو گئی تھی۔پہلے تو اس نے محسوس نہیں کیا۔لیکن یہاں رہنے کے کچھ عرصے بعد جب اس نے جوب شروع کی۔تب سے اس نے ماحول میں بہت تبدیلی محسوس کی تھی۔

کمرے میں داخل ہونے سے پہلے اس نے دروازے پہ دھیمے سے دستک دی اور اجازت ملنے پہ اندر داخل ہو گئی۔

کمرے میں ایک چھوٹا ہیٹر چلتا ماحول کو پُر حدت کئے ہوئے تھے۔

کمرے میں ایش گرے رنگ قالین پہ کمرے کے وسط میں ایک درمیانے درجے کی شیشے کی میز تھی۔ جس کے دوسری طرف میڈم کرسی پہ بیٹھی جھول رہی تھی۔ اور مسکراتی اپنی کنپٹی پہ شہادت کی انگلی رکھے اسے دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔

اس نے میڈم کو دیکھ کر ان کے سامنے کی جانب صوفہ سیٹ میں درمیانے درجے کے صوفے پہ بیٹھے ان پچپن سالہ مرد کو دیکھا۔ اور پھر واپس سوالیہ نظروں سے میڈم کو دیکھا۔

میم آپ نے بلایا؟

جی۔۔۔ مجھے آپ کو کسی سے ملوانا ہے۔ آئیں بیٹھیں۔

وہ خاموشی سے ان صاحب کے بائیں جانب کے سنگل صوفے پہ پُر تکلف انداز میں بیٹھ گئی۔

مسٹر ضیا۔۔۔ یہ میرے ہاسٹل کی بہت قابل لڑکی ہیں۔ ان کا تعلق خان فیملی سے ہے۔ یہ پہلے دو سال یہیں رہی ہیں۔ میڈم اس کا تعارف دے رہی تھیں۔ اور وہ نا سمجھی سے اُنہیں اور کبھی اُن صاحب کو۔ جو اس کی جانب مسکراتے دیکھ رہے تھے۔ دیکھ رہی تھی۔ اور معملہ اس کی سمجھ سے باہر تھا۔

مس فرح۔۔۔ وہ متوجہ ہی تھی۔

مسٹر ضیا۔۔۔ جس سکول میں آپ پڑھاتی ہیں۔ اس کے مالک ہیں۔ میری دوست ان کے سکول کو ہی چلا رہی ہیں۔ اس نے سمجھ کر سر ہلا دیا۔

اور ملک کی جانی مانی کمپنی کے مالک بھی ہیں۔ اس کے علاوہ ادھر شہر میں ان کے بہت سے پلازاز بھی ہیں۔ وہ اس سب کے مطلب سے ناواقف بس خاموشی سے اُنہیں دیکھتی رہی۔ اور سر ہلاتی رہی۔ اب بھلا وہ کیا کہتی۔

آپ سے ایک کام ہے۔ آخر وہ مطلب کی بات پہ آئیں۔

آپ گورنمنٹ کالج فارومن کی طالبِ علم رہ چکی ہیں ناں؟ مسکرا کر پوچھا۔ فرح نے ناسمجھی سے اُنہیں دیکھ کر سر اثبات میں ہلایا۔ جی۔۔۔

مس فرح۔۔۔ اب کی بار وہ حاحب بولے تھے۔ فرح نے براہِ راست اُنہیں دیکھا۔

آپ کو میرے لئے کام کرنا ہے۔ مسکرا کر کہا گیا۔

کام۔۔۔ کس قسم کا کام؟

آپ کو گورنمنٹ کالج میں دوبارہ ایڈمیشن لینا ہوگا۔ وہ درخواست نہیں کر رہے تھے۔ بلکہ حکم دے رہے تھے۔ اس کے ابرو تنے۔

کس لئے؟ لہجہ خُشک ہوا۔

آپ اگر آرام سے میری بات سُنیں تو میں اپنی بات کہوں گا۔ آپ جیسی خوبصورت لڑکی پہ غصہ جچتا نہیں ہے۔ مسٹر ضیا شکل سے جتنے معزز نظر آ رہے تھے۔ بات کرتے اندازہ ہو رہا تھا۔ کہ کتنے پانی میں ہیں۔ وہ ذرا گھبرائی۔

بات اصل میں یہ ہے۔ مس۔۔۔ کہ آپ کو کچھ پیکٹس اندر کالج میں لے جا کر کچھ لڑکیوں میں تقسیم کرنے ہیں۔ مسکرا کر کہی گئی بات نے فرح خان کے دماغ کو زور کا جھٹکا دیا تھا۔ کہ وہ کچھ بول بھی نہ پائی۔ بس ناسمجھی سے میڈم کو اور کبھی ان صاحب کو دیکھتی۔

آپ کو گھبرانے کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔ آپ کا کام مشکل نہیں ہے۔ بس عصاب کو کنٹرول میں رکھیں۔ اور اعتماد سے اندر جا کر لڑکیوں میں بانٹ دیا کریں۔ ایڈمیشن لینے سے آپ کا کام آسان ہو جائے گا۔ ان صاحب کے دماغ پہ یقیناً اثر ہو چکا تھا۔ کم از کم اسے تو یہی لگا۔ وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ کام کی نوعیت وہ سمجھ گئی تھی۔ اور مزید ادھر بیٹھنا اس کی توہین تھی۔

For more visit (exponovels.com)

کام اتنا آسان ہے۔ تو آپ اپنی بیٹی سے کیوں نہیں کہہ دیتے۔ ابرو اُٹھا کر کمال ضبط سے اس نے کہا تھا۔ ضیا صاحب تحمل سے مسکراتے رہے۔ وہ رعب سے چلتی باہر آگئی۔ البتہ اندر کیا حالت تھی۔ یہ اس کے اور اللہ کے سوا اور کون جان سکتا تھا۔

اس روز وہ سکول نہیں گئی۔ بس کمرے میں آگئی۔۔۔ اور خاموشی سے بیڈ پہ لیٹ کر بلنکٹ لے لیا۔ وہ خاصی گھبرا گئی تھی۔ یہ بات اتنی معمولی نہیں تھی۔ سوچتے سوچتے وہ سوگئی۔ اور پھر تقریباً رات آٹھ بجے کھانے سے چند منٹ پہلے اس کی آنکھ کھولی تھی۔

پیٹ میں چوہے ناچ رہے تھے۔ وہ منہ دھو کر کمرے سے باہر ڈائنگ حال میں آگئی۔ جہاں بہت سی لڑکیاں باتوں میں مصروف تھیں۔

::::::::::::::::

تمام برتن اکٹھے کر کے اس نے سنک میں رکھے۔ اور ملازمہ کو دھونے کا کہہ کر خود بام اُٹھاتی دادی جان کے کمرے میں آگئی۔ ذریت گھر پہ موجود نہیں تھا۔ وہ شام سے ہی غائب تھا۔ اور اس کے نہ ہونے سے ماہ نور کافی پُرسکون تھی۔

بچے تم نے زحمت کی۔۔۔ اس کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔ تسبیح کرتے۔ وہ محبت سے مسکرا کر کہتی ماہ نور کو بہت بھلی لگی تھیں۔ وہ مسکرا کر آگے بڑھی۔ اور ان کے گھوٹنے کی مساج کرنے لگی۔

سردی میں گھٹنے کا درد دادی جان بہت جان لیوا ہوتا ہے۔ اور آج ابھی بیڈ پہ بیٹھتے آپ کہہ رہی تھیں ناں کہ سردی میں اکثر ایسا ہو جاتا ہے۔ تو میں سمجھ گئی۔ کہ آپ کو جوڑوں کا مسئلہ ہے۔ نرمی سے اور بہت پیار سے ان کے گھوٹنے کی مساج کرتے اس نے بہت بردباری سے کہا۔ تو دادی جان اسے دیکھتی رہ گئیں۔ وہ کتنی سمجھدار اور سنجیدہ طبیعت کی مالک تھی۔

ماہ نور۔۔۔ کچھ سوچ کر اُنہوں نے اسے پکارا تو وہ مساج کرتے اُنہیں دیکھنے لگی۔

جی؟

بیٹا تم ذریت کے ساتھ خوش تو ہو؟

وہ ان کے اس طرح پوچھے گئے سوال پہ ذرا چور ہوئی تھی۔

جی۔۔۔ لیکن آپ کیوں پوچھ رہی ہیں؟ اسے لگا وہ شائد جان گئی ہیں۔ وہ اپنے آپ میں شرمندہ ہوئی۔

مجھے لگتا ہے۔ جیسے تم ذریت سے کسی بات پہ ناراض ہو۔ اس کے چلتے ہاتھ کو روک کر اُنہوں نے بہت نرمی سے پوچھا۔ تو ماہ نور گہرا سانس لیا۔

نہیں دادی جان ایسا کچھ نہیں ہے۔ نظر جُھکا کر قالین کو دیکھتے اس نے کہا۔ تو دادی جان نے بغور اسے دیکھا۔

دیکھو بیٹا۔ اگر تمہیں اس سے یا مجھ سے کوئی بھی شکائت ہو۔ تو دل میں رکھنے کی بجائے کہہ کر دل صاف کر لینا۔ مجھے اپنی بھی دادی سمجھو۔ میں صرف اس نالائق کی دادی نہیں ہوں۔ آخر میں مسکرائی تھیں وہ۔

آپ میرے شوہر کو نالائق بول رہی ہیں؟ منہ بنا کر مصنوعی ناراضی دیکھا کر اس نے کہا۔ تو وہ ہنس دیں۔

ہاں کہہ رہی ہوں۔ آلینے دو۔ اس کے سامنے کہوں گی۔ اور کان بھی پکڑوں گی۔

کان کس لئے؟

وہ اس لئے۔ کہ وہ تمہیں کہیں گھومانے کیوں نہیں لے کر گیا؟

لیکن دادی جان اس کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔

ارے کیوں ضرورت نہیں ہے۔ ابھی تو تم دونوں کے دن ہیں۔ گھومنے پھرنے، انجوائے کرنے کے۔ اس کی مسکراہٹ نے انہیں بھی تازہ دم کر دیا تھا۔

ماہ نور مسکرا کر واپس مساج کرنے لگی۔

رہنے دیں۔ ابھی نہیں پھر کسی اور دن۔ ویسے بھی۔ آپ تو جانتی ہیں۔ بابا کی ڈیتھ کے بعد ہر چیز بہت مشکل تھی میرے لئے۔ آپ نے جیسے مجھے سنبھالا یہ میرے لئے آپ کا احسان ہے۔

یہ کہہ کر تم یہ جتارہی ہو۔ کہ میں تمہاری دادی نہیں ہوں۔۔۔ اس کا اُداس ہونا۔ اُنہیں بالکل گوارہ نہ تھا۔ وہ جو اُداس ہوئی تھی۔ پھر سے مسکرادی۔ اور بڑھ کر ان کے گال پہ بوسہ لیا۔

آپ میری دادی ہیں۔ صرف میری۔۔۔ اس کے الفاظ، شیریں لہجہ۔ سب اندر آتے ذریت نے سُنا۔ تو منہ بنایا۔ دادی جان سے محبت کا دعوا تو ایک صرف کرنے کا حق تو اسے تھا۔ اب ایک اور آگئی تھی۔ وہ بیڈ کی دوسری جانب سے ہوتا۔ ان کے قریب بیٹھ گیا۔ ماہ نور سیدھے ہوتے بام کا ڈھکن لگایا۔ اور اُٹھ کھڑی ہوئی۔

تم کہاں تھے۔ سردی دیکھو کتنی ہو رہی ہے۔ ان کے چہرے پہ نرمی اور فکر تھی۔ وہ کوئی جواب دئے بغیر ان کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گیا۔

براؤن شرٹ میں بلیک جنز کے ساتھ بلیک ہی جیکٹ میں معمول سے ہٹ کر اچھا دکھ رہا تھا۔

آپ تو جانتی ہیں۔ آپ کے پوتے کے کندھوں پہ کتنی ذمہ داری ہے۔ پھر بھی ایسے سوال۔۔۔

ہاں۔۔۔ ملک کا نیا وزیرِ اعظم میرا پوتا ہی تو بنا ہے۔ دادی جان نے بھی خوب رکھ کر نشانہ لگایا تھا۔

خیر دادی جان اس ملک کا سرمایہ ہم سرمایہ داروں ہی کی وجہ سے چل رہا ہے۔ وزیرِ اعظم نہ بھی ہوں۔ تو بھی اپنے حصے کا کام تو کر رہے ہیں ناں۔۔۔

جی جی۔۔۔ جب آپ کے محلوں میں صفائی و ستھرائی ہو گی۔ بیٹا اس دن میں مانوں گی۔ تم جیسوں نے کتنا اپنا فرض نبھایا۔ ہمارے ملک کا ایک مسئلہ گندگی بھی ہے۔ وہ تسبیح رکھ چکی تھیں۔ اور اب اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے بہت نرمی سے کہہ رہی تھیں۔ وہ جو آنکھیں بند کئے لیٹا تھا۔ مسکرا دیا۔

لگتا ہے۔ آج کل آخبریں سُن رہی ہیں۔

نہیں۔۔۔ماہ نور اخبار سُناتی رہتی ہے۔

اچھا۔۔۔

ذریت مجھے ایک بات تو بتاؤ۔

دادی جان آپ مجھ سے پوچھ کر تو پہلے کوئی سوال نہیں کرتی تھیں۔ خیریت۔۔۔آنکھیں کھول کر اُنہیں دیکھا۔

نالائق۔۔۔بات سُنو چُپ کر کے۔

جی جی۔۔۔

تم اپنی بیوی کو کہیں گھومانے کیوں نہیں لے جاتے۔

ابھی تو وہ اپنے میکے سے آئی ہے۔ منہ بنایا۔

بکو مت۔۔۔۔میکے جانے سے کیا اؤٹنگ ہو گئی۔ جاؤ اسے لے کے جاؤ۔

لیکن ابھی تو آپ کہہ رہی تھیں۔ کہ باہر سردی ہو رہی ہے۔ ہر بات کا جواب اس کے پاس تیار تھا۔

ذریت حسن باتیں مت گھڑو۔ اور اُٹھو۔ آج سارا دن اس نے بہت کام کیا ہے۔ جاؤ گھوما کر لاؤ۔ اور ہاں اس کو شاپنگ بھی کروا دینا۔ دادی جان کا ہر انداز نرالہ تھا۔

یہ آپ کی بہو نے تو نہیں کہا۔ اسے جیسے اُمید ہوئی۔

اگر وہ کہتی۔ تو میرے بجائے تمہیں خود کہتی۔ بیکار میں باتیں مت گھڑو۔ اور چلو اب اُٹھو۔۔۔کہنے کے ساتھ اسے کندھے سے اُٹھا بھی رہی تھیں۔ وہ سیدھا ہو گیا۔

واحد ساس دیکھی ہے۔ جو بیٹے کو خود کہہ رہی ہے۔ کہ جاؤ بہو کو شاپنگ کروا کر لاؤ۔ چکر کیا ہے؟

کہیں وہ آپ کو ڈراتی تو نہیں۔۔۔کوئی دھمکی۔ ایسا کوئی چکر۔؟

بکومت۔۔۔اُنہیں ہنسی آئی تھی۔ڈرامے اس نسل کو تباہ کر رہے ہیں۔

::::::::::

سُنو۔۔۔تیار ہو جاؤ۔کیچن میں آ کر میز سے کٹی گاجر کا ٹکڑا اُٹھا کر منہ میں رکھتے۔برنر پہ پین رکھتی ماہ نور سے کہا۔تو اس نے رُخ موڑے بغیر وجہ معلوم کی۔

کیوں؟

ہم گھومنے جا رہے ہیں۔

کہاں؟وہ حیرت سے سیدھی ہوئی۔ذریت نے اب کی بار کھیرا اُٹھا کر منہ میں رکھا۔اور شانے اُچکا دئے۔

جہاں سیل لگی۔

جی؟

کچھ نہیں۔۔۔چائے باہر سے ہی پی لینا۔میں باہر ہوں۔دو منٹ میں آؤ۔وہ اکثر ایسی بات کرتا تھا۔جس کی سمجھ اسے کم ہی آتی تھی۔جیسے ابھی سیل والی بات پہ نہیں آئی۔وہ اسے جاتا دیکھ کر خود بھی برنر بند کر کے باہر آ گئی۔

دادی جان نے کہا ہو گا۔کچھ دیر پہلے ان کے آڈرز وہ سُن چکی تھی۔تبھی سوچ کر سر ہلاتی چادر لینے چلی گئی۔

:::::::::::::::::

اس نے ابھی روٹی کا پہلا نوالہ منہ میں ڈال کر نیچے بھی نہ کیا تھا۔جب ایک بار پھر سے میڈم کے دفتر میں شنوائی ہوئی۔وہی میڈم کی نک چڑی ملازمہ نے بہت لہکتے ہوئے پیغام دیا۔تو بہت سی لڑکیوں نے کھانے سے ہاتھ روک کر اس کی جانب دیکھا تھا۔ان سب کی نگاہوں میں کوئی تاثر تھا۔جو اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔وہ خاموشی سے کرسی گھسیٹتی اُٹھ گئی۔البتہ اندر سے ایک طوفان تھا۔جو ٹھاٹھے مار رہا تھا۔

For more visit (exponovels.com)

میڈم کو آج کل تم سے بہت خاص اُنسیت ہو رہی ہے۔ ساتھ بیٹھی زری نے کہا۔ تو وہ بمشکل تمام مسکرائی تھی۔ البتہ مسکراہٹ میں بہت مصنوعی پن تھا۔

کمرے میں داخل ہونے سے پہلے اس نے رُک کر اور سوچتے ہوئے جھجک کر دستک دی اور قدرِ توقف کے بعد قدم اندر رکھے۔

میڈم آج اپنے کمرے کی جانب نہیں گئی تھیں۔ اس وقت وہ لڑکیوں کے ساتھ ہی ٹیبل پہ کھانا کھاتی تھیں۔ اور پھر چہل قدمی کے لئے باہر جاتیں۔

جی میڈم؟

اگرچہ بلانے کی وجہ معلوم تھی۔ تبھی لہجے کی بے زاری کو اس نے چھوپانے کی ہرگز کوشش نہیں کی تھی۔

آؤ۔۔۔ آؤ رک کیوں گئی۔ وہ بڑی انہماک سے اخبار کی ورق گردانی میں مشغول تھیں۔ اس کے آنے پہ اخبار تیہہ کرتے رک کر اور بڑی لگاوٹ والی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ان کی بات ماننا اس کی مجبوری تھا۔

وہ کاموشی سے آگے بڑھی اور صوفے پہ پُر تکلف انداز میں بیٹھ گئی۔

صبح جو تم سے بات ہوئی۔ تم نے اس کے بارے میں کیا سوچا؟ ان کی نظریں اس کے چہرے کے ایک ایک تاثر کو بڑی باریکی سے پڑھ رہی تھیں۔ اس نے ایک سرد اور بھرپور نگاہ سے اُنہیں دیکھا۔ اور چہرہ اس درجے جُھکا لیا۔ کہ وہ اس کے تاثرات نہ دیکھ سکیں۔

کیا میں نے کہا تھا۔ کہ میں سوچوں گی؟ بہت سرد انداز تھا۔

مگر پھر بھی ہم نے وقت دیا۔ وہ بے اختیار کہنے لگیں۔

ٹھیک ہے۔ میں نے سوچا ہے میڈم! اور میری طرف سے انکار۔۔۔ آپ کو یہ مجھ سے کیوں اُمید ہوئی۔ کہ میں اس گھٹیا کام میں آپ کی مدد کر سکتی ہوں؟ حالانکہ میں نے سوچا ہے کہ میں آپ کی شکائت کروں گی۔ اس کے لہجے میں محسوس کیا جانے والا ایک سخت تاثر تھا۔

مجھے یقن ہے کہ تم جتنی شکل سے ذمہ دار اور سمجھ دار ہو۔ اتنی عملی طور پہ بھی ہو گی۔ اور کوئی ایسا کام نہیں کرو گی۔ جس سے تمہیں اور تمہارے گھر والوں کو نقصان پہنچے۔

میڈم مسکرا دیں۔

اور ویسے بھی۔۔۔

ایک کمزور اور بے معنی سی لڑکی۔۔۔ کیا خیال ہے ہمیں کوئی نقصان پیہنچا سکتی ہے۔ جس کی اپنی جڑیں کمزور ہوں۔ ان کے چہرے پہ بے فکری کی مسکراہٹ تھی۔ فرح نے ایک نظر اُنہیں دیکھا۔ اور ہونٹ کاٹتی نظر واپس جُھکا گئی۔ اسے لگا تھا اگر اس نے انکار کر دیا ہے۔ تو اس سے دوبارہ نہیں پوچھا جائے گا۔

بات صرف اتنی ہے۔ کہ ہم جس سے کام لیتے ہیں اس کے اندر تک کو جھانک لیتے ہیں۔ ہمارے ساتھ کام کرنے والی ایک ایک لڑکی کی سانس کی مہک تک ہماری رسائی ہے۔ اور تم جیسی بے گھر لڑکیاں ویسے بھی ضیا صاحب کو بہت پسند ہیں۔ تمہارے بارے میں تھوڑی سی جانچ پڑتال نے ہمیں ہمارے مطلب کی چیز سمجھا دی اور بس۔ وہ مسکرائیں اور فرح کو پہلی بار احساس ہوا کہ وہ اکیلی ہے۔ پھوپو اسے پندرہ روز قبل ادھر چھوڑ کر گئی تھیں۔ اور اس کے بعد ان کا فون پہ اس کے ساتھ مسلسل رابطہ تھا۔ اور اب جو معملہ در پیش تھا۔ اس کے بعد اس کا دل چاہ رہا تھا۔ کہ گھر واپس لوٹ جائے۔۔۔

لیکن۔۔۔۔

لیکن کس منہ کے ساتھ۔

میڈم آپ مجھے کسی بھی وجہ سے بلیک میل نہیں کریں گی۔ یہ میں بخوبی جانتی ہوں۔ میرے گھر والے بھی زندہ ہیں۔ یہ بھی آپ کو معلوم ہو گا۔ اور یہ پتہ ہو گا۔ کہ میں ایک باشعور باہمت لڑکی ہوں۔۔۔

For more visit (exponovels.com)

آپ کی یہی بات مسٹر ضیا کہتے ہیں اُنہیں اپیل کرتی ہے۔ بھئی اب ہم تو نہیں جانتے ان پہ آپ کی کس بات کا اثر ہوا ہے۔ بہر حال ہمیں اس سے کیا۔ ان کی مسکراہٹ بڑی ربوٹک سی تھی۔ فرح نے گہرہ سانس لیا۔ اور اُٹھ کھڑی ہوئی۔

میڈم۔۔۔ میرا اس سب سے کوئی تعلق نہیں۔ میں ایک عام سی ڈری رہنے والی معمولی سی لڑکی ہوں۔ مجھے مجبور مت کریں کہ میں پولیس میں آپ کی کمپلین کردوں۔ میں یہاں مذید کچھ روز رہ لوں چلی جاؤں گی۔ براہِ مہربانی مجھے تنگ نہ کیا جائے۔

کیا وہ کسی فلم کا یا ناول کا کردار تھی۔ جو وہ اس قسم کی بات کہہ رہی تھی۔ یا پھر گھر والوں کی بے عتباری کے بعد اسے لگ رہا تھا۔ کہ زندگی کا مقصد محض دوسروں کی نظروں میں اچھے نمبر لے کر پاس رہنا ہی ہے۔ جو اس قدر خطرناک لوگوں کے پردہ فاش ہو جانے پہ بھی کوئی خاص تاثر نہیں دے رہی تھی۔ یا۔۔

یا پھر دینا نہیں چاہتی تھی۔

معصومیت کا دعوا بھی اور بتائے دینے کی دھمکی بھی۔ ابرو اُٹھا کر دل جلاتی مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔

میں دھمکی نہیں دے رہی۔ بتا رہی ہوں۔ اور اگر آپ مجھے مزید تنگ کریں گیں۔ تو عین ممکن ہے۔ کہ میں ادھر سے چلی جاؤں۔ اللہ حافظ☆۔۔۔ کہہ کر بلکہ جتا کر وہ وہاں رُکی تھوڑا تھی۔ اسے لگا اس کا کام ختم ہو چکا۔

اور ہاں جانے سے پہلے آخری بات۔۔۔ میرے بارے میں آپ کے ہاتھ ایسا کچھ نہیں آئے گا۔ جس سے آپ مجھے بلیک میل کریں۔ کمال جرت سے مڑ کر اس نے جتاتے ہوئے کہا۔ اور پھر دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔

میڈم نے مسکرا کر کریڈل پہ دھرا رسیور اُٹھایا اور کوئی نمبر پھُرتی سے دبا کر رسیور کان سے لگایا۔

السلامُ علیکم۔۔۔

جی جی آپ ہی کا کام کرنے بیٹھی تھی۔

بس اتھری گھوڑی کی طرح کو در ہی ہے ابھی تو۔ لہجے میں بلا کی نرمی مگر الفاظ میں بلا کی چکنائیت اور مسکراہٹ کی آمیزش تھی۔

سر کام جاری ہے۔ اُمید ہے۔ کہ آپ کو شکائت نہیں ہو گی۔ یک طرفہ گفتگو تھی۔ سمجھ سے بالاتر۔

جی جی آپ بھروسہ رکھیئے آپ کو شکائت کا موقع نہیں ملے گا۔ ریسیور رکھنے سے پہلے چند اختتامیہ کلامات ادا کئے گئے اور فون رکھ دیا گیا۔ اُنہوں نے گہرا سانس لے کر بظاہر پر سکون مگر تنتے ہوئے عصاب کو پُر سکون کرنے کی خاطر پُشت کرسی سے ٹکا کر سر بھی ٹکا لیا۔ ان کی نظر چھت کی جانب جبکہ سوچ کہیں دور چھت کے پار اُفق سے اُبھرتے بادلوں کی پٹی کی مانند دوڑ رہے تھے۔

اس نے کمرے میں داخل ہو کر دروازہ بند کیا۔ اور پھر تیزی سے فون اُٹھا کر پھوپو کے گھر کا نمبر ملایا۔ جسے ملازم نے اُٹھایا تھا۔

بابا میری بات میڈم ذہرہ سے کروانا۔ اس کی آواز میں بہت تیزی تھی۔ یوں جیسے بات کرنے کی بہت جلدی ہو۔

بی بی تو میم باہر گئی ہیں سر کے ساتھ۔ بابا اس کی آواز پہچانتے تھے۔ وہ اکثر جب بھی بات کرنے کو فون کرتی۔ گھر کا ملازم ہی ریسیور اُٹھاتا تھا۔ اُنہوں نے شائد ابھی اپنا ذاتی فون نہیں لیا تھا۔ کہ پیچھلا وہ اسے دے چکی تھیں۔

کب تک آئیں گیں؟ اسے سخت اُلجھن ہوئی۔

یہ تو جی مجھے نہیں پتہ۔ عاجزی سے جواب ملا۔

اچھا۔ چلیں جب آئیں میری کال کا بتا دیجئے گا۔ اور پھر اس نے فون رکھ دیا۔ کیا زندگی بن گئی تھی۔ اس نے خالی خالی نظروں سے وائٹ واشڈ روم کو دیکھا۔ جس کی جنوبی سمت کھڑکی کے دونوں پٹ بند تھے۔ اور جس کیسامنے بھاری پردے پڑے قالین کو چھو رہے تھے۔ اس نے فون سائڈ ٹیبل پہ رکھا۔ اور چت لیٹ گئی۔ فکر اور خوف اس وقت اس کے ساتھ تھا۔

For more visit (exponovels.com)

:::::::::::::

گھر واپس آنے کے بعد وہ بیڈ پہ لیٹی ایسی سوئی۔ کہ پھر ذریت کے کمرے میں آنے کا بھی علم نہ ہو سکا۔اس نے کمرے میں داخل ہو کر ہلکی روشنی میں بڑے سے لحاف میں ڈبکے اس کے وجود کو دیکھا۔اور گہرا سانس لیتا ایک فائل لئے صوفے پہ بیٹھ گیا۔

سائڈ لمپ کی روشنی میں اس نے لمپ کے قریب پڑے سگریٹ پیک کو اُٹھایا اور پھر فائل سے نظر ہٹائے بغیر ایک سگریٹ نکال کر منہ میں رکھا اور لائٹر سے شعلہ دہکایا۔

ایک کش لے کر اس نے ایک نظر پھر سے ماہ نور کو سوئے دیکھا۔اور پھر کچھ سوچ کر فائل وہی صوفے پہ پھینک کر کمرے سے نکل کر ٹیرس پہ آگیا۔

ٹیرس کی چھت سے لگے بلب کی سفید روشنی میں اس کا سیاہ عکس بائیں جانب دیوار پہ پڑ رہا تھا۔اس نے موبائل فون جینز کی جیب سے نکالا اور چمکتی سکرین پہ انگلی پھیر کر ایک نمبر ڈائل کیا۔

ہم۔۔۔سلام کا جواب اس نے ہوں میں دیا تھا۔

اکمل اس وقت گہری نیند میں تھا جب اس کی کال آئی۔اب وہ دونوں بات کر رہے تھے۔جب گرم کمرے میں ٹیرس کے دروازے سے ہلکی ہوا کی ٹھنڈک نے کمرے میں لیٹی ماہ نور کو ہوش کی دنیا میں لا پٹخا۔اس کا چہرہ لحاف سے باہر تھا۔ تبھی ٹھنڈی ہوا میں پھیلے ذریت کے پرفیوم نے اسے جگا دیا تھا۔

اس نے مندی مندی آنکھوں سے باہر سے اندر آتی روشنی میں کمرے کے ماحول پہ ایک اچٹتی نگاہ ڈالی اور کسلمندی سے کروٹ بدلی۔

مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں۔میری طرف سے وہ بھاڑ میں جائے۔اس کی آواز میں محسوس کی جانے والی سختی تھی۔ماہ نور نے دونوں آنکھیں وا کر کے اور ذرا سر اُٹھا کر آواز کی جانب دیکھا۔

میرا اس سے کوئی مطلب نہیں ہے۔ تم جانتے ہو۔ وہ اس کی قاتلہ ہے۔ اور میرے لئے وہ ہمیشہ وہی تھی، ہے اور رہے گی۔ اس کی آواز اب کی بار کچھ اور واضح اور کچھ اور سخت تھی۔ ماہ نور اُٹھ کے بیٹھ گئی۔ وہ کچھ اُلجھی اُلجھی نظر آتی تھی۔

اکمل میں نے اس سے کمیٹمنٹ اس لئے نہیں کی تھی۔ کہ میں نے اس سے شادی کرنی تھی۔

تم جانتے ہو۔ میرا مقصد کیا تھا۔ اس کے لہجے میں غصہ تھا۔ ماہ نور کو لگا اسے سُننے میں غلطی ہوئی ہے۔

میں تم سے مزید اس سب کے بارے میں بات نہیں کرنا چاہتا۔ میں سو رہا ہوں۔ اس نے جھنجھلا کر فون بند کیا۔ اور کمرے میں آگیا۔ اس نے مڑنے سے پہلے ماہ نور کو سوتے دیکھا تھا۔

یہ پتہ نہیں کیا کھا کے سوتی ہے۔ بڑبڑا کر اس نے اسے دیکھا تھا۔ اس بات سے بالکل انجان کے وہ سُن بھی سکتی ہے۔ ماہ نور کو بُرا تو کیا لگنا تھا۔ اسے تو اس کے باہر بولے گئے الفاظ پہ حیرت تھی۔ اگرچہ اسے زیادہ باتوں کی گہرائی میں جانا پسند نہیں تھا۔ مگر اب یہاں معملہ کچھ اور تھا۔ اور وہ اس لڑکی کے بارے میں سوچنے پہ مجبور تھی۔ جس کے بارے میں وہ بات کر رہا تھا۔

کیا تم سو رہی ہو؟

خاموشی۔۔۔

کیا میں سمجھوں کے تم جاگ رہی ہو؟

خاموشی۔۔۔

اچھا تم تو سچ میں سو رہی ہو۔ ماہ نور نے آنکھیں بند رکھیں تھیں۔ اس کے وجود میں ذرا جمبش نہ ہوئی۔ ذریت نے سائڈ لمپ آن کرتے اسے دیکھا۔ اور پھر سر فائل پہ جُھکا لیا۔

تمہارے بھائی کی کال آئی تھی۔ سوری بتانا بھول گیا تھا۔ اس کی آواز ایک بار پھر سے فضا میں گونجی۔ اور ساتھ ہی ماہ نور کا دل سُکڑ کے پھیلا۔

For more visit (exponovels.com)

کا۔۔ کیا کہہ رہے تھے وہ۔ بہت غیر ایرادی طور پہ اس نے جھٹکے سے منہ سے بلینکٹ اُتار کر پوچھا تھا۔ ذریت بہم سا مسکرایا۔ مگر ظاہر نہیں کیا۔

بتائیں بھی۔۔۔اس کی خاموشی پہ وہ جھنجھلا گئی تھی۔ بھائی کی بات پہ تو اس کا دل چاہا تھا۔ کہ اُڑ کے ان کے پاس چلی جائے۔ اگرچہ وہ کچھ دیر پہلے وہاں سے ہی آئی تھی۔ مگر کیا تھا۔ کہ دل اور کہیں لگنے کو ہی نہ آتا تھا۔

آپ تو سو نہیں رہی تھیں؟

اتنے شور میں تو مرُدے اُٹھ بیٹھیں۔ میں تو پھر۔۔۔اس کی بات پہ اس نے بڑے انداز میں پُرسکون انداز میں کہا۔ تو ذریت نے مسکرا کر اسے دیکھا تھا۔

خیر بھائی کیا کہہ رہے تھے۔؟ وہ اب بھی وہیں تھی۔

پوچھ رہے تھے۔ کہ تم کیسی ہو۔

بس؟

ہاں بس

مطلب اُنہوں نے اور کچھ نہیں کہا؟ اسے یقین نہیں آیا۔

اور بھی کچھ کہنا تھا کیا؟

نہیں میرا مطلب ہے۔ اُنہوں نے میرے آنے کا نہیں پوچھا۔ اس کا دل تو تھا ابھی کہ مزید وہاں رُکتی مگر اب کیا کیا جا سکتا تھا۔

نہیں! ویسے بھی آپ کل ابھی وہاں سے آئی ہیں۔

تو؟

توکچھ نہیں۔ پھر چلے جانا۔ فائل کا اگلا ورق پلٹتے اس نے اس کے بگڑ کر تو کہنے پہ بہم سا مسکرا کر کہا۔ تو جواب میں وہ خاموش ہی رہی تھی۔

تقریباً دس منٹ تک جب وہ کچھ نہ بولی۔ تو اسے لگا وہ سو گئی ہے۔

کیا تم میرے لئے چائے بنا سکتی ہو؟

ماہ نور بھائی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ چونک گئی۔

شرفاء اس وقت سوتے ہیں نہ کہ کسی کو چائے کا بول کے تنگ کریں۔ جواب بڑا تڑخ کے دیا گیا تھا۔ وہ ہونٹ دبا کے مسکرایا۔

میں کیا بندے کھاتا ہوں۔ جو آپ میرا شمار شریفوں میں نہیں کرتیں۔ کبھی آپ کبھی تم

مجھے کیا پتہ میں کونسا آپ کے ساتھ ہوتی ہوں۔ کروٹ بدل کر اس نے بھی جواب دینا عین ضروری سمجھا تھا۔ نیند تو اڑ چکی تھی۔ اب تو بس بہانے تھے۔

جو دل کے بہت پاس ہوں۔ ان کے لئے ضروری نہیں ہوتا کے ساتھ بھی ہوں۔ بظاہر سر فائلوں سے اُلجھاتے اس نے ایک بے ضرر جملہ کہا تھا۔ مگر وہ ماہ نور کو حیران کر گیا تھا۔ اس نے بند آنکھیں پوری وا کر دیں۔ اور بالکل خاموش ہو گئی۔ وہ اس وقت یہ سمجھنے سے قاصر تھی۔ کہ آیا کہ جملہ اسی کی طرف اُچھالا گیا ہے۔ یا پھر محض اس کی ذہنیت تھی۔

ذریت نے جواب میں خاموشی پا کر اسے مڑ کر دیکھا تھا۔ وہ خاموش تھی۔

تو کیا میں انکار سمجھوں؟

خاموشی۔۔۔

جواب تو دے دیں۔۔۔ شائد بات کا تاثر ختم کرنے کا معمولی کا طریقہ کار تھا۔ ویسے اس کی ضرورت کیا تھی؟

For more visit (exponovels.com)

ٹھیک ہے بھئی مرضی آپ کی۔ گہرا سانس لے کر اس نے بہت ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ اور پھر جُھک کر ہاتھ میں پکڑے پین سے دستخط کرنے لگا۔ البتہ بڑی بے چینی سے ماہ نور کے پہلو بدلنے کو اس نے بڑی شدت سے محسوس کیا تھا۔

:::::::::::

دروازہ لاک کرنے سے پہلے اس نے جرسی کے اگلے بٹن بند کئے اور وہیں جرسی کی جیب سے چابی کال کر بیڈ پہ پڑے بیگ کو کندھے پہ ڈالتی باہر آ گئی۔ دروازہ لاک کر کے اس نے سکول کے لئے نکلنا تھا۔

صبح میں آج کافی دھند نظر آ رہی تھی۔ ہر چیز سفیدی میں لپٹی سرد و منجمد۔ اس نے گیٹ سے نکلتے ایک نظر مڑ کر ہوسٹل کی بلڈنگ کو دیکھا۔ اور ابھی قدم آگے بڑھائے ہی تھے۔ جب وہیں گیٹ کے قریب بنے کمرے سے گارڈ باہر آیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک خاکی لفافہ تھا۔

لفظ میڈم پہ اس نے ابرو اُٹھا کر اسے دیکھا تھا۔

یہ آپ کے لئے صبح کوئی موٹر والا دے کے گیا ہے۔ میں نے دفتر میں دیا تھا۔ پر میڈم نے کہا۔ کہ آپ کا شائد ضروری لفافہ اس لئے جب آپ سکول جانے لگو۔ تو آپ کو پکڑا دوں۔ قد میں لمبا اور وزن میں خاصے بھاری گارڈ نے بڑی دل جمعی سے بتاتے ہوئے لفافہ اسے تھمایہ تو اس نے ناسمجھی سے پکڑ کر لفافہ کھول لیا۔

مجھے کون۔۔۔ کیا بھیج سکتا ہے۔ بڑبڑاتے اس نے لفافے میں ہاتھ ڈالا، اور قدم وہیں گیٹ کے قریب اندر کی جانب لان کی جانب بڑھا دئے۔

سنگی بنچ پہ بیٹھتے اس نے سخت سفید سطح کو دیکھا۔ اور پلٹ دیا۔

کاغذ کی سطح کو پلٹتے ہی اس کے سامنے ایک بڑے سارے پوسٹر کی شکل کی ایک تصویر تھی۔ اور بالکل بھی ایسی نہیں تھی۔ کہ اسے اس کے سوا کوئی اور دیکھتا۔ بعض اوقات انسان ایسے زوردار اور غیر یقینی جھٹکے سے دوچار ہوتا ہے۔ کہ وقتی طور پہ اس کی تمام حسیات مفلوج ہو جاتی ہیں۔ اور اس کے لئے ہر ایک چیز اپنا مقصد کھو دیتی ہے۔ وہ بس بے معنی ولا

تعلقی کی سطح پہ آ ٹھہرتا ہے۔اس کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔عزت جانے کا خوف اس قدر سخت تھا۔کہ اسے سمجھ نہیں آیا کہ وہ کیا کرے۔اور وہ اس ایک لمحے میں بے حس ہو گئی۔

اس کا جسم ساکن ہوا۔اور اوپر گویا برفباری ہونے لگی۔

سردی میں ایک دم سے شدت آگئی۔اور اس کے وجود میں چونٹیوں کی سی سنسناہٹ ہونے لگی۔

اس نے بہت خالی نظروں سے اس پوسٹر کو دیکھا۔اور پھر اسے بغیر کسی خاص قسم کا تاثر دئے اپنے بیگ میں ڈال لیا۔وہ نہیں سمجھ رہی تھی۔کہ وہ اس لمحے کیا کر رہی ہے۔

اس نے ایک نظر ہوسٹل کی پُر شکن عمارت کو دیکھا۔اور بہت خاموشی سے قدم باہر گیٹ کی جانب بڑھا دئے۔اس کے چہرے پہ سوائے بے حسی کے اور کائی تاثر نہ تھا۔

::::::::::::::::

اس نے چلتے چلتے تھک کر ایک سنگی بینچ کو دیکھا اور اسی پہ بیٹھ گئی۔اس کا سانس دُھکنی کی طرح چل رہا تھا۔اور آنکھوں میں سکوت سا تھا۔ایک چشمے کی مانند جس میں کنکر گرنے سے پہلے سکوت ہوتا ہے۔اس کی آنکھوں کی گہرائی میں بھی مکمل سکوت اور بے حسی تھی۔بغیر کسی جوش وولولے کے۔اس نے گہرا سانس لے کر سڑک کے کنارے چلتی گاڑیوں کو دیکھا اور پھر مخالف سمت میں لگے درخت پہ اپنی نگاہ ٹکا دی۔

ہلکی ٹھنڈی ہوا میں درخت کے پتے ہل رہے تھے۔اور ہلکے سُروں میں دُھن پیدا کرتے تھے۔اس نے چند لمحوں تک درخت کو دیکھا۔اور جب آنکھیں تھک گئیں تو نگاہ کا رُخ پہلو کی طرف موڑ لیا۔

بوڑھی نہ جانے کب سے اس کی ایک ایک حرکت نوٹ کرتی اس کو اپنی نگاہ میں رکھے ہوئے تھی۔اب جو اس نے مڑ کر دیکھا تو اپنی خزاں رسیدہ سی خوبصورتی کے ساتھ مسکرا دی۔اس کے چہرے پہ جُھریاں ایسے تھیں گویا۔پت جھڑ کے موسم میں کسی پُرانے درخت سے کوئی پُرانا عمر رسیدہ پتا گرا ہو۔اور جس کی سطح پہ بے تحاشا بل ہوں۔

کب سے ادھر ہو؟اس کو اپنی جانب دیکھتا پا کر بوڑھی نے پوچھا۔فرح نے چونک کر اس کی جانب دیکھا

میں؟

ہاں تم۔۔۔

کیوں؟جواب دینے کی بجائے اس نے معصومیت سے پوچھا تھا۔

کوئی غم معلوم ہوتا ہے۔بڑی متانت سے خاتون نے کہا۔تو اس نے خالی خالی نظروں سے اسے دیکھا اور چہرے کا رُخ موڑ لیا۔

میں کسی غم میں کیوں ہوں گی؟

اس لئے کہ یہاں ہر کسی کو کوئی نہ کوئی غم ہے۔تم بھی تو اسی دنیا کی رہنے والی ہو۔بوڑھی نے بہت نرمی اور ملائمت سے اسے سمجھانے والے انداز میں کہا تو وہ اسے دیکھنے لگی۔

تو اماں آپ کا کیا مطلب ہے کہ اس دنیا میں آکے کوئی خوش نہیں رہتا؟

ارے پگلی۔۔۔اس کی معصومیت پہ بوڑھی ہنس دی تھی۔یوں جیسے کوئی بچہ کوئی بہت احمقانہ بات کرتا ہے تو والدین ہنس دیتے ہیں۔

خوش تو بہت سے لوگ رہتے ہیں۔لیکن صرف وہ جو رہنا چاہتے ہوں۔

مطلب؟

لو۔۔۔اب مطلب پوچھنے لگی۔اتنی سی بات بھی سمجھ نہیں آتی۔وہ اسے بالکل بچے کی ہی طرح ٹریٹ کر رہی تھیں۔فرح نے منہ بنایا۔

ارے بھئی جو چاہتے ہوں کہ وہ خوش رہنا چاہیں۔ان کا غم کب کچھ بگاڑ پائے ہیں۔ان کو کب فکر اور پریشانی گھیر پائی ہے۔

لیکن بعض اوقات کچھ باتیں ایسی بھی تو ہوتی ہیں۔ جن پہ پریشان ہونا لازمی ہے۔

ہاں بالکل۔ لیکن ایسی باتیں عموماً وہ ہوتی ہیں۔ جن کا حل ہوا جانا ضروری ہوتا ہے۔ ان کا کوئی دوسرا رستہ نہیں ہوتا سوائے اس کے کہ ان کا حل نکالا جائے۔ سمجھی؟

اس نے سر اثبات میں ہلا دیا۔

شاباش! اس کا اثبات میں ہلتا سر دیکھ کر بوڑھی جیسے خوش ہو اُٹھی۔

اب میں تم سے یہ تو نہیں پوچھوں گی۔ کہ مسئلہ کیا ہے۔ لیکن اتنا ضرور کہوں گی۔ کہ پریشان مت ہو۔ بس حل نکالو۔ حل تمہارے سامنے ہی ہو گا۔ بس غور کرو۔

رونے گڑ گڑانے سے کچھ نہیں ہوتا۔ بہادری عورت کا زیور ہوتی ہے۔

لوگ کہتے ہیں عورت کا زیور حیا ہوتی ہے۔ ٹھیک کہتے ہیں۔ دین بھی یہی کہتا ہے۔ اور پھر کیا کہنے اس خوبصورتی کے۔ کہ جس میں بہادری بھی شامل ہو۔ کوئی شک نہیں کہ اگر حیا کیساتھ عورت بہادر بھی ہو۔ حیادار اور بہادر عورت سے زیادہ خوبصورت کوئی عورت شائد ہی ہو۔ اس کا حُسن ایسا دو آتشہ ہوتا ہے۔ کہ کوئی کیڑا مکوڑا اس کے گرد منڈلا بھی نہیں سکتا۔ ہر کسی کو اپنے پنکھ جل جانے کا خطر ہوتا ہے۔ آخر میں اپنی ہی بات سے خوب محظوظ ہو کر بوڑھی نے کھل کھلا کر کہا تو وہ بھی مسکرا دی۔

اچھا بھئی۔ میں نے بھی کیا خوب کہی۔۔۔ فرہاد کے ابا سہی کہتے ہیں۔ جہاں باتیں کرنے کو بیٹھتی ہوں۔ پھر کہاں اُٹھتی ہوں۔

گھر سے پالک لینے نکلی تھی۔ اور اب کہو۔ کہ یہاں بیٹھ کر باتوں میں لگ گئی۔ اُٹھ کر کھڑے ہوتے بوڑھی نے ہنستے ہوئے کہا۔ تو اس نے اس قدر باتونی اور باذوق قسم کی اماں کو دیکھ کر دل ہی دل میں سراہا تھا۔

جامن رنگ سوٹ پہ چھوٹے چھوٹے غلابی پھولوں والے شلوار قمیض میں بوڑھی خوب باذوق دیکھ رہی تھیں۔ عمر رسیدہ چہرہ بھی اس نے اُٹھنے کے ساتھ سیاہ چادر سے ڈھک لیا۔

فرح اسے دیکھتی رہی۔ اور وہ اس کے سر پہ ہاتھ رکھ کر آگے بڑھ گئی تھیں۔ فرح کو ان کا یہاں سڑک کے کنارے بیٹھنا سمجھ نہیں آیا تھا۔ وہ بس اُنہیں جاتا دیکھتی رہی۔ یہاں تک کے وہ آنکھوں سے اجھل نہ ہو گئیں۔

اس نے چند لمحے تک مزید وہاں بیٹھ کر گاڑیوں کو دیکھا۔ مگر اب کی بار نظر میں فرق تھا۔ سو جلد وہاں سے اُٹھ گئی۔

:::::::::::::

ماہ نور۔۔۔

جی؟ اس نے ان کی کپڑوں کی الماری کو خالی کرتے مصروف انداز میں چہرہ موڑے بغیر پوچھا تھا۔

کل مومنہ کا فون آیا تھا۔ تسبیح کرتے اُنہوں نے رُک کر کہا۔ تو ماہ نور کے ہاتھ رُک گئے۔ اور مڑ کر اُنہیں دیکھا۔

کیا کہہ رہی تھیں؟

کل۔۔۔ وہ ذرا دیر کو رُکیں اور گہرا سانس لیا۔

کل ان کے ہاں قرآن خوانی کا انتظام ہے۔ کہہ رہی تھی۔ کہ ہم ضرور آئیں۔ تو۔۔۔

تو تم اور ذریت چلے جانا۔

آپ نہیں جائیں گیں؟

نہیں۔۔۔ میں گھر پہ ہی پڑھ دوں گی۔ میرے سے سفر نہیں ہوتا۔ گھوٹنے کا درد دن بدن بڑھتا جا رہا ہے۔ اس نے اُن کا چہرہ دیکھا۔ وہاں تکلیف کا تاثر گہرہ تھا۔ وہ ان کے قریب چلے گئی۔ اور ان کے گھوٹنے پہ ہاتھ رکھا۔ چہرے پہ واضح پریشانی کے آثار تھے۔

For more visit (exponovels.com)

اگر زیادہ درد ہے۔ تو ہم ابھی ڈاکٹر کے پاس چلیں۔ اسے ان کی ذرا سی تکلیف خوف زدہ کر دیتی تھی۔ اب بھی وہ گھبرائی۔

ہاں سوچ رہی ہوں۔ کہ ایک چکر ڈاکٹر کے پاس لگا ہی لیں۔ ویسے بھی کیا فائدہ اگر اور تکلیف بڑھ گئی۔ پھر بھی تو جانا ہی ہے۔ آخر میں وہ مسکرائیں۔ انہیں مسکراتے رہنے کی عادت تھی۔

ماہ نور نے سر ہلا دیا۔ ذریت کے ساتھ جائیں گیں۔؟

ہم۔۔۔ آتو جائے وہ نالائق۔ کل سے پتہ نہیں کہاں ہے۔ وہ کل رات گھر نہیں آیا تھا۔

تمہیں بھی اس نے کچھ نہیں بتایا؟

وہ۔۔۔

وہ۔ نہیں اُنہوں نے مجھے بھی کچھ نہیں بتایا۔ اسے کیا ضرورت تھی جھوٹ بولنے کی۔۔ وہ خود جھوٹا تھا۔ اس نے اس رات ایک ایک بات کو ابھی تک اپنی میمری کی سیف میں لاک رکھا تھا۔ اور موقع کی تلاش میں تھی۔ کہ حقیقت کا پتہ چلائے۔ آخر وہ لڑکی جس کی وہ بات کر رہا تھا۔ کون تھی؟ دوسری طرف کون تھا۔ یہ وہ اچھے سے جانتی تھی۔ اکمل کے سوا اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ لیکن لڑکی کون تھی۔ جس کے بارے میں اتنی ذومعنی وہ باتیں کر رہا تھا۔ اس کو جاننے کی اسے بڑی شدید خواہش سر اُٹھا چکی تھی۔ اور اس خواہش کا سر کُچلنا کم از کم اس کے اختیار میں نہیں تھا۔

اچھا دادی جان آج ہیں آپ کو کچھ اچھا سا بنا کر کھلانا چاہتی ہوں۔ بتائیں آج آپ کیا کھائیں گیں؟ اُٹھنے سے پہلے اس نے بہت پُرجوش ہو کر پوچھا تو دادی جان چونک گئیں۔

کیا تم مومنہ کی طرف نہیں جاؤ گی؟ وہ پوچھے بغیر نہ رہ سکیں۔

وہ تو جب ذریت آئیں گے تبھی پتہ چلے گا۔ اس نے کہا اور پھر اُنہیں سوالیہ انداز میں دیکھتے واپس الماری کی طرف مڑ گئی۔

ارے بھئی تم اس کو فون تو کرو۔

کیا بنے گا اس لڑکے کا۔ شادی سے پہلے بھی اس کا یہی حال تھا۔ اور اب شادی کے بعد بھی اس لڑکے کو عقل نہیں آئی۔ دادی جان باوجود غصے کے کبھی اپنے لہجے کو نہیں بدلتی تھیں۔ ان کے ایک ایک انداز سے نرمی اور حلاوت ٹپکتی مقابل کو سیراب کر جایا کرتی تھی۔

میں۔۔۔ میں کرتی ہوں۔ وہ تیزی سے باہر نکلی۔

اسے کہو جلدی گھر آئے۔ آج اگر لیٹ آئے تو بے شک کمرے میں نہ گُھسنے دینا۔ کمرے سے نکلتے بھی اس نے اُن کے الفاظ سُن لئے تھے۔ مسکرا دی۔

لاؤنج میں آکر اس نے جرسی کی جیب سے موبائل نکالا اور صوفے پہ بیٹھ کر ٹانگوں کو اُوپر صوفے پہ اکٹھا کیا اور بڑی فرست سے اس کا نمبر ڈائل کیا۔

اسلام علیکم! گھمبیر و مصروف آواز۔ ماہ نور نے بولنے سے پہلے لمبا سانس لیا۔

ذریت نے پُشت چھوڑ کر کان سے لگے فون کو ہٹا کر چہرے کے سامنے کیا اور پھر واپس کان سے لگایا۔ جیسے نمبر کی تصدیق کی ہو۔

(جی مادام؟ اس کے کچھ بھی بولنے سے پہلے اس نے پوچھا تو ماہ نور نے منہ بنایا۔ یہ کیا طریقہ ہوا بھلا بولنے کا۔ (شوخ

/جی مادام/

آپ کو یاد ہے کہ آپ کا کوئی گھر بھی ہے؟ لہجے کو بے پرواہ بناتے اس نے پوچھا تو ذریت نے چونک کر سامنے دیوار پہ لگے گھڑیال کو دیکھا اور پھر آنکھیں سکیڑ کر دائیں جانب بڑی سی قد آدم کھڑکی سے باہر موسم کو۔ اور سر کرسی کی پُشت سے ٹکا دیا۔

وہ کل سے آفس میں مسلسل کام میں مصروف تھا۔ ایک نئے پروجیکٹ کے سلسلے میں اسے کل پیرس جانا تھا۔ اور کام کے اس مسلسل بوجھ اور جنجھٹ میں گھر کا یاد ہی نہیں رہا تھا۔

میں آپ کو کال کرنے کا سوچ رہا تھا۔آپ تیار رہیں مومنہ آپی نے بلایا ہے۔ادھر جانا ہے۔بجائے اس کے کہ وہ اس کی بات کو جواب دیتا اس نے ایک نیا حکم دے دیا تھا۔ماہ نور نے ناگواری سے صوفے سے ٹانگیں واپس نیچے اُتاریں۔

میں نے بھی کچھ پوچھا ہے۔اس کا جواب دینا اگر آپ مناسب سمجھیں تو براہِ مہربانی دے دیں۔دادی جان کو جواب دینا ہے۔مکمل لاتعلقی۔۔۔ذریت نے سمجھ کر سر ہلایا۔

آپ بس ان کو بول دیں کے میں دس منٹ میں گھر آرہا ہوں۔وہ بھی تیار رہیں وہ بھی جائیں گیں۔اور کچھ ؟

میں نے آپ سے کب کہا کہ میں آپ کے ساتھ جاؤں گی ؟

اوہ۔۔۔تو آپ نہیں جائیں گیں ؟

میری جو مرضی ہو گی میں وہی کروں گی۔اسے اپنا اس طرح اگنور کیا جانا سخت بُرا لگا تھا۔کسی کو بھی لگ سکتا تھا۔ایک انسان جسے دو دن تک گھر تک کا حوش نہ رہے اس کا کیا مطلب ہو سکتا تھا۔وہ اس وقت یہی سوچ رہی تھی۔

ٹھیک ہے۔میں گھر آرہا ہوں پھر بات کرتے ہیں۔ابھی میں ذرا مصروف ہوں۔کہہ کر اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی اس نے فون واپس رکھ دیا تھا۔

ماہ نور کا دل چاہا تھا ہاتھ میں پکڑا فون زمین پہ دے مارے۔

/آفس/

سر بھابھی کی کال ہے تو پلیز آپ گھر چلے جائیں۔میرا خیال ہے کہ اس وقت وہ بہت غصے میں ہیں۔اس کے سامنے اس کا امپلائے کم دوست زیادہ بلال بیٹھا تھا۔اس نے اس یک طرفہ گفتگو کا نتیجہ آخز کرتے ہوئے کہا۔تو ذریت نے سر ہلایا اور سامنے کی فائل واپس کھول لی۔

بیویوں کا کام غصہ کرنا ہی ہوتا ہے۔سو۔۔۔ایزی۔بہت عام سے انداز میں اس نے کہا تو بلال اسے دیکھنے لگا۔اس بندے کو وہ شائد کبھی سمجھنے کی کوشش کرتا تو مشکل میں پڑ جاتا۔

:::::::::::

اس نے واپس کمرے میں آکر اُنہیں ایک نظر دیکھا۔اور کھولی الماری کی جانب بڑھی۔

کیا کہا اس نے؟

کہہ رہے ہیں۔کہ دس منٹ میں آرہے ہیں۔

اس نے بتایا نہیں کہ ہے کہاں؟اس نے جس طرح منہ لٹکا کر کہا تھا اُنہیں عجیب لگا تھا۔ایسے کیا کہہ دیا تھا۔کہ ہنستی کا منہ لٹک گیا تھا۔

نہیں اُنہوں نے نہیں بتایا۔آئیں تو آپ خود پوچھئے گا۔کپڑے تیہہ کرتے الماری میں سیٹ کرتے اس نے کہا اور پھر خاموش ہوگئی۔اُنہوں نے تسبیح واپس رکھی اور ایک نظر ماہ نور کو دیکھ کر لیٹ گئیں۔

::::::::::::::::

نارنجی سورج ڈوب رہا تھا۔جس وقت اس نے آٹو سے اُتر کر اسے پیسے دئے تھے۔

اس کے دونوں ہاتھوں میں کچھ شوپنگ بیگز تھے۔جن کا وزن دیکھنے میں چند کلو سے زیادہ بالکل نہیں لگتا تھا۔

اس نے سست روی سے چلتے نظریں جُھکائے پیدل ہوسٹل تک کے سفر کا آغاز کیا اور ساتھ ہی دماغ میں تانے بانے بُننے لگی۔وہ اس وقت سخت مصیبت میں تھی۔اس کا بات کا علم شدت سے تھا۔زندگی میں اتنے مسائل شائذ ہی کسی نے دیکھیں ہوں جتنے اس نے دیکھ لئے تھے۔یہ اس کا خیال تھا۔۔۔

ہوسٹل کا رستہ محض دس منٹ کی مسافت پہ تھا۔مگر وہ اسے طے ایسے کر رہی تھی۔کہ شائذ پہنچنے میں آدھا گھنٹا لگتا۔

بس ایک لمحا سا حائل ہے۔جو زندگی کو پل میں یا تو روک دیتا ہے یا پھر پل میں سُدھار دیتا ہے۔اس لمحے کے آگے بھی بے بہا کہانیاں ہوتی ہیں اور پیچھے بھی۔۔۔

کاش میں نے اس روز کوئی ایسا قدم اپنے حق میں اُٹھایا ہوتا۔ جو کم از کم مجھے گھر سے بے گھر تو نہ کرتا۔ چلتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی۔

اس کی ذات کی کہانی ایک موبائل فون سے شروع ہوئی تھی۔۔۔ ایک انجانے میں کی گئی غلطی سے جس کا انجام اس کی سوچ سے زیادہ تکلیف دے تھا۔

اس نے گہرا سانس لے کے اپنے اندر کی گھوٹن کم کرنے کی کوشش کی اور پھر اپنے سامنے سینہ تانے کھڑے ہوسٹل کی عمارت کو دیکھا اور قدم اندر کی جانب بڑھا دئے۔ اس نے سارے دن میں اب ہوسٹل کی عمارت میں قدم رکھا تھا۔

*

اس نے گہرہ سانس لے کر سر گاڑی کی سیٹ سے ٹکا دیا۔۔۔ اور آنکھیں بند کر لیں۔

آپ کو یقین ہے کہ وہی تھیں؟ بابر نے فون جیب سے نکالتے اس کی جانب دیکھ کر پوچھا تھا۔ ابرار نے آنکھیں موندے ہی سر اثبات میں ہلایا۔

بھائی اگر وہ ہوتیں تو پھر ماہ نور ضرور بتاتی۔ جبکہ کل جب میں نے اس سے کال پہ بات کی اور اسے بتایا کہ شادی کی تصویریں بہت اچھی ہیں۔ خاص طور پہ اس کی اور فرح کی۔ تو اس نے کہا کہ میں اسے وہ بھیج دوں۔ فرح سے تو اب پتہ نہیں کب ملنا ہو۔۔۔

یار! یہ بھی تو ممکن ہو کہ وہ جانتی ہی نہ ہو۔ ابرار نے آنکھیں کھول کر سیدھے بیٹھتے اس سے کہا۔ اور گاڑی کی چابی انگیشن میں ڈال کر گھوما دی۔

ہاں یہ ممکن ہے۔ کہ ماہا کو بھی نہ معلوم ہو۔

ویسے آپ ہو بڑی چھوپی چیز۔۔۔ اب تک یہ الفاظ بابر دو سو بار تو بول ہی چکا تھا۔

اچھا۔۔۔

بھائی اتنا کم تاثر۔۔۔ویسے آپ نے ان کو آواز کیوں نہیں دی؟

ان دونوں نے فرح کو مارکیٹ میں ایک شوپ کے باہر دیکھا تھا۔ابرار اس کی طرف بڑھا مگر وہ ہجوم میں کہیں گُم ہو گئی۔تب سے وہ دونوں اسے ڈھونڈ رہے تھے مگر وہ دوبارہ نظر نہیں آئی۔

بابر تمہارا دماغ تو نہیں خراب۔۔ تمہیں نہیں لگتا کہ اگر میں اسے آواز دیتا تو لوگ مجھے پاگل سمجھتے اور اس کی جو بے عزتی ہوتی وہ الگ۔ابرار پہ سخت جھنجھلاہٹ سوار تھی۔

پر بھائی میں نے سُنا ہے کہ جب انسان کو عشق ہوتا ہے تو وہ دنیا سے کٹ جاتا ہے۔وہ اپنے محبوب کو دیکھتا ہے تو اس کے لئے باقی ہر چیز بے معنی ہو جاتی ہے۔بابر کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔اسے تو بہت مزہ آرہا تھا ابرار کو تنگ کرنے میں۔

میرے بھائی معاف کر۔۔۔تو نے تو جیسے عشق میں پی ایچ ڈی کر رکھی ہے۔اور اب اگر تو بولا تو یقین کر میں نے تمہیں گاڑی سے باہر دھکا دے دینا۔ابرار کے ماتھے پہ ناگواری کے بل تھے۔بس ہاتھ جوڑنے باقی رہ گئے تھے۔بابر نے مسکراہٹ روک کر چہرہ دوسری جانب شیشے سے ٹکالیا۔

ٹھیک ہے بھئی۔۔۔میں تو سوچ رہا تھا۔کہ اب بھابھی لانے کی فکر کرتے ہیں۔آخر کو ہم نے ہی آپ کا سوچنا پر۔۔۔

بس چُپ اب۔۔۔سوچنے دو مجھے۔اس نے راہ میں ہی اس کی بات کاٹ دی۔اور گاڑی کا رُخ گھر کی جانب موڑ دیا۔

:::::::::::

جس وقت اس کی گاڑی پورچ میں آکر رُکی ماہ نور الماری کے کام سے فارغ ہو کر اپنے کمرے میں نماز پڑھنے جا رہی تھی۔اس نے راہداری سے گزرتے ہارن کی آواز ضرور سُنی مگر رُکی نہیں۔

کمرے میں آکر اس نے وضو کیا اور نیئت باندھی۔

السلامُ علیکم! بالوں پہ ہاتھ پھیرتے اس نے بہت تھکے ہوئے انداز میں سلام کیا۔اور ایک طائرانہ نظر بھی کمرے میں ڈالی۔

For more visit (exponovels.com)

پوتے کی آواز سُنتے ہی دادی جان اُٹھ بیٹھیں اور سوچنے کا کام روک دیا۔

!وعلیکم السلام

کیا آپ نے قسم کھا رکھی ہے۔ کہ آپ نے اپنی بوڑھی دادی کو ضرور شرمندہ کروانا ہے۔ آپ کو اچھا نہیں لگتا۔ کہ آپ کی دادی آپ سے خوش ہو؟ دادی جان کا پیچھلا جلال لوٹ رہا تھا۔ ذریت جوان کے قریب بیٹھ رہا تھا ٹھٹک کر رُکا۔ اور سر جُھکا دیا۔

سوری دادی جان۔

آپ کو چاہئے کہ آپ مجھے اور ماہ نور کو اپنی غیر موجودگی کا بتائیں؟

آپ کہاں تھے۔؟

پہلے آپ مجھے آپ آپ کہنا بند کریں۔ منہ بنا کر اس نے ان کی جانب دیکھا اور پھر ان کی گود میں سر رکھا۔ دادی جان پوتے کی رگ رگ سے واقف تھیں۔

آپ پہلے مجھے میری بات کا جواب دیں۔

اچھا یہ بتائیں آپ کی بہو کہاں ہے؟ اس کو بلائیں پھر بتاتا ہوں۔ ان کی سفید شال کے نیچے منہ چھوپاتے اس نے کہا تو وہ مسکرا دیں اور اس کے چہرے سے چادر ہٹائی۔ وہ نماز پڑھ رہی ہے۔ اور تم وقت پہ گھر آیا کرو۔ بیچاری نے رات میں اتنا اچھا کھانا بنایا اور تم نے مِس کر دیا۔

اچھا جیسے؟

جیسے کے بچے جاؤ اُٹھو۔ اور جا کر تیار ہو۔ تم دونوں نے مومنہ کی طرف جانا ہے۔ باتیں گول کرنا وہ اچھے سے جانتا تھا۔

آپ نہیں جا رہیں؟

نہیں

کیوں؟

ایک تو تم سوال بہت کرتے ہو۔۔۔ میرے گھوٹنے میں درد ہے۔اب اور سوال نہیں۔ ہو آؤ اُدھر سے پھر ڈاکٹر کی طرف چلتے ہیں۔

اور وہ جو آپ کا ڈاکٹر ویکلی آپ کا چیک اَپ کرنے آتا ہے وہ؟

وہ آج کل چھٹی پہ ہے۔ بڑے تحمل سے اس کے اگلے سوال دیا۔

کیوں؟ ذریت کے ماتھے پہ ناگواری کے بل تھے۔

اس لئے کہ اس کی بھی کوئی زندگی ہے۔ وہ اپنی فیملی کے ساتھ نیویارک گیا ہے۔ ہر کوئی تمہاری طرح نہیں ہوتا۔ کہ گھر والوں کو کام کے سامنے بھول ہی جائے۔اس پہ چوٹ کرنا وہ نہیں بھولی تھیں۔

اچھا اب آپ اپنی بہو سے مل کے میرے پہ طنز بھی کریں گیں۔اس نے مصنوعی بیچارگی سے کہا۔ تو دادی جان نے بمشکل مسکراہٹ روکی۔

اچھا اب یہ طنز ہو گیا۔۔۔ جب میں بولتی ہوں کہ گھر وقت پہ آؤ۔ تو تمہیں بات کیوں سمجھ نہیں آتی۔ پھر میں بوڑھی کچھ بولوں تو تمہیں طنز لگتا ہے۔

آپ۔۔۔ آپ مجھے ہمیشہ ایسے ہی بلیک میل کرتی ہیں۔ وہ جب اپنے آپ کو بوڑھی بولتی تھیں۔ ذریت کو گلِٹ ہونے لگتا۔ کہ شائد وہ ان کا خیال نہیں پا رہا۔ حلنکہ یہ سب تو زندگی کے سائکل ہیں جن کا چلنا لازمی ہے۔

ذریت حسن اس وقت بحث بے معنی ہے۔ چلو اور تیار ہو کر آؤ۔ رات میں کھانے کی میز پہ بات ہو گی۔

جانے سے پہلے کھڑکیوں کے پردے برابر کر جانا۔ یہ صاف اشارہ تھا۔ کہ اب وہ اس سے کوئی بات نہیں کریں گی۔ اس نے ان کی گود سے سر اُٹھایا تو وہ تکیہ درست کرتیں لیٹ گئیں۔ اس نے جانے سے پہلے ان کا کمبل درست کیا۔ اور کمرے سے نکل گیا۔

::::::::::::::

اس کے کمرے میں آنے سے پہلے ماہ نور کپڑے تبدیل کر کے چادر اوڑھ کر کمرے سے جا چکی تھی۔

وہ کمرے میں داخل ہوا۔ تو کمرے کی مخصوص خشبو نے اس کا استقبال کیا۔ وہ جب سے اس کمرے میں آئی تھی۔ کمرے میں روشنی اور خُشبو کا ٹھراؤ مسلسل ہو چکا تھا۔ یہ اس کے ذہن میں آنے والا پہلا خیال تھا۔ اس نے دروازہ واپس بند کیا۔ اور کمرے میں ایک متلاشی نظر دوڑائی۔ وہ وہاں نہیں تھی۔

کدھر گئیں مادام؟ بڑبڑا کر اس نے باتھ روم کے کھولے دروازے کو دیکھا۔ اور سر جھٹک کر بیڈ پہ بیٹھنے سے پہلے ریک سے جوتا نکالا۔

ٹائی گلے سے اُتار کر وہیں بیڈ پہ پھینکی اور کوٹ کو صوفے کی پُشت پہ ڈال کر اس نے واڈروب کا پٹ کھول کر کھدر کا گہرا نیلا شلوار سوٹ نکالا اور باتھ روم میں گھوس گیا۔

بیس منٹ بعد وہ باہر سیڑھیاں اُتر رہا تھا۔ اور ماہ نور صوفے پہ بیٹھی چائے پینے میں مصروف مکمل لاتعلق نظر آتی تھی۔ البتہ آنکھ کے کنارے سے وہ اس کو قمیض کے کف بند کرتے دیکھ چکی تھی۔

گہرے نیلے شلوار قمیض پہ سرمئی کوٹ پہن کر وہ سراہے جانے کے قابل لگ رہا تھا۔ اس کی شخصیت کا سارا نکھار جیسے عود آیا۔ اور ایک سوبر پن جھلک رہا تھا۔ اس کے سنجیدہ چہرے پہ ماہ نور کو دیکھ کر کوئی تاثر بظاہر نظر نہیں آیا مگر اندر سے وہ اس کی ناراضی محسوس کر کے خوب محظوظ ہوا تھا۔

کیا تم میری مدد کرو گی؟

For more visit (exponovels.com)

کف سے جھگڑتے اس نے آخر ہاتھ اس کے سامنے کیا۔ وہ اس کے بالکل سامنے کھڑا تھا۔

ماہ نور نے اسکے چہرے کی جانب دیکھنے سے اجتناب برتا اور کپ سامنے میز پہ رکھ کر ہاتھ اس کے کف کی جانب بڑھایا۔

بٹن کافی سخت تھا۔ شائد وہ یہ لباس پہلی بار پہن رہا تھا۔ نیا ہونے کی وجہ سے کف بھی سخت تھے۔

بمشکل تمام اس نے اس کے کف کا بٹن بند کیا تھا۔ اور اس عرصے میں وہ اس کا مکمل جائزہ لے چکا تھا۔

مونگیہ اور گہرے نیلے کھدر کے ٹراؤزر شرٹ پہ غلابی رنگ میڈیم جرسی میں۔ سر پہ سوٹ کے ساتھ ہی کے دوپٹے کو سلیقے سے جمائے ہوئے۔ پژمردہ چہرے کے ساتھ بھی اچھی لگ رہی تھی۔ ذریت نے اس کے سرد ہاتھ کی ہتھیلی کو اپنے دونوں ہاتھوں کے درمیان رکھا اور مسکرا کر اسے دیکھا۔ ماہ نور جو واپس کپ اُٹھانے والی تھی۔ اس اچانک افتاد پہ گھبرا گئی۔ اور ایک غصیلی نظر اس کے چہرے پہ ڈال کر چہرہ جُھکا گئی۔

چلیں؟

اس کے ہاتھ کو پکڑے، اور دوسرے ہاتھ سے اس کے سر کے دوپٹے کو اسے ماتھے کی جانب سرکاتے اس نے نرمی سے پوچھا تھا۔ اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی وہ اس کا ہاتھ پکڑے اسے باہر تک لے آیا۔ ماہ نور اسکے ساتھ بہت ربوٹک انداز میں چلی آئی۔

اس نے گاڑی کے قریب رُک ایک ہاتھ سے گاڑی کا دروازہ کھولا اور پھر اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

جب وہ بیٹھ گئی۔ تو دروازہ بند کرتا اپنی سیٹ کی جانب آیا۔ ماہ نور کو یقین بھی آرہا تھا۔ اور وہ بے یقین بھی تھی۔ فون پہ موجود ذریت حسن سے یہ والا ذریت بالکل الگ تھا۔ یا پھر تب وہ سچ میں مصروف تھا۔ تبھی اس تھکاوٹ کی بِنا پر ایسے بول گیا۔

میں کل پیرس جا رہا ہوں۔ گاڑی کو سڑک پہ ڈال کر اس نے سٹئیرنگ ویل گھماتے ہوئے اس کی جانب ایک نظر دیکھ کر نظر واپس سامنے جما لی۔

اچھا۔۔۔اپنے ہاتھ کے ناخنوں سے کھیلتے اس نے مختصر جواب دیا۔

کچھ چاہئے؟

نہیں۔

سوچ لو۔۔۔

کچھ چاہے ہو گا تو میں یہیں سے لے لوں گی۔اس نے بہت آہستگی سے ایک بار پھر سے جواب دیا۔اور ہاتھوں سے کھیلنا چھوڑ کر باہر دیکھنے لگی۔

ویسے تم نے آگے پڑھائی کا کیا سوچا؟اسے سمجھ نہیں آرہی تھی۔وہ ماہ نور سے کیا بات کرے۔پر وہ کرنا بھی چاہ رہا تھا۔اس لئے بات کو طول دینے کا آسان حل یہی تھا۔کہ پڑھائی کا ہی پوچھتا۔

ماہ نور نے بُرا سا منہ بنا کر اسے دیکھا تھا۔ذریت کو لگا اس نے غلط سوال پوچھ لیا ہے۔جیسے اکثر لوگوں کی پڑھائی سے کافی بُری یادیں وابستہ ہوتی ہیں۔بہت سے مضامین میں فیل ہونے کے بعد اُنہیں پڑھائی سے نفرت ہو جاتی ہے۔اور جب کوئی ان سے پڑھائی کا ذکر کرتا ہے۔تو بُرے منہ بناتے ہیں۔

کیا ہوا؟

میں نے شادی سے پہلے پڑھائی کا مکمل خیر باد کہہ دیا تھا۔

کیوں؟

بی۔اے بہت زیادہ تو نہیں ہے۔کہیں تم فیل تو نہیں ہوئی؟ مسکراہٹ روک کر بظاہر چڑانے کو اسنے ایسے کہا تھا۔پر ماہ نور کو صاف محسوس ہوا۔کہ وہ اس کا مزاق بنا رہا تھا۔

میں نے بی اے میں اے پلس لیا تھا۔صاف جتانے والا انداز۔

For more visit (exponovels.com)

اچھا۔۔۔مجھے پتہ نہیں کیوں۔لگتا ہے کہ تم ایسا میرے سامنے نمبر بنانے کو کہہ رہی ہو۔ویسے گھر جا کر مجھے اپنا رزلٹ کارڈ دیکھانا۔

آپ کو کیا میں فیل ہوں یا پاس۔آپ نے کونسا دنیا فتح کرلی ہے۔دانت چبا کر آخر اس سے جو بن پڑا اس نے جواب دے کر موقع پہ چھکا لگانے کی تھی۔ذریت نے بمشکل ہنسی روکی۔

لڑکیوں کو کبھی ان کی صحت یا پھر ان کے رزلٹ پہ کچھ ایسا نہیں کہنا چاہئے۔جس سے انہیں اپنی بے عزتی محسوس ہو۔یہ ان کے لئے ایک حساس موضوع ہوتا ہے۔وہ ایسے بُدکتی ہیں جیسے بندر کی دم پہ پاؤں آجائے وہ بُدکتا ہے۔

میں نے کب کہا۔کہ میں نے دنیا فتح کی ہے۔خیر۔۔۔یہ لاحاصل بحث ہے۔اسے کسی اور وقت کے لئے اُٹھا رکھو۔

میں کل جا رہا ہوں۔دس دن شائد لگیں۔اُمید ہے کہ آپ مجھے شدید یاد کریں۔کیوں سہی کہا میں نے؟اختتام پہ ایک آنکھ سے اشارہ کیا۔گویا چڑایا۔ماہ نور نے ایک ناگوار نظر اسے دیکھ کر نظر واپس شیشے کی جانب موڑلی۔

اگر مجھے پتہ ہوتا کہ آپ اتنے۔۔۔ایسے نکلیں گے۔تو میں کبھی آپ سے شادی کرنے کی حماقت نہ کرتی۔صاف لفظوں میں اسے یہ کہہ رہی تھی۔کہ وہ اس فیصلے پہ پچھتا رہی ہے۔ویسے سچی بات تھی۔کہ دس دن پہلے دو دن کے لئے ایک ڈرامے کا سین دیکھ کر اور ہیرو کے جزبات سے بھرپور اپنی بیوی کے لئے بولے گئے الفاظ سُن کر وہ ایسے ہی پچھتائی تھی۔

چلو اب کیا ہو سکتا ہے۔اب تو ہو گیا جو ہونا تھا۔ویسے بھی کسی ذہین نے کہا تھا۔کہ اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چُگ گئیں کھیت۔

ویسے اگر تم اتنے اور بڑے ایسے والے الفاظ کی تشریح کر دو۔تو مجھ ناسمجھ کی عقلِ سلیم میں شائد کوئی بات پڑھ جائے۔اس وقت شوخی پورے عروج پہ تھی۔اور ماہ نور جیسی زندہ دل لڑکی کے لئے زیادہ دیر ناراض رہنا مشکل تھا سو وہ ہنس دی البتہ چہرے کا رُخ اس نے موڑنے کی کوشش نہیں کی۔

آپ کو سیدھی باتیں سمجھ کہاں آتی ہیں۔

For more visit (exponovels.com)

غالباًیہ آپ نے کہا تھا۔وہ اسے اس کی غلط بیانی پہ تصیح کر گیا۔اور ساتھ ہی مسکرا کر گاڑی کا رُخ موڑا۔منزل قریب تھی۔

میں سب سمجھتی ہوں۔میں نے تو ویسے ہی کہا تھا۔اس نے منہ بنا کر ایسے کہا جیسے کہہ رہی ہو۔اتنے تم شوخے۔۔۔

چلیں ابھی کہ لئے اس بحث کو بھی ملتوی کرتے ہیں۔کیونکہ منزل آچکی ہے۔اس نے گاڑی پارکنگ کی جانب موڑتے ہوئے کہا۔تو ماہ نور نے مسکرا کر پہلی بار اس عرصے میں دیکھا تھا۔

آپ پتہ نہیں کتنی بحثیں اور تکرار آگے کے لئے ملتوی کر رہے ہیں۔ایسا نہ ہو ایک دم پھنسیں اور بھاگنے کو رستہ بھی میسر نہ ہو۔اُترنے سے پہلے اس کے ذہن میں جھمکے سے بالکنی کی گفتگو یاد آئی۔تو کہہ گئی۔اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا۔ماہ نور میڈم یہ جا وہ جا۔

کیااس نے مجھے کہا؟خود سے بڑبڑا کر اس نے خود سے ہی پوچھا۔اور پھر ڈیش بورڈ سے فون اُٹھا کر خود بھی سڑک پار کرتا گھر کے گیٹ کے اندر غائب ہو گیا۔

::::::::::::::

آپ کو کیا لگتا ہے۔

اس قسم کے اوچھے ہتھکنڈے استعمال کر کے آپ مجھے اس کام کے لئے راضی کر لیں گی۔میڈم میں آج کے دور کی لڑکی ہوں۔اپنے حق کے لئے مجھے لڑنا بھی آتا ہے۔اور ڈٹ کر لینا بھی۔اس کے لہجے میں غیض و غضب تھا۔میڈم نے بڑے تحمل سے اُسے دیکھا۔اور پُر سکون انداز میں کُرسی جھولتی رہیں۔

فرح کا دل چاہ رہا تھا۔اس کے چہرے پہ موجود اس مکرو مسکراہٹ کو نوچ ڈالے۔اور اس عورت کا وہ حال کر کے سارے ملک میں موجود اس جیسے کامپ اُٹھیں۔اور اپنی حرکتوں سے بعض آئیں۔

پاکستامیں موجود بہت عورتیں ایسی ہیں۔جو خود عورت ہو کر عورت کی دُشمن ہیں۔

ہمارا معاشرہ ایک اسلامی معاشرہ تو ہے۔ مگر محض نام کے طور پر۔ اسلام کی بیٹی، اسلام کی عورت تو تیر سے لے کر نیزے اور تلوار تک چلا لیا کرتی ہے۔ ڈرتی ہے اور نہ گھبراتی۔۔۔ اپنے لئے اپنے حسب کے لئے لڑتی ہے۔ ظالم کے سامنے جُھکنا اپنی توہین سمجھتی ہے۔ سر قلم کروا سکتی ہے۔ لیکن اگر کوئی کہے کہ جُھک جاؤ۔ تو منہ نوچ ڈالتی ہے۔

اور کیوں جُھکیں ظلم کے سامنے۔۔۔ جب ہمارا دین، ہمارا مذہب ہمیں حق لینا سکھاتا ہے۔ جب اللہ نے ہمیں عظیم بنایا تو پھر ہیں ہم عظیم۔ بس یہ کافی ہے۔۔۔

ہم م۔۔۔ آپ تقریر اچھی کرتی ہیں۔ مجھے یقین ہے۔ کہ آپ اپنے سکول کالج میں بہت اچھا بولتی ہوں گی۔ جواب موضوع سے بالکل ہٹ کر آیا تھا۔ فرح کا دماغ جل اُٹھا۔ اور ضبط جواب دینے لگا۔

میری بات سُنیں۔۔۔ وہ اس کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ اور ہاتھ میں پکڑے پوسٹر کو اس کی میز کی جانب اُچھال دیا۔

میں کوئی ایسا کام نہیں کروں گی۔ جس سے میرے ملک کی نوجوان نسل کو نقصان پہنچے۔ چاہے اس کے لئے مجھے کچھ بھی کرنا پڑے میں کروں گی۔ کوئی بھی قربانی دینی پڑے دوں گی۔ اس کے لہجے میں کاٹ تھی۔ فیصلہ کر کے ڈٹے رہنے کا عزم تھا۔

بہت اچھی بات ہے۔ آپ قائم رہیں اپنے فیصلے پر۔ لیکن ایک منٹ۔۔۔ وہ رُکیں اور سیدھی ہو بیٹھیں۔

میز پہ دھرا لیپ ٹوپ آن کیا۔

کیا آپ مجھے میرے کام کی داد دینا پسند کریں گی؟ مسکرا کر کہتے ہوئے۔ لیپ ٹوپ اس کی جانب گھمایا۔

فرح نے لیپ ٹوپ کی چمکتی سکرین کو دیکھا۔ اور گرنے سے بچنے کو ہاتھ قریب پڑی میز پہ رکھا۔

اس کا سارا عزم جیسے جھاگ کی طرح بیٹھنے لگا تھا۔ میڈم اب پھر کرسی پہ جھولتی اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ رہی تھی۔

کل تک سوچیں۔۔۔اگر تب بھی دل نہ مانے تو ایک دن اور لیں۔اور اگر تب بھی دل نہ مانے تو وہ کیجئے جو ہم آپ سے کہیں۔دل کی ہر بات مانی نہیں جاسکتی۔وہ کسی نے کیا کہا تھا۔کہ دل تو بچہ ہے۔اپنی ہی کہی گئی بات کے اختتام پہ وہ منہ پہ ہاتھ رکھ کر ہنستی چلی گئیں۔فرح کا ضبط جواب دیتا وہ کمرے سے نکل گئی۔وہ اس عورت کے سامنے بالکل نہیں گرنا چاہتی تھی۔

*

اس نے کمرے کا دروازہ بڑی شدید آواز کے ساتھ بند کیا۔اور بیڈ پہ بیٹھ کر دونوں ٹانگیں اکھٹی کرلیں۔اور بازوں سے اُنہیں گھیر لیا۔آنسو موتیوں کی صورت آنکھوں سے بہہ کر گال بھگو رہے تھے۔اس کے سسکنے کی آواز سارے کمرے میں گونج رہی تھی۔

کیسے بے حِس گھر والے ہیں۔کسی کو میرا خیال نہیں۔۔۔کسی کو میری پروا نہیں۔کہ میں کس حالت میں ادھر پڑی ہوں۔بے بسی کی حالت میں وہ وہ کر رہی تھی۔جو وہ کر سکتی تھی۔

اپنوں سے شکوے کے سوا اس کے پاس اور کوئی چارا نہیں تھا۔

::::::::::

ماہ نور سو تو نہیں گئی تھی؟

کمرے کی نیم تاریکی میں ننگے پاؤں قالین پہ چکر کاٹتے ابرار نے فون کان سے لگائے اپنی حالت سے مختلف بہت اطمینان سے پوچھا تھا۔

ماہ نور فون کان سے لگائے بال برش کرنے میں مصروف تھی۔کھلکھلائی۔۔۔

نہیں بھائی۔

اچھا۔۔۔مجھے لگا میں نے کال کرنے میں دیر کر دی۔اس نے تھک کر صوفے پہ بیٹھتے کہا۔

نہیں۔۔۔میں اور ذریت ابھی دادی جان کا چیک اَپ کروا کے آئے ہیں۔بس سونے والی تھی۔اچھا کیا آپ نے فون کر لیا۔اس نے بالوں میں برش پھیرنے کا کام ایک لمحے کو نہیں روکا تھا۔

ہم۔۔۔اب ذریت کی دادی ٹھیک ہیں؟وہ اصل بات کی طرف جانے کے لئے بے چین گھیریاں ڈال رہا تھا۔

جی۔۔۔بس سردی کی وجہ سے جوڑوں کا درد ہے۔آپ دُعا کریں اللہ اُن کو صحت عطا فرمائیں۔۔۔

آمین۔۔

ذریت نے فائل اُٹھاتے اس کے الفاظ سُنے تھے۔وہ فائل سٹڈی کرنے کو سٹڈی جا رہا تھا۔ماہ نور کے بولنے سے وہ ڈسٹرب ہو رہا تھا۔محترمہ نے آدھا گھنٹہ تو لگانا ہی تھا۔بہتر تھا کہ وہ اپنا کام کر لیتا۔

ماہ نور۔۔۔تمہاری دوست فرح کس ہوسٹل میں رہ رہی تھی؟ایک دم سے اس نے غیر متوقع سوال کیا تو ماہ نور ٹھٹکی۔ہاتھ میں چلتا برش اس نے روک کر ڈریسنگ ٹیبل سے آہستہ سے رکھا۔

وہ کیڈٹ کالج کے قریب کسی پراءویٹ ہوسٹل میں رہتی تھی۔کیوں آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟خیریت؟

اس کے اندر کے جاسوس نے انگڑائی لی تھی۔

ابرار نے بات بنائی۔ہاں بھئی!بھلا کیا بات ہونی۔بس ایک دوست نے پوچھا تھا۔اس کی بہن نے ہوسٹل شفٹ ہونا تھا۔اس لئے میں نے کہا کہ وہ زیادہ پریشان نہ ہو۔میں کوئی پتہ کر کے بتا دوں گا۔اس کی بہن امریکہ سے ادھر پڑھنے آرہی ہے۔عادت کے بالکل برخلاف خاصا گھڑا لمبا جواب دیا۔ماہ نور نے سمجھ کے سر ہلایا۔

پر۔۔۔لوگ تو وہاں پڑھنے جاتے ہیں۔اور وہ ادھر پڑھنے آرہی ہے۔عجیب بات ہے۔ایک نئی بات۔

پتہ نہیں۔۔۔شائد اس لئے کہ وہ اسے وہاں کے معاشرے سے باہر نکالنا چاہتے ہوں۔میں تو خیر سہی وجہ نہیں جانتا۔ویسے بھی ہمارے ملک کی تعلیم بھی کم اہمیت نہیں رکھتی۔ابرار آج ہر بات تفصیل سے کر رہا تھا۔ماہ نور کو بھائی کو سُننا اچھا لگ رہا تھا۔

For more visit (exponovels.com)

اچھا ماہ نور ہوسٹل کا نام تو تم نے بتایا ہی نہیں۔ماحول وغیرہ تو اچھا ہے ناں وہاں کا؟

بھائی فرح کی فیمل خاصی سخت ہے۔اُنہوں نے بہت دیکھ بھال کر اسے اس ہوسٹل میں داخل کروایا تھا۔اور اس روڈ پہ صرف ایک ہی تو ہوسٹل ہے۔اور ہے بھی روڈ پہ ہی۔نام مجھے ابھی یاد نہیں آرہا۔آپ کو آسانی سے مل جائے گا۔اس نے بولنے کے ساتھ موبائل کو کان کے اور کندے کے درمیان سیٹ کیا اور پھر بال باندھنے لگی۔

اچھا۔۔

تم سیٹل ہو گئی سہی سے؟

ہاں جی کوشش کر رہی ہوں۔اُداسی سے اس نے کہا تھا۔

میری گڑیا بہت بہادر ہے۔ سیٹل جلد ہو جائے گی۔ابرار نے سکون کا سانس لے کے سر صوفے سے ٹکاتے آنکھیں بند کرتے اسے کہا تھا۔ماہ نور نے معصومیت سے سر ہلادیا جیسے وہ دیکھ رہا ہو۔

بابر بھائی سے میری صبح بات ہوئی تھی۔بلکہ ان سے تو روز ہوتی ہے۔بول رہے تھے کہ آپ کی شادی کر دی جائے۔ایک دم سے ذہن میں آئے بابر کے ساتھ اس کی کہی گئی بات بھی ذہن میں آئی تو ماہ نور نے کہنے میں جھجک محسوس نہیں کی تھی۔وہ بہن تھی۔بھائی کی فکر اس کے سوا ادھر کس کو ہونی تھی۔

ابرار نے بند آنکھوں کے ساتھ مسکرا کر دل ہی دل میں بابر کو شاباش دی تھی۔

کیا بکواس کر رہا تھا وہ؟ لہجے میں مسکراہٹ کا انصر نمایاں تھا۔ماہ نور نے شدت سے محسوس کیا۔اس کا بھائی مسکرا رہا تھا ۔دنیا کا خوبصورت منظر ہو گا یقینا۔۔۔

بس یہی کہ لڑکی وہ آپ کے لئے دیکھیں گے۔کہ گھر پہ اُنہوں نے بھی رہنا ہے۔اور کہہ رہے تھے۔بھابھی میں اپنی پسند سے لاؤں گا اور ہم دونوں کو اس پہ کوئی عتراض نہیں ہونا چاہئے۔

میں نے کہا۔ کہ میں بھی ساتھ جاؤں گی۔ تو کہتے کہ جائیں گے تو ہم دونوں لیکن پسند ان کی ہو گی۔ ہنستے ہوئے وہ بتا رہی تھی۔ اور ابرار کی مسکراہٹ بھی ساتھ ساتھ گہری ہوتی جا رہی تھی۔

اچھا۔۔۔ تم دونوں مطلب مجھے قیدی بنانے کی کوشش میں ہو۔

جی بالکل۔۔۔ اب آپ کو بھی زنجیریں ڈال ہی دینا چاہئیں۔ ماہ نور نے ہنستے ہوئے بات کے اختتام پہ فُل سٹوپ ہی جیسے لگا کر ختم کی۔

دیکھتے ہیں گُڑیا۔

اچھا ابھی میں سونے لگا ہوں۔ تم بھی آرام کرو۔ اس نے کہا تھا۔

ماہ نور نے مسکرا کر اللہ حافظ بولا اور کال کاٹ دی۔

میرے ویر دا ویا۔۔۔

مینوں گوڈے گوڈے چا

:::::::::::::

دن بھر موبائل کی نگرانی کی مگر اختتام صفر رہا۔ ذریت کو گئے دو دن ہو چکے تھے۔ اور اس نے ایک بار بھی حال چال پوچھنے کی زحمت نہیں کی۔ اور ماہ نور کا دماغ جل کر خاک ہو چکا تھا۔ اور شائد جلد کانوں سے دھواں نکلنے لگتا۔

کس قسم کے خشک انسان سے رشتہ جوڑا ہے۔ منہ بنا کر سر جھٹک کر اس نے سامنے پڑی میز سے سرخ دُھلی گاجر اُٹھائی اور شلف سے پشت ٹکا کر دانتوں سے کاٹنے لگی۔ وہ اس وقت سیاہ اور نارنجی شلوار قمیض میں سر پہ اسی کی ہم رنگ چادر کو لئے ہوئے تھی۔ پاکستان میں اس وقت رات آٹھ بجے کا وقت تھا۔ اور ماہ نور ذریت اس وقت ذریت حسن کی کال کے تھکا دینے والے انتظار کے بعد اب فون چارجنگ پہ لگا کے کھانا بنانے کی غرض سے کیچن میں آ گئی تھی۔ جبکہ وہ پکانے سے زیادہ برتن پٹخ رہی تھی۔

دادی جان نے اسے بولا بھی تھا۔ کہ وہ ذریت کو کال خود کر لے۔ مگر ہائے رے یہ انا جو اگر نہ ہوتی تو کتنا سکون ہوتا۔ پر اب ناک کا مسّلہ تھا۔

اس نے کھانے کا دم ہٹا کر اندر چمچہ ہلایا اور ہاتھ نیپکن سے صاف کرتی لاءونج میں آ گئی۔ دادی جان ابھی کچھ دیر قبل عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر وہاں آئی تھیں۔ سردیوں میں دن چھوٹے ہونے کی وجہ سے عشاء کی اذان جلدی ہو جاتی ہے۔

اس نے لاوءنج میں آ کر دادی کے پہلو میں بیٹھتے سامنے پڑے ریموٹ کو اُٹھایا اور چینل بدلنے لگی۔ ماتھے پہ البتہ ناگواری کے بل متواتر تھے۔

دادی جان آنکھوں پہ نظر کا چشمہ جمائے سویٹر بُننے کا کام بھی سر انجام بھی دے رہی تھیں۔ اور اس کے اندر کے موسم کو پڑھ پڑھ کر بھی خوب محظوظ ہو رہی تھیں۔

بھابھی کوئی کام رہ گیا ہے تو مجھے بتا دیں۔ اپنے کوارٹر سے آ کر کیچن کی جانب جاتے ظفر نے پوچھا تو اس نے سر نفی میں ہلا دیا۔

بس جو برتن پھیلے ہیں پلیز ان کو اکٹھا کر دیں۔ آج پتہ نہیں کیوں کیچن صاف ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا۔ منہ بنا کر اس نے کہا۔ تو ظفر سر ہلا کر کیچن کی جانب بڑھ گیا۔

ماہ نور۔۔۔

جی۔۔۔؟ سامنے چلتے سکرین کے منظر کو دیکھتے اس نے دادی جان کو دیکھا۔

آپ نے کال نہیں کی؟ سویٹر بننے کا کام جاری و ساری تھا۔

ماہ نور نے گہرا سانس لے کر پاءوں صوفے پہ اکٹھے کر لئے۔

نہیں۔۔۔

کیوں؟

For more visit (exponovels.com)

وہ۔۔۔وہ میرا فون پتہ نہیں کیوں چارج نہیں ہو رہا تھا۔اس نے اٹک کر کہا۔دادی جان مسکرائیں۔

تو بیٹا دوسرے فون سے کر لیتیں۔

نمبر نہیں آتا تھا۔ہونٹ لٹکا کر جواب دیا۔اُنہوں نے ہاتھ روک کر ذرا سی نظر اُٹھا کر اسے دیکھا۔ماہ نور ماتھے پہ بل ڈالے ٹی وی دیکھ رہی تھی۔

بیٹا سامنے دراز میں جو ڈائری ہے ناں۔اس میں چیک کرو۔ ظفر اس میں نمبر نوٹ کرتا ہوتا ہے۔اور میرے موبائل میں بھی ذریت کا نمبر ہے۔جاؤ وہ لے آؤ۔

اس نالائق کو تو فُرست ہو گی نہیں۔ چلو ہم خود کر لیتے ہیں۔اپنی خوشی کے لئے ہم اتنا تو کر سکتے ہیں۔وہ اس کا گریز سمجھ رہی تھیں۔ تبھی سمجھانے والے انداز میں کہا۔اور اون اپنی گود میں رکھ کر آنکھوں سے چشمہ ہٹا کر ٹیبل پہ رکھ دیا۔سفید چادر کے ہالے میں ان کا شفیق چہرہ بہت بھلا معلوم ہو رہا تھا۔

ماہ نور نے ایک نظر اُنہیں دیکھا اور ٹانگیں سیدھی کر لیں۔

وہ۔۔۔ہم کھانے کے بعد کر لیں؟اب تو بس بن گیا۔خود فون کرنا۔۔۔بالکل بھی نہیں۔

وہ مسکرادیں۔ٹھیک۔۔۔۔ جیسے تمہاری مرضی۔پر کر ضرور لینا۔واپس اپنے کام کی طرف دھیان دیتے اُنہوں نے کہا تو وہ سر ہلا گئی۔

ابرار نے آنکھوں سے فریم لیس چشمہ ہٹا کر سڑک کے دوسری طرف فرح کو سنگی بینچ پہ بیٹھے دیکھا اور ٹشو باکس سے ٹشو نکال کر چشمہ صاف کیا۔بیس منٹ سے وہ وہاں اسے بیٹھا دیکھ رہا تھا۔جو مسلسل محض اپنے ہاتھوں کی دونوں ہتھیلیاں دیکھنے میں مصروف تھی۔اور ابرار اس کشم کش میں اُلجھا بیٹھا تھا۔کہ آیا کہ اس کے پاس جائے یا نہ۔۔۔یا بس بیٹھ کر دیکھنے پہ ہی اکتاف کرے۔

وہ کسی بھی صورت وہ کام نہیں کرے گی جو میڈم اس کو بول رہی تھی۔ یہ بات تو پتھر پر لکیر تھی۔ پر اس کام سے بچنے کا کوئی حل نہیں تھا جو سمجھ میں آتا ہو۔ پشاور جاتی تو شائد گھر والے پھر کاشف کے ساتھ دو بول پڑھوا کر چلتا کرتے۔ اور کراچی جانا ممکن نہیں تھا۔ کہ پھوپو دو دن پہلے ہی عمرے کے لئے گئی تھیں۔ اور وہ ویسے بھی ان کے گھر کا پتہ نہیں جانتی تھی۔

پریشانی تو مجھ سے آ کر ایسے ملتی ہے۔ جیسے میری سگھی بہن ہو۔

کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں۔ جو جتنا بھی اچھا سوچ لیں۔ انجام پہ پھر خالی ہاتھ رہتے ہیں۔ اس کا بھی حال اس وقت یہی تھا۔ ایک جگہ سے نکلتی تو دوسری جگہ پھنس جاتی تھی۔ زندگی اور اس کا حال چوہے بلی والا تھا۔ وہ سوچ کر آپ ہی آپ مسکرا دی۔ اور تنفر سے سر جھٹکا۔

کیا تھا اللہ جی اگر میں۔۔۔ کسی ایسے گھر میں پیدا ہو جاتی۔ جہاں میرے والدین کم از کم میری بات تو سُنتے ہوتے۔ اُنہیں مجھ پہ یقین ہوتا تو شائد مجھے اس طرح در در دھکے نہ کھانے پڑتے۔ ضبط سے ہونٹ کاٹتے اس نے سوچا تھا۔

ابرا کو حیرت تھی کہ وہ ایسا کیا سوچ رہی تھی۔ کہ اپنے ارد گرد سے بالکل بے گانہ تھی۔ کوئی حوش ہی نہیں تھا۔

والدین اگر ضرورت سے زیادہ زور، زبردستی یا رعب دیکھانے کی بجائے بچوں سے دوستی والے ماحول کو بنائے رکھیں تو حالات زیادہ بہتر ہوتے ہیں۔ اکثر لوگ سمجھتے ہیں۔ کہ اگر بچوں پہ ڈنڈا رکھا جائے تبھی وہ سیدھے رہتے ہیں۔ جبکہ یہ غلط ہے۔

فرح نے دونوں آنکھیں پٹپٹا کر آنسو اندر اُتارے اور بنچ سے اُٹھ کر پیدل ہوسٹل کی جانب چلنے لگی۔ ابرار نے بھی کار سٹارٹ کر دی۔

اس کی حالت دیکھ کر تو وہ اندازہ لگا ہی چکا تھا۔ کہ یقیناً وہ پریشان تھی۔ اب بس اسے اس سے جاننا تھا۔ فرح کو مشکل میں دیکھنا اس کے لئے ممکن نہیں تھا۔

فرح اپنی سوچوں میں غلطاں چلی جا رہی تھی۔ جب ایک کار نے اس کی پشت پہ اس قدر زور سے ہارن دیا کہ وہ دہلا کر مڑی تھی۔

اس کے ڈر کر اور اچھل کر مڑ کر دیکھنے پہ وہ حیران ہوا تھا۔ وہ کیا سوچ رہی تھی۔ کہ اسے پتہ بھی نہ چلا کہ وہ مسلسل اس کے پیچھے آ رہا ہے۔

فرح کا سانس اندر ہی اٹک گیا جب اس کی نظر ابرار پہ پڑی۔۔۔ اسے ابرار کو پہچاننے میں محض لمحے لگے تھے۔ اور اسے لگا اس کی ٹانگیں وزن چھوڑ دیں گی۔ یہ شائد شاک تھا۔ جو ابرار کو دیکھ کر لگا تھا۔

اس سے پہلے کہ وہ گرتی ابرار نے بازو سے پکڑ کر اسے سہارا دے دیا۔ اور پریشانی اور فکر کے ملے جلے جزبات کے ساتھ اس کو لئے گاڑی کا دروازہ کھولتا۔ اسے بیٹھا کر اپنی سیٹ کی جانب بڑھا۔

اس نے گاڑی سٹارٹ کر کے ڈری اور حیران پریشان سی فرح کو دیکھا۔ اور ماحول کو نارمل بنانے کو مسکرا بھی دیا۔

میں ادھر سے گزر رہا تھا۔ جب آپ ایک دم سے فٹ پاتھ سے سیدھا میری گاڑی کے سامنے آ گئیں۔ اس کو حیران دیکھ کر اس نے سچ جھوٹ ملا کر کہا۔ فرح جو کھڑکی کے ساتھ پشت ٹکائے حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی مڑی۔۔۔ اور سیدھی ہو بیٹھی۔

جی وہ میں بس۔ اسے سمجھ نہیں آئی کیا کہے۔ سو جملہ بیچ میں ہی چھوڑ کر باہر دیکھنے لگی۔

آپ ادھر؟

میرا مطلب ہے۔ کہ ماہ نور جانتی ہے۔ کہ آپ ادھر ہیں؟ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ کہ کیسے اپنے مطلب کی بات پوچھے۔

میرا ہوسٹل یہاں پاس ہی ہے روک دیں۔ اس نے جواب دینے نے بجائے گاڑی روک دینے کو کہا تو ابرار نے ناسمجھی سے اسے دیکھتے گاڑی روک دی۔

مجھے اُمید ہے۔ کہ آپ ماہ نور کو میری موجودگی کا نہیں بتائیں گے۔ اس عجیب سی ملاقات میں اختتامیہ کلمات یہ تھے۔ ابرار بس حیرت سے اسے جاتا دیکھتا ہی رہا۔ جس ملاقات کا سوچ کر وہ رات سے سکون کی نیند سو نہیں پایا تھا۔ وہ گزر بھی چکی تھی۔ اور اس کی سوچ سے کہیں زیادہ مختصر تھی۔

\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-

ماہ نور نے کمرے میں آتے ہی وضو کیا اور نماز پڑھنے کھڑی ہو گئ۔ ابھی وہ دوسری رکعت پہ ہی تھی جب موبائل بجا۔ کان کھڑے ضرور ہوئے۔ پر اس وقت وہ اللہ کے سامنے کھڑی گفتو شنید میں مصروف تھی۔ سو پڑھتی رہی۔ یوں موبائل اس کی نماز کے دوران بجتا رہا پر اس نے نماز مکمل کر کے ہی اُٹھایا۔۔۔

نماز اس نے آدھے گھنٹے میں مکمل کی اور اس عرصے میں ذریت کا پارا ساتویں آسمان کو چھو چکا تھا۔

اس کے فون اُٹھاتے ہی پھٹ پڑا۔

فوں کہاں چُھپا کے رکھا تھا۔ دو گھنٹوں سے کال کر رہا ہوں اور کوئی جواب ہی نہیں۔ ہوٹل کے کمرے میں اس کی جھنجھلائی ہوئی آواز گونجی۔ ماہ نور نے ناگواری سے فون کان سے ہٹا کر سکرین کو دیکھا۔

اوہ۔۔۔ تو آپ کو یاد تھا۔ کہ گھر بھی فون کرنا ہے۔ جل کر اس نے کہا۔

ہاں تھا تبھی کیا ناں۔ اس کا موڈ سخت آف معلوم ہوتا تھا۔ ماہ نور کو مزہ آیا۔

آہاں۔۔۔ کیا ہو گا۔ پر میں مصروف تھی۔ تبھی یاد نہیں رہا آپ کا۔ لفظ آپ کا اس نے جانبوجھ کے بولا تھا۔ ذریت دانت کچکچا کر رہ گیا۔

ہاں میرے سے اہم ایل وسی کی لڑائی ہے جو تم لڑ رہی تھی۔ ٹھیک ہے سمجھ گیا۔ تم اچھا کر رہی ہو۔ پاک بھارت لڑائی میں اگر تم کام بھی آجاوگی تو میرا بھلا ہی ہو گا۔ ضبط سے اس کے منہ میں جو آیا اس نے کہہ دیا تھا۔ ماہ نور نے منہ بنا کر سر سے چادر ہٹائی اور شیشے کے سامنے کھڑی ہو کر بالوں کو کیچر سے آزاد کر کے سہلانے لگی۔

عورتیں ایل وسی پہ نہیں جاتیں۔اپنی طرف سے طنز کیا۔

باقی نہیں جاتیں پر تم جاتی ہو۔اس نے خوب جل کر کہا تھا۔

اچھا ابھی مجھے نیند آرہی ہے۔اگر کوئی کام ہے۔تو بتائیں۔۔۔

نہیں کچھ نہیں۔اسے لگا تھا وہ اس کو یاد کر کر کے ہلکان ہو رہی ہو گی۔پر وہاں اس قدر سنجیدہ اور بے فکر انداز دیکھ کر ذریت کو سخت مایوسی ہوئی تھی۔

دادی جان آپ کو یاد کر رہی تھیں فارغ ہو کر اُنہیں کال کر لیں۔بالوں میں برش کوتے اس نے کہا تھا۔

ٹھیک۔۔۔کر لوں گا۔اور کچھ ؟منہ بنا کر پوچھا۔

اور کچھ نہیں۔۔۔مجھے سخت تھکاوٹ ہو رہی ہے۔میں سونے جا رہی ہوں۔کہہ کر اس نے چڑانے کو جمائی بھی لی۔

ہاں۔۔۔ٹھیک ہے کرو تم نیند پوری۔کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔

اب لگا ناں بُرا۔۔۔فون رکھ کر اس نے مسکراتے برش بالوں میں چلاتے خوب محظوظ ہو کر خود سے کہا تھا۔

سردی اور دُھند ایک ساتھ ہوسٹل کی عمارت پہ آپڑی تھیں۔اور اندر موجود نفوس کپکپا اُٹھے تھے۔فرح اس وقت ہوسٹل کی چھت پہ بیٹھی چڑیہ کے بچوں کو چاول کے دانے ڈال رہی تھی۔جو اس نے باورچن سے لئے تھے۔وہ دونوں کل ہوا سے ہوسٹل کی چھت پہ آگرے تھے۔چڑیہ ساتھ نہیں تھی۔بے کسوں کو مولا سہارا دے ہی دیتا ہے۔

فرح نے ہاتھ کی ہتھیلی پہ چاول کو دانا رکھ کر ننھے چڑیہ کے بچے کے سامنے کیا تو اس نے ایک دو بار اپنی ننھی آنکھوں سے دیکھا اور چونچ میں چاول کا دانا ڈال کر منہ آسمان کی جانب کیا اور کھانے لگا۔اسے لگا جیسے وہ آسمان کی طرف دیکھ کر اس کے لئے دعا کر رہا ہو۔فرح کو لگا جیسے اس کی دعا اللہ ضرور سُن رہے ہوں۔

اچھی بات ہے کریں نیکی۔اللہ آپ کے پیچھلے گناہ معاف کریں۔ مسکرا کراس کے پہلو میں کھڑے ہو کر میڈم نے کہا تھا۔وہ جو اپنے کام میں مگن مسکرا کر ننھے چڑیہ کے بچوں کو دیکھ رہی تھی۔دہل کر مڑی۔۔۔اس کے ڈرنے پہ میڈم نے قہقہ لگایا۔فرح کو اگر کسی کے ہنسنے سے شدید مفرت تھی تو وہ میڈم تھی۔وہ مڑ کر واپس نیچے جانے والی تھی۔جب میڈم نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

ہمارے کام میں کامیابی ان کی قسمت میں لکھی جاتی ہے۔جو نڈر ہوں۔اگر چاہتی ہو کہ تمہارا نام بنے۔تو اپنے اندر سے ڈر ختم کر دو۔بات کو بغیر کسی تاثر کے کہہ کر اختتام پہ اس نے اس کا گال تھپ تھپایا۔فرح کے ماتھے پہ ناگواری کے بل گہرے ہوئے اس نے جھٹکے سے اپنا بازو اس کے ہاتھ سے آزاد کروایا۔

نڈر تو ہر کام کو کرنے سے پہلے ہونا پڑتا ہے۔ہاتھی کو گرانے کے لئے جب تک چونٹی نڈر ہو کر نہیں آگے بڑھے گی۔تب تک بڑے مقصد کے حصول کو نہیں پا سکے گی۔اب کی بار وہ مسکرائی تھی۔میڈم کے چہرے کی بھی مسکراہٹ گہری ہوئی۔

آپ کا بولنے کا انداز بہت لاجواب ہے۔کیا کبھی کسی نے بتایا آپ کو۔۔۔دل جلانے والی مسکراہٹ۔

چاپلوسی کی خواہش آپ جیسوں کو ہوتی ہے میڈم۔میرے جیسے تو سادھو لوگ ہوتے ہیں۔اس نے بھی اُدھار رکھنا ضروری نہیں سمجھا تھا۔کہہ کر تیزی سے سیڑھیوں کی جانب بڑھی۔

اچھی بات ہے۔۔۔رات میں ضیا صاحب آرہے ہیں۔آپ سے آپ کا جواب لینے۔تب تک سوچ لیں۔اس کو جاتا دیکھ کر میڈم نے کہا تھا۔فرح کے قدموں میں تیزی آگئی۔

آپ بس ادھر رُکیں میں بیس منٹ میں آرہی ہوں۔وہ ابھی ابھی مین مارکٹ تک پہنچی تھی۔اسے گھر کے لئے کچھ ضروری چیزیں لینی تھیں۔اور کیاریوں میں لگانے کو کچھ پھولوں کے بیج لینے تھے۔دادی کو بتا کر وہ ابھی آئی تھی۔

اس نے نرسری سے بیج لئے اور وہاں سے کراکری سٹور پہ آگئی۔۔۔

ابھی اس نے کچھ برتن نکلوائے تھے۔ جب اسے اپنی پشت پہ کسی کی آواز آئی۔ اور وہ تعجب سے مڑی۔

مسسز ذریت۔۔۔۔ یہ الفاظ کوئی پہلی بار اس کے لئے استعمال کر رہا تھا۔ اس نے مڑ کر پیچھے دیکھا تو وہاں ایک الٹراماڈرن سی لڑکی مسکراتی نظر آئی۔ ماہ نور اسے پہچان نہیں پائی تھی۔

جی؟

کیسی ہیں؟ لڑکی نے ہاتھ ملانے کو اپنا نازک سا مخروطی ہاتھ اس کی جانب بڑھایا تو ماہ نور نے تھام کر مسکرا کر محض سر ہلانے پہ اکتاف کیا۔

اس کا ہاتھ اتنا نازک تھا۔ ماہ نور کو کاغز کا بنا ہی معلوم ہوا۔

گھر کے لئے شاپنگ کر رہی ہیں؟ برتنوں کی طرف اشارہ کر کے اس نے دوستانہ انداز میں پوچھا۔ تو ماہ نور نے سر ہلا دیا۔

جی۔۔۔

سوری میں نے پہچانا نہیں آپ کو۔ آخر اس نے اس خوبصورت سی نازک سی ہری آنکھوں والی لڑکی سے پوچھ ہی لیا۔ جس کی چہرے کی جلد ایسے چمک رہی تھی۔ جیسے پرل ہوں۔

میں مسسز نتاشا۔۔۔ آپ کے ہزبنڈ کی ایکس گرل فرنڈ۔ کہہ کر اس نے ایک بے ہنگم سا قہقہہ لگایا اور ماہ نور کو لگا جیسے لڑکی کا دماغ چل گیا ہو۔ اس نے اب کی بار ناگواری اور نا سمجھی سے اسے دیکھا تھا۔

عجیب لگا ناں۔۔۔۔ ویسے مشرقی عورتوں کے ساتھ یہی حال ہوتا ہے۔ جب وہ ایسی بات سُنتی ہیں۔ جیسے ابھی آپ کی ہوئی۔ ویسے کہاں ہیں ابھی مسٹر ذریت۔ میں آپ سے ملنے آپ کے گھر ضرور آءوں گی۔ اپنے سویٹ ہبی کو بتائے گا۔ اس کے چہرے پہ پھیلتے تاثر کو دیکھ کر نتاشا خوب محظوظ ہوئی تھی۔ اس لئے آگے کہہ کر اس نے اپنے قیمتی ہینڈ بیگ میں ہاتھ ڈال کر حیران پریشان سی ماہ نور کو ایک خاکی لفافہ تھمایا۔ اور مڑنے سے پہلے بڑے انداز میں اس کی گال کو بوسہ لیا۔

یہ دیکھ لیجئے گا۔ یہ میں نے آپ کے لئے رکھا تھا۔ آپ کے گھر بھیج دیتی مگر آج آپ نظر آئیں تو سوچا آپ کو یہیں دے دوں۔

ویسے ذریت کا پرفیوم بہت اچھا ہے۔ اب بھی وہی یوز کر رہا ہے۔؟ نہ جانے وہ کیا جتانا چاہ رہی تھی۔ ماہ نور کے ماتھے پہ ناگواری کے بل کچھ اور گہرے ہوئے۔ آنکھوں میں ناپسندیدگی بھی ابھری۔ نتاشا مگر وہاں اس کے چہرے کے تاثرات پڑھنے نہیں رکی تھی۔ لفافہ دے کر تیزی سے واپس مڑ گئی۔

ماہ نور نے ایک نظر اسے جاتے دیکھا اور تنے ہوئے ابرو کے ساتھ لفافہ ہینڈ بیگ میں رکھ لیا۔ اس کے بعد اسے اپنے ہاتھ پہ ایک انجانہ سا بوجھ ہی محسوس ہوتا رہا۔ کچھ ضروری چیزیں بہت بے دلی سے لے کر وہ واپس آ گئی۔

\---------------

فرح نے سکول سے ریزائن دے دیا تھا۔ اور اب ہر روز صبح گھنٹہ گھنٹہ اسی سنگی بینچ پہ آ کر سوچتی رہتی۔ زندگی کو ہر طرح سے بچانے کی کوشش میں تنہا ہلکان۔۔۔۔ رات اس نے سوچا تھا۔ کہ چپ کر کے پشاور واپس لوٹ جائے۔ لاہور اس کی قسمت میں نہیں ہے۔ یہاں کی تیز زندگی اسے راس نہیں آئے گی۔ مگر پھر بلیک میلنگ کے خوف اور کاشف کی موجودگی کے ڈر سے وہ اگلا قدم نہیں اُٹھا پا رہی تھی۔

کہیں نہ کہیں ابرار کی موجودگی کا احساس بھی اسے تھا۔ جس طرح پچھلی بار اس نے اسے بچایا تھا۔ اب کی بار بھی بچا لیتا اسے یقین تھا۔ مگر وہ اس کے سامنے شرمندہ نہیں ہونا چاہتی تھی۔ ماہ نور اس کے بارے میں کیا سوچتی۔

ابرار کے بارے میں ماہ نور کی شادی سے پہلے اس نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ ابرار ابتسام کے بارے میں مختصر وہ ماہ نور سے سُنتی رہتی تھی۔ مگر کبھی ایسا کچھ دلچسپ نہیں لگا تھا۔ سوائے اس کے کہ ابرار ماہرِ نفسیات تھا۔ جسے انسان کی نفسیات پڑھنے میں دلچسپی تھی۔ اس کے آگے بس فُل سٹوپ تھا۔۔۔

اس نے اس کے بارے میں دلچسپی تب لی جب اس نے ابرار کو ماہ نور کی شادی پہ نوٹ کیا۔ وہ ایک سنجیدہ اور بُردبار شخصیت کا حامل مرد تھا۔ ذمہ داری اُٹھانے والا۔ گھر والوں کے لئے ایثار کا جزبہ رکھنے والا۔ محض گھر والوں کے لئے

For more visit (exponovels.com)

نہیں۔ تمام جانداروں کے لئے۔اسے یاد تھا۔کہ کس طرح ماہ نور کی شادی پہ اس نے اسے لان کی کیئر کرتے دیکھا تھا۔ہر چیز کو سمبھال کے رکھناوہ بہت بہتر انداز میں جانتا تھا۔اور جس کی آنکھوں پہ فریم لیس چشمہ اسے بہت جچتا تھا۔اس نے اسے اس وقت نوٹس کیاجب اس نے فرح کواحساس دلایا کہ وہ اس کے لئے کھڑاہو سکتا ہے۔جب اس نے اس کی مدد کی۔لڑکیوں کو ہمیشہ وہی مرد پسند آتے ہیں۔جوان کی عزت اور کیئر کرتے ہیں۔محبت بھی ہو ہی جاتی ہے۔مگر عزت اور کیئر کرنے والاملناخوش قسمتی کی علامت ہے۔

\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-

ماہ نور نے گھر میں داخل ہوتے ہی۔دادی جان کو سلام کیا۔اور تیزی سے اپنے کمرے کی جانب آگئ۔اس کادل تیزی سے دھڑک رہاتھا۔ذریت کے بارے میں پہلی بار وہ کچھ ایساسُن رہی تھی۔جواس کوامتحان میں ڈال سکتا تھا۔

ابھی ابھی توان کارشتہ ڈھنگ سے بننے لگا تھا۔ایک عام میاں بیوی کی طرح اُنہوں نے ایک دوسرے کاخیال رکھنے کاسوچا تھا۔کہ ایسے میں نتاشاواپس آگئی۔۔۔

ماہ نور نے کمرے میں آتے ہی۔۔لاءٹ آن کی اور سر سے سکارف نوچ کے اُتارااور دور صوفے پہ اُچھال کر پاءوں بند جوتوں سے آزاد کئے اور بیڈ پہ دھرے بلینکٹ میں گھس کر تیزی سے لفافہ ہینڈ بیگ سے نکالا۔

لفافہ کھولتے ہی۔۔ماہ نور کے سامنے بہت سی تصویریں اور کچھ ریکاڈنگز نکل کراس کی جھولی میں آگری تھیں۔

اوپر نیچے پڑی تصویریں تعداد میں ایک سو کے قریب تھیں۔

ماہ نور کولگااس کادل بند ہورہاہو۔

جس پہلی تصویر کواس نے اُٹھایا۔۔اس میں ذریت اور نتاشادونوں ہی تھے۔نتاشاکاچہرہ واضح جب کے ذریت کاچہرہ آدھاجھکاہواتھا۔وہ دونوں کسی پارک میں بیٹھے تھے۔نتاشاکاسر ذریت کے کندھے پہ تھا۔وہ شائد رو رہی تھی۔اور ذریت اسے دلاسہ دینے کواس کی کمر سہلارہاتھا۔ماہ نور کادل ٹوٹا۔اس نے تصویر واپس اسی لفافے میں ڈال کر اگلی تصویر اُٹھائی۔اب کی بار تصویر ایک سیلفی تھی۔جسے نتاشانے ڈیویلپ کروایا تھا۔

For more visit (exponovels.com)

سیلفی میں ذریت نتاشا کو دیکھ کر ہنس رہا تھا۔ جبکہ نتاشا اس کا دائیاں گال کھینچ رہی تھی۔ ماہ نور نے وہ تصویر بھی واپس رکھ دی۔ اس سے اگلی تصویر ایک ہوٹل کی تھی۔ جس میں وہ دونوں بیٹھے کافی پی رہے تھے۔ ذریت کی پشت تھی۔ مگر ماہ نور اسے پہچانتی تھی۔ اپنے مرد کو تو عورت ہزاروں میں پہچان جاتی ہے۔ ماہ نور نے وہ تصویر بھی رکھ دی۔ بلاشبہ یہ تمام تصویروں میں بیشتر وہ تھیں۔ جو ذریت نے اکمل کے ہاتھ اسفند کو بھیجوائی تھیں۔ نتاشا نے وہ سب اس کے ہی خلاف استعمال کی تھیں۔ ماہ نور نے تمام تصویریں واپس اسی لفافے میں ڈالیں۔ اور اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اسے دکھ تھا شدید دکھ۔۔۔ اس نے شادی کرنے میں غلطی کی تھی۔

اس نے ریکاڈنگ سُننا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ جو کچھ نتاشا اسے جتانا چاہتی تھی۔ ماہ نور وہ سمجھ چکی تھی۔ وہ یہی تو جتانا چاہتی تھی۔ کہ ماہ نور اس کی زندگی میں ایک انچاہی لڑکی تھی۔ جب کہ محبت تو وہ نتاشا سے کرتا تھا۔ ماہ نور کو بھی یہی محسوس ہوا جیسے وہ اس کی زندگی میں ایک بوجھ بنا کر شامل کی گئی تھی۔ حالانکہ وہ گھر سے بھاگ کر آئی تھی۔ اور نہ ہی کوئی قابل ترس آپاہج لڑکی تھی۔ جس کو رشتوں کی کمی ہوتی۔

اگر وہ ان پڑھ جاہل گوار ہوتی۔ تو بھی وہ کبھی بوجھ نہ ہوتی۔ مگر اب کہ وہ ان پڑھ جاہل یا گوار نہیں تھی۔ وہ خوبصورت بھی تھی۔ عقل شعور بھی رکھتی تھی۔ پہننا اوڑھنا بھی جانتی تھی۔ تعلیم بھی حاصل کی تھی۔ مگر پھر بھی اسے اس لمحے اپنا آپ ایک بوجھ معلوم ہوا۔

وہ لفافے سمیت کمرے سے نکل کر دادی جان کے کمرے میں آ گئ۔ وہ یہ سب اُنہی سے شئیر کر سکتی تھی۔

اسنے دھیمی آواز میں دروازے پہ دستک دی۔ اور دادی جان کو تسبیح پڑھتے اور اپنی جانب اشارہ کر کے آنے کی اجازت دیتے دیکھ کر وہ اندر کی جانب بڑھ گئی۔ اس نے ان کے بائیں جانب گھوم کر بیڈ پہ اپنے لئے جگہ بنائی اور ان کی گود میں سر رکھ لیا۔ دادی جان نے اس کا پریشان چہرہ دیکھ لیا تھا۔ وہ اس سے پوچھنے والی تھیں جب ماہ نور نے روتے ہوئے ان کے سامنے خاکی لفافہ کر دیا۔

ماہ نور کو روتا دیکھ کر ان کے ہاتھ پاءوں پھول گئے تھے۔ اُنھوں نے ناسمجھی سے بے آواز روتی ماہ نور کے ہاتھ سے لفافہ پکڑا اور سائڈ ٹیبل سے اپنا چشمہ اُٹھا کر آنکھوں پہ رکھ لیا۔ چشمہ لگا کر لفافے سے نکلنے والی ہر تصویر کو اُنھوں نے بہت غور

سے دیکھا تھا۔ماہ نور نے اپنی اور نتاشا کی ملاقات بھی بتادی تھی۔اور اُنہیں افسوس ہوا تھا۔ذریت نے دھوکہ دیا اس بات پہ اُنہیں یقین نہیں تھا۔مگر ایک لڑکی کسی دوسرے کا گھر خراب کرنے کو اس قدر گر جائے گی۔اس بات کا اُنہیں دکھ تھا۔اُنہوں نے تمام تصویریں دیکھنے کے بعد لفافہ بند کر کے ساءڈ ٹیبل کی دراز میں رکھا۔اور ماہ نور کے سر پہ ہاتھ رکھ کر ہونٹ کے بالوں پہ رکھ کر بوسہ لیا۔اُنہیں نتاشا بالکل یاد نہیں تھی۔

دادی جان اب میں کیا کروں ؟روئی روئی آواز میں اس نے اُن سے پوچھا تھا۔

اُنہوں نے گہرہ سانس لے کر اپنے اندر کی بے چینی کم کرنے کی کوشش کی۔۔۔

بیٹا مجھے اپنے پوتے پہ یقین ہے۔میں نے اس کی تربیت کی ہے۔میں اس کے انگ انگ سے واقف ہوں۔لیکن میں تم سے کہوں گی۔کہ تم اپنے دل اور عقل دونوں کو استعمال کر کے فیصلہ کرو۔کہ تمہارے خیال میں ذریت کو تم سے محبت نہیں ہے ؟

کیا وہ تمہاری بجائے کسی اور کو چاہتا ہے ؟

کیا اسے تمہاری پروا نہیں ہے۔؟نرمی سے بولتے ہوئے وہ ماہ نور کو سمجھا رہی تھیں۔اور ماہ نور کے رونے میں شدت آتی جا رہی تھی۔

دادی جان میں گھر جانا چاہتی ہوں۔رات کھانے کی میز پہ بیٹھتے اس نے کہا تھا۔

دادی جان نے سر ہلا دیا۔

چلی جاءو۔بہتر ہے۔۔۔

لیکن بچے فیصلہ عقل مندی اور دور اندیشی سے کرنا۔رشتے آسانی سے جوڑے جاتے ہیں اور نہ توڑے۔اُنہوں نے سمجھداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے فیصلہ کرنے دیا تھا۔تاکہ وہ خود سوچے اور دور اندیشی سے فیصلہ کرے۔

For more visit (exponovels.com)

ماہ نور نے جواب میں سر ہلا دیا۔ مگر اس نے یہ نہیں بتایا۔ کہ وہ فیصلہ کر چکی ہے۔

کیا وہ ایک ایسے مرد کے ساتھ رہ سکتی تھی۔ جس نے اس کے عتبار کی دھجیاں بکھیر دی تھیں۔ تو جواب تھا نہیں۔۔۔۔۔

کمرے میں آکر ماہ نور نے مختصر اًسامان باندھا اور بابر کو فون کر کے آنے کا بول کر خود حولیہ درست کرنے کو باتھ روم میں گھس گئ۔

لیمن اور سبز رنگ کھدر کے شلوار قمیض پہ سیاہ جیکٹ پہن کر اس نے سر اور شانوں کو سوٹ کی ہم رنگ چادر سے ڈھکا اور کوٹ شوز پہن کر ملازم کو بلا کر سامان لے کر باہر آ گئ۔

دادی جان لاءونج میں بیٹھی تھیں۔ اس کے آنے پہ اُٹھ کر کھڑی ہوئیں۔

جا کر مجھے وہاں کے حالات سے ضرور آگاہ کرنا۔ اور عقل مندی سے حالات کا جائزہ لینا۔ نرمی سے کہتے وہ اس کا شانہ سہلا رہی تھیں۔ ماہ نور نے سر ہلا دیا۔

کچھ دیر تک ماہ نور وہاں کھڑی ظفر کو تاکید کرتی رہی۔ اور جب بابر آیا تو دادی جان سے گلے مل کر تیزی سے باہر نکل گئ۔ ملازم سامان لے جا چکا تھا۔

بابر کے چہرے پہ پریشانی کے تاثرات گہرے تھے۔

وہ ٹھیک تو ہے؟ انجانے خوف سے سہم کر اس نے پوچھا۔

بابر نے جواب میں سر نفی میں ہلا دیا۔ ابرار بھائی اس وقت کافی پریشان ہیں۔ وہ اُنہں اندر آنے کا بول رہے تھے۔ لیکن وہ سردی میں لان میں ہی بیٹھی ہوئی ہیں۔ میں گھر سے باہر تھا۔ صورتحال کا پتہ چلا تو تمہیں کال کر دی۔ گاڑی کا سٹئرنگ ویل گھوماتے اس نے تفصیل سے جواب دیا۔ اور ایک اچٹتی سی نگاہ ماہ نور پہ بھی ڈالی۔

وہ چہرے سے کافی پریشان نظر آرہی تھی۔ اسے اس کی وجہ فرح ہی لگی۔

تم نے دادی جان کو آنے کی وجہ بتادی تھی ؟کسی خیال کے تحت اس نے ماہ نور سے پوچھا۔ماہ نور درود پاک پڑھنے میں مصروف تھی۔ محض سر ہلا کر جواب دیا۔

اُنہوں نے جواب میں کیا کہا؟

کچھ نہیں۔۔۔بس یہی کہ پہنچتے ہی کال کروں۔اس نے رک کر جواب دیا۔اور پھر سے ورد کرنے لگی۔بابر اب کی بار خاموشی سے کار چلانے لگا۔

گاڑی گیٹ کے سامنے کچھ ہی دیر بعد ہارن دے رہی تھی۔گاڑی کا ہارن سُن کر گارڈ نے گیٹ وا کر دیا۔اور بابر گاڑی اندر گیراج تک لے آیا۔ماہ نور بڑی بے تابی سے گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکلی تھی۔

سیاہ آسمان پہ سفید دُھند کی لپیٹ شدید گہری تھی۔جو لان میں لگی روشنیوں میں بہت نمایاں تھی۔

ماہ نور کو وہ ایک لائٹ پول کے نیچے سکڑی سمٹی بیٹھی نظر آئی۔ماہ نور نے اس تک کا سفر بھاگ کر طے کیا تھا۔

بھاگنے کی آواز۔۔۔قدموں کی تیزی سُن کر فرح نے گھٹنوں سے سر اُٹھایا۔ماہ نور حیرت اور پریشانی کے ملے جُلے تاثرات لئے اسے دیکھ تھی۔

ماہا۔۔۔ایک سسکاری کے ساتھ اس کے منہ سے ماہ نور کا نام ادا ہوا۔اور سردی میں اکڑی ٹانگوں کو گھسیٹتے وہ اُٹھ کر اس کے کندھے سے جا لگی تھی۔اور بہت سے بے آواز آنسو اس کی آنکھوں سے بہہ کر ماہ نور کی جیکٹ پہ پھیل گئے۔اسی طرح ماہ نور کی آنکھ کا ہر ہر آنسو فرح کی چادر کو بھگوتا چلا گیا۔

ابرار جو اندر سے فرح کے لئے گرم کافی اور چوکلیٹ لا رہا تھا۔ماہ نور کو وہاں دیکھ کر ٹھٹکا تھا۔

لیکن پھر گیراج میں گاڑی سے پشت ٹکائے پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے کھڑے بابر کو دیکھ کر سمجھ گیا۔کہ ماہ نور کو وہی لایا ہے۔

اُستاد تمہارا ساتھ تو قسمت دے رہی ہے۔آگی ئندا ب بس وہی سمبھالے گی۔ کہہ کر اس نے اس کے بائیں ہاتھ سے کافی کا مگ پکڑا اور آنکھ سے اشارہ کرتا آگے بڑھ گیا۔وہ کافی کا مگ ابرار اپنے لئے لا یا تھا۔

ابرار اس کے اس بے باک تبصرے پہ دھیمہ سا مسکرایا اور ماہ نور اور فرح کی جانب بڑھا جو رونے کا کام بڑی دلجمعی سے کرنے میں مصروف تھیں۔

لیڈیز۔۔۔ باقی رونا دھونا بعد میں۔۔۔ پہلے یہ کافی لے لو۔ٹرے رکھتے اسنے کہا۔تو اس کی موجودگی پا کر فرح تیزی سے سیدھی ہو کھڑی ہوئی تھی۔ جبکہ ماہ نور نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اندر کی جانب قدم بڑھا دئے۔

وہ اندر اس لئے نہیں جا رہی تھی۔ کہ گھر پہ کوئی بھی نہ تھا۔اور وہ ایسے ہی عورت کے بغیر کسی کے گھر جانے کی حماقت نہیں کر سکتی تھی۔ زندگی نے اسے ایسے سبق سکھا دئے تھے۔ کہ اب اس میں مزید سکت باقی نہیں تھی۔ کہ وہ مزید کوئی بات اپنے کردار پہ برداشت کرتی۔

ماہ نور اسے گھر کے اندر لے آئی۔۔۔اور سیدھا اسے اپنے کمرے لے جا کر کمبل میں بیٹھا دیا۔

گرم کمبل میں دُبک کر بیٹھنے سے اور اوپر سے ابرار کی بنائی گی کافی پی کر جسم تیزی سے گرم ہوا تھا۔

اس کے تاثرات دیکھ کر ماہ نور نے کوئی ایسی بات نہیں چھیڑی جس سے فرح مزید پریشان ہوتی۔

ماہ نور پلیز کچھ غلط مت سمجھنا۔ میرے پاس کوئی چارا نہیں تھا۔ سوائے وہاں سے بھاگ کر آنے کے۔ماہ نور خاموشی سے اس کے پاءوں کی سائڈ پہ بیٹھی حالات کا جائزہ لینے کی کوشش میں تھی۔ جب فرح نے اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر کہا تھا۔ماہ نور سے مخاطب ہوتے ایک آنسو بہت خاموشی سے اس کی آنکھ سے نکل کر گال پر پھسلتا قمیض کے گلے میں جزب ہوا تھا۔

ماہ نور چونک اُٹھی اور بے اختیار اُٹھ کر اس کے ساتھ جا بیٹھی۔اور روتی فرح کا سر اپنے کندھے سے ٹکا کر سر سہلانے لگی۔

فری۔۔۔ میری جان۔۔۔ کیا ہوا؟

مجھے کچھ بتاؤ ہوا کیا ہے ؟ تم پشاور سے کب آئی ؟ اکیلی کیسے آئی ؟

مجھے اپنے رونے کی وجہ تو بتاؤ۔ ایک ہی سانس میں اس نے پریشان کرتے تمام سوال پوچھ ڈالے تھے۔ فرح کے رونے میں مزید شدت آگئی۔ اور ماہ نور اپنی تکلیف اور پریشانی بھولے اسے سہارا دیئے بیٹھی آنسو پونچھتی رہی۔

میں۔۔۔ بالکل اکیلی ہوں ماہ نور۔۔۔ بابا نے امی جی نے۔۔۔ کسی نے میرا ساتھ نہیں دیا۔ پھوپو مجھے پشاور سے لے آئیں۔ اور یہاں ایک نئی جہنم میں چھوڑ دیا۔ روتے ہوئے وہ اُلجھے الفاظ بول رہی تھی۔ اور ماہ نور حیرت و بے یقینی سے اور کچھ اُلجھ کر اس کی ایک ایک بات سُن رہی تھی۔

دروازے پہ آئے ابرار کے ہاتھ ڈور نوب پہ ہی ساکت ہو گئے۔۔۔ اس کے قدم برف ہوئے اور سانس چلنا ایک لمحے رو کی۔۔۔

مجھے بتاؤ۔۔۔ تم کیا بات کر رہی ہو۔ ہر بات تفصیل سے کہو۔ جو دل میں ہے سب کہہ دو۔ اس کی کمر سہلا کر اس کے سر کا بوسہ لے کر اس نے ملائمت سے کہا تھا۔ فرح کو ڈھارس سی محسوس ہوئی اور اس نے وہ سب کہہ دیا جس کا بوجھ اُٹھئے وہ ماری ماری پھر رہی تھی۔ اس نے بہت روتے ہوئے۔ ہچکی کے دوران سب کہہ دیا تھا۔ ابرار کا دل غم سے رو پڑا تھا۔

اپنے چاہنے والے کو تکلیف میں دیکھنا برداشت کا کام ہوتا ہے۔ جب کوئی آپ کا روح سے تعلق رکھنے والا بلک بلک کر رو رہا ہو۔ تب جتنی تکلیف سہنے والا سہہ رہا ہوتا ہے۔ اس سے دوگنی چاہنے والا سہہ رہا ہوتا ہے۔ ابرار کے کانوں میں فرح کی ہچکی کھاتا لہجہ پڑ رہا تھا۔ اور اس کا دل چاہ رہا تھا۔ کہ وہ اندر جائے اور کچھ ایسا ضرور کہہ دے جس سے وہ بہت باتونی اور بہت ہنسنے والی لڑکی اپنے سارے غم بھول جائے۔ یا اسے کسی ایسی جگہ لے جائے جہاں کوئی غم کوئی تکلیف اس تک آنے سے پہلے ابرار اپنے اندر جزب کر لے۔ یہ تھی وہ خاموش محبت۔۔۔ جو بے غرض بھی تھی اور خالص بھی۔

ماہ نور کی آنکھیں اپنی بہترین دوست کے غم پہ بھیگ گئیں تھیں۔

فری میری جان۔۔۔ پریشان مت ہو۔ میں ہوں ناں۔ میں ابرار بھائی سے بات کروں گی۔ کہ وہ۔۔۔

نہیں۔۔۔نہیں۔۔۔پلیز ان سے کچھ مت کہنا۔میرا پردہ ان کے سامنے رکھ لینا۔میں ان کے سامنے شرمندہ نہیں ہونا چاہتی۔اس سے پہلے کے ماہ نور کی بات مکمل ہوتی۔اس نے اس کے کندھے سے سر اُٹھا کر نفی میں ہلاتے ہوئے کہا تھا۔ماہ نور چونک کر بہت بے بسی سے اسے دیکھ کر رہ گئ۔

ابرار نے ہونٹ بھینچ لیئے۔اور تیزی سے کوئی بھی آواز پیدا کئے بغیر واپس چلا گیا۔اسے فرح کے آخری الفاظ نے گہری تکلیف دی تھی۔

لیکن فرح۔۔۔ماہ نور نے اسے سمجھانا چاہا۔

نئ پلیز ماہا۔۔۔پلیز ان کو کچھ مت بتانا۔بس ایک دو دن تک مجھے یہاں اپنے پاس رکھ لو۔کچھ بھی اپنے بھائیوں سے کہہ دو۔پلیز۔۔۔میری۔۔۔

میری مدد کرو۔پھر میں اپنا ٹھکانہ کہیں اور ڈھونڈ لوں گی۔کوئی محفوظ جگہ۔اس نے روتے ہوئے ایک بار پھر سے کہا تھا۔ماہ نور گہرہ سانس لے کر رہ گئ۔اور اس کا ہاتھ پکڑ کر سہلانے لگی۔

جیسے تم مناسب سمجھو گی ویسے ہی ہو گا۔لیکن اتنا یاد رکھو۔تم ان کا راز جان چکی ہو۔وہ تم سے یا تو اپنے مطلب کا کام لے کر تمہیں بھی اپنا جیسا کرنا چاہیں گے۔یا پھر تمہیں مارنے کی ہر ممکن کوشش کریں گے۔اس لئے فیصلہ کرتے وقت عقل مندی سے سوچ لینا۔اور تم چاہو تو جب تک چاہو یہاں رہ سکتی ہو۔ہمیشہ تک کے لئے بھی۔۔۔کہہ کر آخر میں اس نے آہستہ سے کہا تھا۔فرح نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔مگر اس سے پہلے کے وہ اس سے بات کا مطلب پوچھتی ماہ نور کھانا لے کر آنے کا بول کر اُٹھ گئ۔اور وہ ہونٹ کاٹتی سوچتی رہ گئ۔

وہ کیچن کی جانب جا رہی تھی۔جب بابر صوفے پہ دراض پاءوں جھولاتا موبائل چلاتا نظر آیا تھا۔ٹی وی بھی بلند آواز چل رہا تھا۔ماہ نور نے ایک نظر ٹی وی پہ چلتے مناظر دیکھے اور پھر خاموشی سے بھائی کے پاس آ کھڑی ہوئی۔وہ اس کی موجودگی پا کر سیدھا ہو بیٹھا۔اور ابرو اُٹھا کر پوچھا کہ کیا ہوا؟

For more visit (exponovels.com)

ماہ نور نے سر ہلا دیا۔

کھانا کھائیں گے ؟ میں بنانے لگی ہوں۔ کیا کھائیں گے ؟

تم رہنے دو۔ میں نے آڈر کر دیا ہے۔ تھوڑی دیر میں آجائے گا۔ اس کے پوچھنے پہ بابر نے کہا تھا۔ ماہ نور نے سر ہلا دیا۔ اور خالی لاؤنج کو دیکھا۔

ابرار بھائی کہاں گئے ؟ بڑے بھائی کو نہ پا کر اس نے پوچھا تھا۔ بابر بے سوچتی نظروں سے اسے دیکھا۔ اور پھر سر انکار میں ہلا دیا۔

نہیں جانتا۔ بس ابھی باہر گئے ہیں۔ گاڑی بھی لے گئے ہیں۔

ماہ نور گہرہ سانس لے کر بھائی کے ساتھ ہی بیٹھ گئی۔ اور سر بابر کے کندھے پہ رکھ دیا۔

ماہ نور۔۔۔

جی ؟

ایک بات کہوں۔؟

جی ؟

تمہیں نہیں لگتا کہ بھائی کسی لڑکی کو پسند کرتے ہیں۔ دیکھو میں جانتا ہوں کہ یہ وقت ان باتوں کے لئے سہی نہیں ہے۔ لیکن تم پھر چلی جاؤ گی۔ اس لئے میں نے سوچا کہ میں ابھی بات کر لوں۔ اس کے چونک کر دیکھنے پہ بابر نے صفائی دیتے ہوئے کہا۔ تو وہ گہرہ سانس لے کر رہ گئی۔

ابھی میں یہیں ہوں۔ کہیں نہیں جاؤں گی۔ اور لڑکی کون ہے ؟ آپ جانتے ہیں ؟

نہیں۔۔۔ لیکن اگر تم ساتھ دو۔ تو میں معلوم کر کے بتا سکتا ہوں۔ اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ تو ماہ نور نے سر ہلا دیا۔

For more visit (exponovels.com)

مجھے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا۔ آپ پتہ کریں ہم ان کے گھر چلیں گے۔ اُٹھ کر کچن سے برتن لینے کے لئے جاتے ہوئے اس نے کہا تھا۔ بابر نے دھیمے سے مسکرا کر سر کو خم دیا۔ اور پھر واپس پُرانی پُزیشن میں لیٹ کر موبائل آن کر لیا۔

راوی کے اوپر دُھند پڑتی اس لمبے سامپ کے سے بل کھاتے دریا کو چادر دئے ہوئے تھی۔ ابرار کچے راستے پہ راوی کے سامنے کار سے پشت ٹکائے کھڑا۔۔۔ سینے پہ بازو لپیٹے راوی پہ دُھند اُترتی دیکھ رہا تھا۔ اس کا سانس ناہموار تھا۔ اور ناک کے نتھنے پھول رہے تھے۔ اس کے ابرو تنے ہوئے اور ہونٹ بھینچے ہوئے۔ اس بات کی علامت تھے کہ وہ اس وقت ضبط کے کڑے مراحل سے گزر رہا ہے۔ اسے سوچنے پہ یاد نہیں پڑتا۔ کہ آخری بار اس نے غصہ کب کیا تھا۔ غصہ اس کی سر شست میں شامل نہیں تھا۔ وہ تعبیتاً سلجھے اور نرم و سنجیدہ مزاج کا شخص تھا۔ اس لئے غصہ کم کھاتا تھا۔ لیکن پھر جب کھاتا تھا۔ تو بہت بے کابو ہو جایا کرتا۔ آج بھی وہ بے کابو تھا۔ اس کی گردن کی نسیں پھول رہی تھیں۔ اور جوتے میں مکین پاءوں کے انگوٹھے وہ رگڑتے ہوئے بہت بے تابی سے کسی کا منتظر تھا۔

اس سے پہلے کے گھڑی رات کے دس بجاتی۔ اور وقت مزید گزرتا اس کی کار کے قریب ہی ایک کار آر کی۔۔۔ کوئی رات کی سیاہی میں کار کا دروازہ کھولتا آ کھڑا ہوا تھا۔

سوری مائی بوئے۔۔۔

میری وائف کی تعبیت خراب تھی۔ میں اسے ہسپتال لے کے گیا تھا۔ اس کے پیچھے آکر کھڑے ہوتے اس نوجوان نے کہا۔ چہرے مہرے سے آواز سے بھاری پن نمایا تھا۔ آج وہ معمول سے ہٹ کر کریم رنگ کھدر کے شلوار قمیض میں تھا۔ اور ابرار ہی کی طرح آنکھوں پہ فریم لیس چشمہ لگا رکھا تھا۔

ابرار نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس خاموشی سے راوی کو دیکھتا رہا۔

کیا ہوا؟ خاموشی کا مطلب کیا سمجھوں میں؟ اس کی خاموشی پا کر وہ اس کے برابر آ کھڑا ہوا۔ اور اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر ہلکے سے ہلایا۔

اب کی بار پوزیشن میں تبدیلی آنے کی بجائے محض زبان نے.Asfand! I need your help bro جمبیش کی تھی۔اسفند اکرام مسکرادیا۔

ایک بار پھر سے اس کے کندھے کو ہلکے سے ہلا کر اس نے کہا۔تو اب کی بار ابرار نے....Any time budy گردن موڑ کر اسے دیکھا۔اس کی آنکھوں میں کوئی ایسا تاثر ضرور تھا۔جس نے اسے چونکنے پہ مجبور کر دیا۔

کیا ہوا؟وہ سیدھا کھڑا ہوا۔

تمہارا کوئی دوست پولیس میں ہے؟

ہاں۔۔۔کیوں؟

ایک مخبری کرنی ہے۔کسی ایماندار کو ڈھونڈو۔جس کے پاس نام،پیسہ اور بڑے عہدے کی طاقت بھی ہو۔اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اس نے بہت ضبط سے کہا تو اسفند اکرام اسے دیکھ کر رہ گیا۔

کیسی مخبری؟

نشے کی کھپ اور اس کے پیچھے موجود افراد کی موجودگی کا یقین۔۔۔اس نے بہت بے ربط الفاظ کہے تھے۔

ضیاء؟اس نے اس قدر مدھم آواز میں نام لیا۔کہ ابرار بمشکل سُن پایا۔

ابرار نے سر ہلادیا۔۔۔ہاں ضیاء۔۔۔اور اس کا پورا گروپ۔

کیا ہوا؟اس پہ ہاتھ ڈالنے کا تم نے کیوں سوچا؟سب خریت؟

بلیک میلنگ اور حریسمنٹ کا کیس الگ سے کرنا ہوگا۔اس کی بات کے جواب میں اس نے ایک الگ جواب دیا۔تو اسفند اسے دیکھ کر رہ گیا۔

ابرار بتاؤ تو۔ہوا کیا ہے؟اب تو تم مجھے پریشان کر رہے ہو۔لفظ حریسمنٹ نے اسے چونکنے پہ مجبور کر دیا تھا۔

ایک لڑکی کو اس نے بلیک میل کیا۔ اور اسے حریس کرنے کو ہر گری ہوئی حرکت کی کوشش کی۔ لیکن نام اس لڑکی کا نہ آئے تو بہتر ہے۔ وہ ایک عزت دار گھر سے ہے۔ وہ میری بھی عزت ہے۔ اس لئے اپنے دوست سے کہنا کہ کیس کونفیڈینشل رکھے۔ وہ کوئی بھی بات سیدھے طریقے سے نہیں کہہ رہا تھا۔

لڑکی کون؟

جواب میں ابرار نے خالی خالی نظروں سے اسے دیکھا۔ تو اسفند ہونٹ بھینچ گیا۔

اگر میں غلط نہیں۔ تو۔۔۔ بھا۔۔۔

ہاں وہی۔ اس کے منہ سے پورے الفاظ نکلنے سے پہلے ہی اس نے ٹوک کر کہا تھا۔ اسفند نے اس کے کندھے پہ دوبارہ بازو رکھ لیا۔ اور اس کے ساتھ کھڑا ہو کر راوی کے سیاہ ساکت پانی پہ اُترتی سفید چادر کو دیکھنے لگا۔

بھروسہ رکھو۔ میں اس مسلے کو حل کروادوں گا۔ تم خود بھی اس سے بات کر لینا۔ اور تمام بات بتا دینا۔ وہ اس کی حالت کو سمجھ سکتا تھا۔ وہ اس سب سے گزر چکا تھا۔

\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-

ماہ نور نے کھانا میز پہ نہیں لگایا تھا۔ بابر کو لاءونج میں

دے کر۔ وہ اپنا اور فرح کا کھانا لئے کمرے میں ہی آ گئی۔

ماہ نور تمہارا فون پیچھلے دس منٹ سے بغیر سانس لیے بج رہا ہے۔ ڈرسنگ کے سامنے کھڑے ہوتے۔ فرح نے کہا تھا۔ اس کا چہرہ گیلہ اس بات کی علامت تھا۔ کہ وہ فریش ہو کر نکلی ہے۔

ماہ نور نے ٹرے میز پہ رکھی اور سائڈ ٹیبل کی جانب بڑھ کر فون اُٹھایا۔ ذریت حسن کی جانب سے مِسڈ کالز کا ایک سلسلہ تھا۔ ماہ نور نے بے دلی سے فون سوئچ آف کر دیا۔

کس کی کال تھی؟ بال سیدھے کرتے۔ شیشے میں ماہ نور کے پریشان چہرے کو دیکھتے ہوئے۔ اس نے پوچھا۔

رونگ نمبر تھا۔ نظر چُراتے ہوئے اس نے جھوٹ بولا۔ فرح نے ایک لمحے کو چونک کر اسے دیکھا۔ وہ اسے کہہ نہیں پائی۔ کہ ماہ نور تمہاری ناک لمبی ہو رہی ہے۔

وہ جانتی تھی۔ کہ کال ذریت کی جانب سے تھی۔ مگر ماہ نور کا فون آف کر دینا۔ اسے عجیب پریشانی میں ڈال گیا تھا۔

مگر اس وقت اس نے کوئی بھی بات کرنا غیر آرامدے سمجھا تھا۔ باتھ روم جا کر اس نے دوبارہ سے ہاتھ دھوئے اور بغیر خشک کئے باہر آ گئ۔ ماہ نور ٹیبل پہ کھانا رکھ چکی تھی۔

نتاشا نے سر دائیں جانب موڑ کر کسی کی موجودگی کو دیکھا۔ اور کھولے گیٹ سے کالج کے اندر غائب ہو گئ۔

اس نے گلز کالج میں دو روز قبل نوکری شروع کی تھی۔ یہ نوکری اسے ضیاء صاحب نے دلائی تھی۔ اور ساتھ میں کام ہو جانے پہ بھاری رقم دینے کا وعدہ تھا۔ جنہیں لے کر وہ اپنے منحوس کزن اور شوہر کے منہ پہ مار کر آسانی سے طلاق لے سکتی تھی۔ اس نے یہی تو سوچا تھا۔

جب فرح رات کے کھانے سے قبل روم ڈسٹبن صاف کرنے کو باہر نکلی۔ تبھی گیٹ سے گارڈ اپنی سگریٹ لینے کو اندر چوکی نماں کمرے میں غائب ہوا تھا۔ گیٹ محض دو منٹ کو خالی ہوا۔ اور اس کے پاس دو منٹ تھے۔۔۔۔ بھاگنے کو۔ ان دو منٹوں میں اس نے یہاں سے بھاگنے کا منصوبہ بنایا اور دائیں بائیں کسی کو نہ پا کر تیزی سے گیٹ پار کر گئ۔ بھاتے کوئے اسے اس بات کا احساس شدت سے تھا۔ کہ جن سے وہ بھاگ رہی ہے۔ ان کے پاس اس کی بہت بڑی کمزوری ہے۔ لیکن آج کی رات محض آج کی رات اسے سوچنے کی مہلت ملی تھی۔ کل صبح اسے زبردستی کیچڑ میں دھکیل دیا جاتا۔ جو اس کے لئے ممکن نہیں تھا۔

وطن پرستی انسان کی روح میں باریک بالوں کی طرح ریشے بنائے ہوئے گوندھی گئ ہے۔ ملک سے محبت ہر انسان کے خون میں شامل ہوتی ہے۔ ہاں البتہ ان کا کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ جو ان الفاظ سے نابلد ہوں۔ جو منافق ہوں۔ اور جن کا کوئی حسب نسب تک نہ ہو۔

والدین سے پہلے اور دین کے بعد ہر وفا شعار کا پہلا عشق پاکستان ہے۔اس کا بھی پہلا عشق پاکستان ہی تھا۔اور پہلے عشق سے وفاداری اس کے فرض میں شامل تھی۔

لفظ فرض میں اس لئے لکھ رہی ہوں۔ کہ ذمہ داری کوئی بھی اُٹھا سکتا ہے۔ایک منافق بھی۔ مگر فرض کو ہر شخص پہ لازم کیا گیا ہے۔اور اسے قضا کرنے سے صرف عاشق ڈرتا ہے۔

اس نے پاکستان کی نسل بکخاطر عزت کی پروا نہیں کی۔اور بھاگ آئی۔اس خوف سے بالکل آزاد ہو کر کہ ان پاس اس کی کمزوری ہے۔بس خُدا پہ ایمان کامل تھا۔ کہ اب وہ رسوا نہں ہو گی۔

جو لوگ پاکستان سے جنون کی حد تک عشق کرتے ہیں۔ان کو میں نے آج تک بلند ہی دیکھا۔ان کو خُدا نے بہت عزت دی۔ان کی حفاظت کی۔اور جو اس کی وفا کو نبھاتے ہوئے مارا گیا۔اسے شہادت دی۔

جب مسٹر ضیاء ہوسٹل پہنچے تب اسی وقت فرح ابرار کے سامنے کھڑی لمبے لمبے سانس لے کر اپنی اکھڑتی سانس بحال کر رہی تھی۔

فرح کے غائب ہونے کا پتہ اُنہیں اس کے جانے کے ایک گھنٹے بعد ہوا تھا۔ بات آگ کی طرح پھیلی۔

لڑکیاں دانتوں میں اُنگلیاں دباتی سوچتی رہ گئی تھیں۔ کسی کو بھی اس بات پہ یقین نہیں آ رہا تھا۔ کہ فرح خان ایسا کوئی قدم اُٹھا سکتی ہے۔

دوسری طرف میڈم کو جان کے لالے پڑ چکے تھے۔ضیاء صاحب نے اسے خوب سخت سست سنا کر۔دو دن کا الٹیمیٹم دے دیا تھا۔ کہ اس عرصے میں وہ نئی لڑکی بھی ڈھونڈے اور فرح کا بھی حل نکالے۔

تبھی میڈم کو قسمت سے اپنی دوستوں کے ساتھ نتاشا نظر آ گئی۔

نتاشا کلب میں بیٹھی اپنے شوہر کو گالیاں دے رہی تھی۔اور بتا رہی تھی۔ کہ وہ بہت ظالم اور لالچی ہے۔اس سے اپنے میلے کپڑے دُھلواتا ہے۔اور بات بات پہ مارتا ہے۔وہ چلاک اور ہوشیار تھی۔اور خوبصورتی اسے بے تحاشادی گئ۔وہ اس کام کے لئیے بالکل ٹھیک تھی۔وہ ٹھیک سمجھی تھی۔اس نے اسے ٹھیک جج کیا تھا۔

ماہ نور ایک بات پوچھوں؟لان کی ٹھنڈی گیلی گھاس پہ چلتے فرح نے کندھوں پہ پھیلی چادر درست کرتے پہلو میں چلتی ماہ نور سے پوچھا۔

ہم ؟اجازت دی۔اس کی نظریں گھاس پہ کچھ تلاش کر رہی تھیں جیسے۔

تمہاری ذریت بھائی سے لڑائی ہوئی ہے؟چلتے چلتے اس نے پوچھا۔ماہ نور ایک دم سے رک گئ۔

آ۔۔۔نہیں

ماہا تمہیں جھوٹ نہیں بولنا آتا۔مت بولا کرو۔دو دن میں وہ پہلی بار مسکرائی تھی۔

ماہ نور نے گہرا سانس لے کر اندر کی کسافت کم کرنے کی کوشش کی۔اور پھر لان میں پڑے واحد سنگی بینچ کی طرف آ گئ۔

تم جان کر کیا کرو گی؟فرح وہیں کھڑی تھی۔جب اس نے پوچھا۔فرح نے اس کے چہرے کے تاثرات کو جانچتی نظروں سے دیکھا۔اور پھر متوازن چال چلتی اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

مطلب ہوئی ہے۔۔۔کیوں ہوئی ہے؟

میں نے کب کہا ہوئی۔ماہ نور مسکرائی۔سوگوار مسکراہٹ۔۔۔

تم نے کہا نہیں۔لیکن میں نے سن لیا۔فرح کو اس کی مسکراہٹ نکلی لگی۔

ماہ نور اب کی بار خاموش ہی رہی۔

تم جانتی ہو فرح۔۔۔خاموشی کا وقفہ لیتے اس نے کہا تھا۔فرح بس اسے دیکھتی رہی۔

دل جب تکلیف سے پھٹ رہا ہو۔وجود کے انگ انگ سے تھکاوٹ ٹپک رہی ہو۔اور بہت سارونے کو دل چاہتا ہو۔مگر آپ کو اپنوں کی خاطر وقت بے وقت مسکرانا بھی ہو۔ایسے میں بہت دل چاہتا ہے کہ کوئی آئے۔آپ کے سر کو کندھے سے لگائے۔اور تھپتھپاتے ہوئے اتنا بول دے۔جو کہنا ہے کہہ دو میں سُن رہا ہوں۔ایک آنسو اس کی آنکھ سے نکل کر اس کی قمیض کے گلے میں جذب ہو گیا۔

ماہ نور میری جان۔۔۔کیا ہوا؟فرح کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا۔اس نے اس کے سر کو اپنے کندھے سے ٹکالیا۔

مجھے بتاءو کیا ہوا ہے؟

فرح وہ۔۔۔وہ ذریت نہیں تھا۔وہ جس کو میں نے اپنا سب کچھ مانا۔جس کی بھلائی کے لئے دن رات کی۔وہ میرا کبھی نہیں تھا۔روتے ہوئے وہ کہتی گئ۔اسے ایک کندھا میسر تھا۔ایک دوست کا کندھا۔۔۔

ہلو لیڈیز۔۔۔کیا چل رہا ہے۔بابر ایک دم نہ جانے کہاسے آکر سامنے کھڑا ہوا تھا۔ماہ نور تیزی سے سیدھی ہوئی۔مگر وہ اس کا رونا نوٹ کر چکا تھا۔

ماہا۔۔۔کیا ہوا؟

تم رو کیوں رہی ہو میری گڑیا؟حیرت کے شدید جھٹکے سے اس نے پوچھا۔تو ماہ نور نے نفی میں سر ہلادیا۔بابر اس کے پاءوں میں بیٹھ گیا۔دوزانوں ہو کر بیٹھ گیا۔اور ہاتھ پکڑ لئے۔

میں تمہاری ہر ہر ادا سے واقف ہوں۔مجھے بتاءو کیا بات ہے۔تم اتنا کبھی نہیں روتی۔دیکھو۔سارا چہرہ سرخ ہو گیا۔اس کی گال پہ نمی کو پا کر اس نے گلے میں لپٹے اپنے مفلر سے صاف کرتے ہوئے پوچھا تھا۔

بھائی۔۔۔ایک سسکاری سی منہ سے نکلی تھی۔اور رونے کے دوران وہ۔وہ سب بتاتی گئ۔جو اہم تھا۔بابر کا منہ حیرت سے کھول گیا۔پر۔۔۔وہ کچھ کہہ نہ سکا۔

اچھا۔۔۔یہ بات ہے۔انداز پُر سوچ تھا۔اس نے سر ہلادیا۔

میں پتہ کرتا ہوں۔کہ معملہ کیا ہے۔اب رونا نہیں۔نرمی سے اس کا گال تھپتھپاتے اس نے کہا۔تو فرح کو یہ منظر بہت بھلا معلوم ہوا۔ایک چوٹ سی لگی تھی دل پہ۔جس سے ٹیس بھی شدت کی اُٹھی تھی۔وہ تیزی سے بینچ سے اُٹھی۔اور گھر کے اندرونی حصے کی جانب بھاگ گئ۔

انہیں کیا ہوا۔بابر نے حیرت سے فرح کو جاتے دیکھ کر پوچھا۔تو اس نے شانے اچکا دئے۔شائد اسے اپنے گھر والے یاد آرہے ہیں۔۔۔میں دیکھتی ہوں۔کہہ کر اس نے گھوٹنے سے بھائی کا ہاتھ ہٹایا اور اندر کی جانب بڑھ گئ۔

بابر اُٹھ کر بینچ پہ بیٹھ گیا۔اور پر سوچ انداز میں آسمان کو دیکھنے لگا۔

آسمان پہ سیاہی دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔دھوند کا زور بڑھ چکا تھا۔اور اس کی گاڑی سرئیت سے سڑک پہ رواں دواں تھی۔

ہمنوار سڑک کا اختتام اس کے گھر کے گیٹ کے سامنے ہوا۔صبح ہی صبح صاحب کی گاڑی کا ہارن سُن کر ملازم نے جھٹ گیٹ کھولا۔اور سلام کرنے کو ہاتھ ماتھے تک لے گیا۔گاڑی میں بیٹھے ذریت نے سر کے اشارے سے اسے جواب دیا۔اور کار سرخ اینٹوں کے روشنیوں کے جگمگاتے پورچ میں جار کی۔

اس نے طمانیت کی سانس خارج کی اور باہر نکلا۔

پیرس کے پر سکون ہوٹلوں میں بھی جیسے اس کے لئے سکون ختم ہو چکا تھا۔کل رات اسے دادی جان نے جلدی گھر آنے کو بولا۔تو اسے لگا جیسے وہ اسی آواز کا منتظر ہو۔اس نے تمام اہم میٹنگز کرنے کے بعد باقی کو اپنے سیکٹری کو ہینڈل کرنے کا بولا اور فلائٹ لے کر آگیا۔

راہداری سے گنزرتے اس کی نظریں مکینکی انداز میں دائیں بائیں چکر بھی کاٹ رہی تھیں۔

دادی جان کے کمرے کی روشنی جل رہی تھی۔اور وہ قیام میں تھیں۔ تہجد۔۔۔وہ بہم سا مسکرایا اور پھر آہستہ سے چلتا ان کے بیڈ پہ بیٹھ کر جوتے اُتارنے لگا۔ مگر پھر اس سے پہلے کہ وہ جوتے اُتارتا وہ رُکا اور پھر جھٹکے سے اُٹھتا کمرے سے باہر نکل گیا۔

راہدار کے اختتام پہ اوپر کو جاتی سیڑھیوں پہ قدم وہ تیزی سے اُٹھا رہا تھا۔

کمرے کو بغیر دستک کے کھولا۔ تو دروازہ کھولتا چلا گیا۔ کمرے میں اندھیرے کا راج تھا۔اس نے لمحوں میں بٹن گرایا۔اور ایک نظر خالی کمرے میں دوڑائی۔ شکنوں سے پاک بیڈ۔۔۔ جا بجا صفائی۔ گویا وہاں ہفتے سے کوئی رہا ہی نہ ہو۔اس نے ذرا حیرت سے کمرے میں ایک نظر اور ڈالی۔۔۔بیوی کو دیکھنے کا اشتیاق شائذ صاحب بہادر کے دل میں پہلی بار اُمڈا تھا۔ مگر افسوس کے اس وقت وہ کسی نازک مزاج محبوبہ کی طرح منہ بنائے اپنے میکے بیٹھی تھی اور اس وقت بالکل میسل نہ تھی۔اس نے باتھروم کے کھولے دروازے کو دیکھا۔مڑنے سے پہلے ایک بار پھر سے کمرے میں نظر دوڑائی اور واپس مڑ گیا۔

اسے لگا شائذ وہ دادی جان کے باتھ روم میں ہو۔وہ تیزی سے اس جانب گیا۔

اسے دادی جان نے آگاہ نہیں کیا تھا۔ کہ ماہ نور گھر سے جا چکی ہے۔

اب کی بار اس کے کمرے میں پہنچنے تک دادی جان سلام پھیر چکی تھیں۔اور اب متفکر سی دروازے کو دیکھ رہی تھیں۔

کمرے میں آکر اس نے دادی کو مسکرا دیکھ کر ایک نظر باتھ روم کے کھولے دروازے کو دیکھا اور پھر مایوسی کو چھوپاتا بے دل مسکراہٹ کے ساتھ دیکھتا آگے بڑھا اور مسکرا کر گھٹنوں پہ جھک کر ان کے ماتھے کا بوسہ لیا۔

اسلام علیکم دادی جان۔۔۔ تھکی تھکی آواز میں مسکرا کر کہتے وہ اُنہیں بہت پیارا لگا۔پر افسوس کے اس کے چہرے کی تھکاوٹ اب شائذ کچھ عرصے تک اُنہیں دیکھنی پڑتی۔

تم اتنی صبح کیسے آ گئے؟ اٹھ کر پوتے سے پوچھتے اور پھر جائے نماز کو اکٹھا کرتے اُنھوں نے پوچھا۔ تو وہ آگے بڑھا اور ہاتھ سے پکڑ کر اُنھوں بیڈ تک لے آیا۔

آپ نے مجھے بلایا۔اور میرا خُد بھی وہاں دل مزید رُکنے کا ارادہ نہیں تھا۔اس لئے میں آ گیا۔

آپ کو میرا آنا اچھا نہیں لگا۔ مسکرا کر پوچھا۔وہ ہنس دیں۔

بچے ہی رہنا تم۔۔۔اس کے کندھے پہ ہلکے سے دھپ لگاتے اُنہوں نے کہا۔تو وہ مسکرایا اور ایک بار پھر سے متفکر سا باتھ روم کا کھولا دروازہ دیکھا۔

آپ کی بہو کہاں ہے؟

بہو۔۔۔وہ رُکیں۔۔۔

یہیں ہے۔اس نے کہاں جانا ہے۔

کہاں؟مجھے تو کہیں نظر نہیں آئی۔لہجے میں ہلکا سا جوش اُبھرا۔اسے لگا تھا۔وہ عام روائیتی بیویوں کی طرح رات سے اس کی منتظر ہو گی۔پر وہ کہیں نظر ہی نہیں آئی۔

(دادی جان دھیمے سے مسکرائیں۔(ابھی وہ کہتی ہے۔کہ ذریت کو اس سے محبت نہیں

ارے بچے میرے سے تھوڑی سی باتیں تو کر لو۔پھر بہو کے پاس بھی چلے جانا۔

ہیں۔۔۔مجھے تو اپنے کانوں پہ یقین نہیں آ رہا۔

اوہ خُدا تیرا شکر۔۔۔میرا گھر بھی روائتی گھر بنا۔شوخی خوب عروج پہ تھی۔وہ ہنس دیں۔

بکو مت۔۔۔وہ اپنے بھائی کے گھر گئی ہے۔

کیوں؟وہ جو لیٹ کر سر ان کی گود میں رکھنے والا تھا۔فوراً سیدھا ہوا۔آپ نے تو مجھے ایسا کچھ نہیں بتایا۔اور اس کے فون کو کیا ہوا ہے؟

اس نے میری ایک بھی کال رسیو نہیں کی؟ایک دم سے اگلے پچھلے سارے سوال کر ڈالے۔

پتہ نہیں۔۔۔تم مل کر خود پوچھ لینا۔

اور اب مجھے بتاؤ کہ بھوک تو نہیں لگی؟ اگر لگی ہے۔تو میں ظفر سے کہہ کر کچھ بنوا دیتی ہوں۔

نہیں میں نے فلائٹ میں کھانا کھالیا تھا۔اس کا موڈ سخت آف نظر آیا۔وہ ان کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گیا۔تو دادی جان اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرنے لگیں۔

ذریت کو سخت افسوس ہوا تھا۔دادی جان کو اکیلے چھوڑ کر اسے نہیں جانا چاہے تھا۔کم از کم میرا انتظار ہی کر لیتی۔اسے جیسے ماہ نور سے اس اقدام کی اُمید نہیں تھی۔

:::::::::َ

ماہ نور

جی؟ بھائی۔وہ لان میں مورننگ واک کر رہی تھی۔جب پُشت پہ ہانپتے بابر کی آواز سُنی تو مڑی۔وہ ابھی باہر سے آیا تھا۔

تم نے ذریت بھائی سے کوئی بات کی؟

کب؟

وہاں سے آنے کے بعد۔وہ کیا ہے۔کہ میں سوچ رہا تھا۔اس لئے تمہیں دیکھ کر پوچھ لیا۔اتنی صبح صبح ذریت کے ذکر پہ ماہ نور کا چہرہ اُترتا دیکھ کر کہا۔تو وہ سر ہلا گئی۔

نہیں۔۔۔ان کی کال آئی تھی۔پر میں نے ریسیو نہیں کی۔کیوں؟

آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟

میں سوچ رہا تھا۔کہ میں ذریت بھائی کو خود کال کر لوں۔رات میں نے گھر کال کی تھی۔تو تمہارا ملازم بتا رہا تھا۔کہ ذریت چار بجے گھر پہنچے گا۔

For more visit (exponovels.com)

اوہ۔۔۔اب تک اُن کو پتہ چل چکا ہو گا۔ کہ میں گھر پہ کیوں نہیں ہوں۔اسے جیسے اس کے آنے کی اُمید نہ تھی۔

ہاں شائد۔۔۔ بابر نے شانے اُچکا کر بے پروائی دیکھائی۔

ویسے تم چاہو۔ تو سب واپس ٹھیک ہو سکتا ہے۔ کیونکہ تم نہیں جانتی کہ حقیقت کیا ہے۔ سوچ کر بولتے اس کی نظریں گھاس پہ تھیں۔اور پاؤں گھاس اُکھیڑ رہے تھے۔

لیکن میں نے خود ان کو باتیں کرتے سُنا ہے۔اور اگر کوئی بات نہیں تھی۔ تو ان کو چاہیے تھا۔ کہ مجھ سے بات کرتے۔ مجھ سے شئیر کرتے۔اس نے منہ بنا کر کہا۔ تو بابر نے سر ہلا دیا۔

چلو۔۔۔ ابھی تم کسی سے کوئی بات مت کرنا۔ میں دیکھتا ہوں کیا کرنا ہے۔اور ہاں۔۔۔ایک اور بات۔

فرح تمہاری جو فرنڈ ہے۔اس کی فیملی کا پتہ ہے کہاں سے ہے؟

میرا مطلب ہے۔ کہ کوئی ایڈریس؟ لہجے کو قدرِ نارمل رکھتے اس نے پوچھا تو ماہ نور چونکی۔

بھائی؟

ہم۔۔۔

آپ کو لگتا ہے۔ کہ فرح وہ لڑکی ہے۔ جسے ابرار بھائی پسند کرتے ہیں۔ نئ؟ ایک ابرو اُٹھا کر پوچھا۔ تو بابر چونکا۔

میں تم سے کچھ پوچھ رہا ہوں۔اور تم مجھے کچھ بتا رہی ہو۔اس نے انکار نہیں کیا تھا۔

میں بتا نہیں رہی۔ آپ سے پوچھ رہی ہوں۔ کیونکہ میں جانتی ہوں۔ کہ جسے وہ پسند کرتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں وہ کون ہے۔اور شائد میں بھی۔ آخر میں وہ مسکرائی تھی۔

بابر نے سر جھٹک کر آسمان کی طرف دیکھا۔ بولا کچھ نہیں۔

اور اگر ایسا ہو۔ تو مجھے نہیں لگتا۔ کہ عتراض کی کوئی وجہ بنے گی۔

اوہ۔۔۔تو آپ کو لگتا تھا۔کہ میں عتراض کروں گی۔خوشگوار حیرت سے کہتے۔آخر میں اس نے بُرا مناتے ہوئے کہا۔تو بابر ہنس دیا۔

خیر ابھی ان باتوں کا وقت نہیں ہے۔ابھی ضیاء پہ بھائی لوگ کیس کر رہے ہیں۔اور فرح کو بھی اس کے گھر بھیجنے کا انتظام ہو رہا ہے۔پھر اس کے بعد سوچیں گے کیا کرنا ہے۔

میں بھی ساتھ جاؤں گی۔

ہاں۔۔ظاہر ہے۔خیر۔۔پلیز مجھے۔فریش جوس بنادو۔اندر کی جانب قدم بڑھاتے اس نے کہا۔تو ساتھ دو انگیاں ماتھے تک لے جا کر اشارا کرتا آگے بڑھ گیا۔تو ماہ نور مسکرا دی۔

:::::::::::::

سورج کی کرنیں کھڑکی سے چھن کر نیچے اس کے بستر پہ آتی اسکے چہرے پہ پڑ رہی تھیں۔اس نے کسلمندی سے آنکھیں مسلتے ارد گرد دیکھا۔اور اُٹھ بیٹھا۔وہ اس وقت دادی جان کے بیڈ پہ سو رہا تھا۔صبح آنے کے بعد وہ وہیں سو تا رہا تھا۔دادی جان نے بھی اس نے نہیں اُٹھایا۔اور اب وہ نیچے جا چکی تھیں۔کیسے گئیں یہ اسے معلوم نہیں تھا۔وہ جوتے گھسیٹتا اُٹھا اور باہر نکل گیا۔اس کا رُخ اپنے کمرے کی جانب تھا۔

اس نے کمرے میں آتے ہی واڈروعب کھولی اور پھر سیاہ شرٹ کے ساتھ نیلی جنز کو نکالتا باتھ روم میں گھس گیا۔

وہاں سے باہر آکر اس نے جیکٹ پہن کر بالوں کو ڈرائے کرنے کے بعد جیل سے عادت کے مطابق سیٹ کیا اور پھر نیچے آ گیا۔۔۔

دادی جان دائنگ ٹیبل پہ بیٹھیں اسی کی منتظر تھیں اور ظفر کو کہنے ہی والی تھیں کہ ذریت کو نیچے بلائے۔۔۔

ٹیبل پہ ان کے سامنے نتاشا کی دی ہوئی تمام تصویریں پڑی تھیں۔اسے آتا دیکھ کر اُنہوں نے مسکرا کر اسے اپنے قریب کی کرسی پہ آکر بیٹھنے کا اشارہ کیا تو وہ مسکراتا ان کے ساتھ کی کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔اس کی نظر سب سے پہلے خاکی لفافے پہ گئی تھی۔اس نے تعجب سے اُنہیں دیکھا۔تو اُنہوں نے ظفر کو بھیجتے ہوئے تصویریں اس کی جانب بڑھائیں۔

یہ کیا ہے ؟ایک ابرو اُٹھا کر اس نے پوچھا۔اور پھر تصویروں کا لفافہ پکڑنے سے پہلے سامنے پڑی پھلوں کی ٹوکری سے سیب اُٹھا کر دانتوں سے کاٹنے لگا۔

سیب کھانے کے دوران اس نے لفافہ کھولا تو بہت سی تصاویر اوندھی ہو کر اس کی جھولی میں آگریں۔

یہ۔۔۔

یہ کیا ہے۔۔۔پہلی تصویر پلٹ کر دیکھا تو گویا حلق میں ایک دم سے کانٹے اُگنے لگے۔ہونٹ بھینچے گئے۔اور ہاتھ میں پکڑا آدھا سیب اس نے گلا کھنکار کر سامنے میز پہ پڑی پلیٹ میں رکھ دیا۔دادی جان اس کے چہرے کے ایک ایک تاثر کو دیکھ رہی تھیں۔جو ہر تصویر کے بعد بدل رہا تھا۔اس نے تقریباً چھ سات تصویروں کو بڑے تحمل سے دیکھا۔اور پھر دادی جان سے نظر ملائے بغیر کرسی گھسیٹ کر اُٹھ گیا۔

کیا ماہ نور بھی اسی لئے گئی ہے ؟لہجے میں خشکی اپنے آپ در آئی۔اُنہوں نے سر نفی میں ہلایا۔

اس کے گھر میں کوئی مسئلہ تھا۔اس لئے وہ چلی گئی۔اُنہوں نے کہا۔تو کندھوں سے جیسے بار اُتار۔وہ بغیر کوئی صفائی دئے۔تصویروں کے متعلق بات کئے۔دھڑ دھڑ سیڑھیاں چڑھتا اوپر غائب ہو گیا۔اور ابھی اُنہیں زیادہ انتظار بھی نہیں کرنا پڑا جب وہ واپس اسی تیزی سے اُتر رہا تھا۔چہرے پہ کسی بھی قسم کے تاثر کی چھاپ تک نہ تھی۔اُنہوں نے کوئی کلام پڑھ کر اس کے غائب ہوتی پشت کو دیکھ کر پھونک ماری اور تھرماس سے چائے نکال کر پینے لگیں۔

:::::::::::::

آفس کی کھڑکی میں کھڑا وہ سامنے پھیلے ایک جہان کو دیکھ رہا تھا۔اور ہونٹ آپس میں پیوست تھے۔اکمل نے گلا کھنکار اسے اپنی جانب متوجہ کرنے کی کوشش کی۔مگر وہ اسی طرح جینز کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے سامنے دیکھتا رہا۔

For more visit (exponovels.com)

ذریت۔۔۔

ذریت تم کیا سوچ رہے ہو؟ مجھے بھی تو کچھ بتاؤ بھائی۔۔۔ وہ اب اس کی خاموشی سے جھنجھلایا معلوم ہو رہا تھا۔

یار میں نے تمہیں کہا نہیں تھا۔ کہ اس پہ نظر رکھنا۔ نفرت سے اس کے لہجے میں اختتام پہ درشتی کچھ اور بڑھی۔ اکمل نے گہرا سانس لیا۔

تم نے کہا تھا۔ مگر بعد میں تم نے ہی منا کر دیا تھا۔ تمہارا خیال تھا۔ کہ وہ اب چین سے اب کبھی واپس نہیں آئی گی۔ اور یہ کہ اب وہ خطر نہیں بنے۔ اور ہم اس سے بدلہ نہیں لیں گے۔

ہاں کہا تھا۔۔۔ اسے جیسے اپنے پہ افسوس ہوا۔ اسی کا نتیجہ ہے۔ کہ وہ عورت ایک بار پھر سے مجھے ہی ڈس گئی۔ اسے لگا وہ میرا گھر میری زندگی اجاڑ دے گی۔ وہ نتاشا کا نام بھی نہیں لے رہا تھا۔ وہ اس کے ساتھ آخر میں نرمی کر گیا تھا۔ جو اس نے بار میں کھڑی وائن پیتی اور عجیب بے حودہ سا ڈانس کرتی کی وڈیو وائیرل نہیں تھی۔ اس سے شائد نتاشا کو فرق نہ پڑتا۔ مگر اسکے باپ اور چچا، تایا کی ساکھ ضرور گر جاتی۔ مگر اسے ان سے نہیں نتاشا سے بدلہ لینا تھا۔ اور افسوس کے اسی نرمی کا نتیجہ تھا۔ کہ وہ ایک بار پھر سے بازی پلٹ گئی۔ اور ذریت جیسے آذر کو جاتا دیکھتا رہا تھا۔ ویسے ماہ نور کو بھی جانے دیتا۔ اس نے بہت لمبا سانس لے کر اپنے اندر کی کسافت کو کم کرنے کی کوشش کی اور دونوں ہاتھوں کو بے بسی سے چہرے پہ پھیرتا واپس کرسی پہ آ بیٹھا۔

باس۔۔۔ اگلا کیا لائحِ عمل ہے۔ بتاؤ۔۔۔

کچھ نہیں بس۔۔۔ ایک آخری بازی۔ اس نے مجھے تباہ کیا ہے۔ اب میری باری۔ میں نے اس کو اس کے قتل کے ساتھ ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیا تھا۔ مجھے ماہ نور کے ساتھ رہنا تھا۔ مگر وہ اب مجھے ڈس رہی ہے۔ میری بیوی کو تکلیف پہنچانے کی کوشش میں ہے۔ جواب مزید میری برداشت سے باہر ہے۔ میرے اختیار میں ہوتا۔ تو میں اسے کہیں دور اپنی زندگی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دفعہ کر دیتا۔ مگر وہ تو گلے کا طوق بنتی گئی۔ اس کا ضبط جواب دیتا جا رہا تھا۔ اس نے گہرا سانس لے کر سامنے پڑی فائل سامنے کی دومنٹ تک اوراق کو دیکھتا رہا۔ اکمل خاموشی سے اس کا بس جائزہ لے رہا تھا۔

ذریت میں اس کی وڈیو اس کے باپ کو بھیج دوں؟۔وہ خود ہی اس کا علاج نکال لیں گے۔ تمہیں اپنے ہاتھ کسی بھی گناہ میں گندے کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔سوچ سوچ کر وہ کہہ رہا تھا۔میں اپنے ہاتھ گندگی کو صاف کرنے کے لئے استعمال کروں گا۔۔۔اس کے چہرے پہ آخر ایک مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

اکمل اُلجھا۔۔۔

مطلب؟

عترافِ جرم۔۔وہ مسکرا دیا۔

اکمل نے ابرو اُٹھایا۔۔۔بس دیکھتے جاؤ۔وہ خود مانے گی۔کہ وہ قاتلہ ہے۔کہہ کر اس نے فائل بند اور وہیں ٹیبل سے کار کی چابی اُٹھاتا اکمل کا کندھا تھپ تھپاتا باہر نکل گیا۔

:::::::::::

دُھند آج صبح سے ہی پڑتی ہر چیز کو سوگوار سا بنا رہی تھی۔کم از کم اسے لان میں بیٹھے اطراف میں دیکھتے یہی لگا۔اس نے گہرہ سانس لے کر لان کا قدرِ ویران گوشا دیکھا تو وہیں جا بیٹھی۔

چاروں طرف سے امرودوں کے درخت اور انگوروں کی بیلیں اور کیاریوں میں جا بجا لگے سدا بہار کے خوش رنگ پھول۔اس نے مسکرا کر ایک پھول کو کیاری سے اُٹھایا جو اپنی ڈال سے الگ پڑا گویا اُداس تھا۔اسے لگا جیسے وہ پھول وہ خود ہو۔اس کے ہونٹ سوگواری سے مسکرائے تھے۔

تم بھی اکلیلے ہو؟اس نے مدہم آواز میں خود کو کہتے سُنا۔

ہاں۔۔۔میں بھی اکلیلی ہوں۔تمہاری طرح۔۔۔

سب رشتے تھے میرے پاس۔۔۔بس

بس ایک نادادنی انجانے میں ہوئی اور میں نے جیسے اُنہیں کھو دیا۔ آنکھوں میں جیسے ایک دم سے مرچیں چُبھنے لگیں۔ گلے میں آنسوؤں کا گولا اٹکا۔ اس نے ہونٹ بھینچ لئے۔

میرے گھر والے مجھے پتہ نہیں یاد کرتے ہوں گے بھی یا نہیں۔ پتہ نہیں اُنہیں پتہ بھی ہو گا میری حالت کا یا نہیں۔۔۔ آنسو اس کی آنکھوں سے آہستہ آہستہ پھسلنے لگے۔

بھائی۔۔۔ آپ نے کیا سوچا ہے؟ بابر نے ابرار کے کمرے میں آتے ہی پوچھا۔ تو ابرار جو لیپ ٹوپ پہ مصروف تھا۔ گھوما۔۔۔ وہ سوالیہ نظریں لئے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

کس بارے میں؟ ابرار جیسے نا سمجھ دکھا۔

بھائی۔۔۔ آپ اس طرح کب تک خاموش رہیں گے۔ کل ہم ان کو بھیج دیں گے۔ وہ اپنے گھر چلی جائیں گی۔ اور آپ کبھی اُنہیں اپنی بات نہیں کہہ پائیں گے۔ بابر کو اپنے بھائی کی اس قدر کم ہمتی پہ افسوس ہوا۔ وہ ہمیشہ سے چاہتا تھا۔ کہ ابرار جا کر فرح سے بات کرے۔ پر ابرار کی ایک ہی رٹ تھی۔ وہ مجھ پہ بھروسہ نہیں کرے گی۔ اس کی معصوم آنکھوں میں میرے لئے ناپسندیدگی میرے لئے جان لیوا ہو سکتی ہے۔ مگر بابر کو ایک بات سمجھ نہیں آتی تھی۔ کہ آخر بھائی کو کمپلیکس کس بات کا ہے۔ اسے یہی لگتا تھا۔

یار بابر اگر مجھے وہ ملنی ہو گی تو مل جائے گی۔ خامخواہ میں اس کی نظر میں بُرا نہیں بننا چاہتا۔ میں نے اللہ پہ چھوڑ دیا۔ ویسے بھی یہ سہی نہیں ہو گا۔ وہ ہمارے گھر پناہ لینے آئی ہے۔ وہ کیا سوچے گی۔ ابرار نے بڑے تحمل سے جواب دیا۔ تو بابر منہ بنا کر رہ گیا۔

آپ میری سمجھ سے باہر ہیں بالکل۔۔۔ اس کے منہ بگاڑنے پہ ابرار مسکرا دیا تھا۔

اچھا۔۔۔ چلو ابھی نکلو باہر۔ خامخواہ تنگ کر رہے ہو۔ جو ہو گا وہی اللہ کا لکھا سمجھ کے قبول کروں گا۔ میں فرح کا دل نہیں دُکھا سکتا۔ اس نے بظاہر لاپروائی سے کہا تھا۔ مگر باہر لان میں بیٹھی فرح خان کا دل جیسے سُکڑ کر پھولا۔۔۔

اس نے ایک ایک لفظ ان دونوں کا سُنا تھا۔اور جیسے جیسے بات سمجھ آتی جا رہی تھی۔ جیسے عصاب کام کرنا بند ہوتے جا رہے تھے۔

وہ۔۔۔وہ

میں۔۔۔

میں؟

اسے جیسے یقین ہی نہ آیا۔ آنکھوں میں بے یقینی کیا انتہا تھی۔ آنسوں میں مزید شدت آئی۔ تو وہ تیزی سے کپکپاتی ٹانگوں کے ساتھ وہاں سے فوراً اٹھ کر باتھ روم کی طرف بھاگی۔

کیونکہ ایک وہی سہی جگہ تھی رونے کی۔

::::::::::::

ماہ نور نے اطراف کا جائزہ لیتے بہت ستائش سے فرح کے ڈرائینگ روم کو دیکھا۔

بابر سامنے کے صوفے پہ بیٹھا فون پہ مسلسل مگن تھا۔ جبکہ ابرار ابھی کچھ دیر پہلے کوئی اہم کال سُننے کو باہر نکلا تھا۔

بابر بھائی۔۔۔آپ کو ایتھکس نہیں ہیں؟ ٹانگ پہ ٹانگ جمائے قدرِ صبر کا گھونٹ پیتے اس نے کہا تو بابر نے بڑی بے نیازی سے مسکرا کر شانے جھٹکے۔ تھے پر سارے تم کو دے دئے۔

کمال ہے۔ وہ منہ بنا کر رہ گئی۔

وہ لوگ فرح کو اس کے گھر لے کر آئے تھے۔ چونکہ منصوبہ بندی رات میں ابرار نے کی تھی۔ ماہ نور کو لگا فرح اس سے ناواقف ہی رہی۔۔۔ مگر جب اسے ایک لمبے سفر کے بعد اس کے گھر کے گیٹ کے سامنے لا کر کھڑا کیا گیا تو جیسے اُلجھ گئی۔۔۔اس نے کچھ نہیں ظاہر کیا۔ کہ وہ جانتی تھی وہ لوگ کہاں جا رہے ہیں۔ وہ یہی چاہتی تھی۔

ماہ نور نے اسے کچھ نہیں بتایا تھا۔ ہاں سوائے اس کے کہ ضیاء کے خلاف کس مزدور نے کمپلین لکھوائی تھی۔ جسے کافی سنجیدگی سے لیا جارہا تھا۔ اور اس پہ چھوٹے موٹے مقدمات بھی ہو رہے تھے۔

وہ لوگ جانتے تھے۔ کہ بڑی مچھلی کا چھوٹے کانٹے سے کچھ نہیں بنے گا۔ اس لئے۔۔۔ اب کی بار اُنہوں نے باضابطہ طور پہ ایک مضبوط منصوبہ بندی کے تحت اسے پہ کرپشن، اور منشیات کی فرشی کے کیس میں اُلجھایا تھا۔ جس کی سزا کم سے کم اس کی آگے کی زندگی جیل تھی۔

بس اُنہیں ایک مضبوط گواہ کی ضرورت تھی۔ جو ان کے بیچ میں سے ہی ہوتا۔

اسفند اسی پہ کام کر رہا تھا۔

فرح کے گھر میں اس وقت کوئی مرد حضرات میں سے موجود نہ تھا۔ ملازم اُنہیں ڈرائینگ روم بیٹھا۔ کر خان صاحب کو فون کا کہہ کر چلا گیا تھا۔ فرح بھی اندر سیدھی بھاگی تھی۔ اب وہ تینوں بیٹھے ارد گرد دیکھ رہے تھے۔

فرح نے آہستہ سے امی جی کے کمرے کا دروازہ دھکیلا تو وہ جیسے کھولتا چلا گیا۔۔۔

نیم تاریک کمرے میں اس کی آنکھیں جیسے سامنے کرسی پہ بیٹھے وجود ہی ٹِکی تھیں۔ بڑی بیگم کی ٹانگ پہ پلاسٹر چسپاں تھا۔ اور وہ ذرد رنگت کے ساتھ اسے ہی دروازے میں کھڑا دیکھ رہی تھیں۔

فرح نے ایک نظر خاموش گھر پہ ڈالی اور پھر ہونٹ کاٹتی نے ایک تیز بتی جلادی۔

لمحوں میں سارا منظر واضح ہوا۔۔۔

بڑی بیگم جو اندھیرے میں اس کے چہرے پہ غور کرنے کی کوشش میں ہلکان ہوچھنے ہی والی تھیں۔ کمرہ روشن ہو جانے پہ ٹھٹکیں۔ فرح آنکھوں میں بے بسی کے آنسو لئے۔ اُنہیں دیکھ رہی تھی۔

اور وہ اسے۔

فری۔۔۔ ہونٹ آہستہ سے کپکپائے۔ فرح کی آنکھ سے ایک آنسو نکل کر گال پہ لڑھک گیا۔

For more visit (exponovels.com)

امی۔۔۔وہ تیزی سے ان کی جانب بڑھی۔اوران کی ٹانگ کا خیال کرتے محض ہاتھ پکڑ کر رونے لگی۔

وہ حیرت وبے یقینی سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ جبکہ فرح رونے میں مصروف تھی۔

تم۔۔۔

تم کیسے؟

کیسے آئی؟انہیں جیسے یقین ہی نہ ہو۔

مجھے آنا ہی تھا امی۔اس نے روتے ہوئے شکستگی سے کہا۔توانہوں نے جھٹکے سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھوڑا لیا۔فرح کی آنکھوں میں خوف اُبھرا۔دُھتکار دینے کا خوف۔

کیا لینے آئی ہو اب۔لہجے میں جلال لئے وہ پوچھ رہی تھیں۔

امی۔۔۔اس کے رونے میں مزید شدت آئی۔اس نے ان کا ہاتھ دوبارہ پکڑنا چاہا توانہوں نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

فرح خان۔۔۔میں پوچھ رہی ہوں کیا لینے آئی ہو؟

جس کے لئے بھاگی تھی۔کیا وہ بھی ساتھ آیا ہے؟

یا اس نے بھی کچرا سمجھ ک نکال دیا۔وہ کیا کہہ رہی تھیں۔فرح کا دل دہک رہ گیا۔

امی آپ۔۔۔

کیا میں؟

تم نے اسی لئے تو چھوڑا تھا یہ گھر۔۔۔خان جانتی ہو کتنا روئے تھے۔تم نے انہیں کہیں کا نہیں چھوڑا۔

اب کیوں آئی ہو۔۔۔

For more visit (exponovels.com)

نکل جاؤ۔ ہم تمہیں نہیں جانتے۔ تم میرے رضا کے ساتھ ہی مر گئی تھی۔ ایک آنسو اب کی بار نکل کر ان کی گال پہ پھسل گیا۔

امی میری بات سُنیں۔ میں

میں نے نہیں کیا کچھ بھی۔ میں تو۔۔۔

صفائی کا وقت نہیں ہے فری۔ جاؤ۔ ساری صورتِ حال اس کی سمجھ سے باہر تھی۔ وہ بے بسی سے ان کے قدموں میں بیٹھ کر رونے لگی۔

::::::::::

روتے ہوئے وہ کمرے سے نکل کر لاؤنج کی سمت بھاگی تھی۔ جبھی بابا اندر داخل ہوئے تھے۔ اور فرح کو سامنے دیکھ کر ان کے قدم ساکت ہو گئے۔

فرح روتے ہوئے صوفے پہ بیٹھ چکی تھی۔ اور اس نے منہ پہ ہاتھ رکھ کر اپنی سسکیوں کا گلا گھونٹا ہوا تھا۔ کہ ڈرائینگ روم میں بیٹھے افراد تک اس کی آواز نہ پہنچ جائے۔

تم کس کے ساتھ آئی ہو؟ ہاتھ میں ہینڈ کیری پکڑے۔۔۔ سیاہ کوٹ سوٹ میں ملبوس بابا کو دیکھ کر ان کی آواز سُن کر وہ روتی سیدھی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ نظر خود بخود ہی جھک گئ۔

ابھی کچھ دیر پہلے امی جان نے جو الفاظ اس سے کہے تھے۔ اور جو اس کے بھاگنے کی وجہ بتائی تھی۔ اس نے اسے شرم سے پانی پانی کر چھوڑا تھا۔

اسے لگا تھا۔ وہ جو گھر سے پھوپو کے ساتھ جا کر اپنے آپ کو ایک ان دیکھی کھائی میں گرنے سے بچا رہی ہے۔ اسے اب اندازہ ہوا تھا۔ وہ احمق تھی۔

اس کے جانے کے اگلے روز چچی جان نے سب گھر والوں سے جھوٹ بولا۔اور دعوا کیا کہ فرح نے فون کر کے اپنے نکاح کی خبر دی ہے۔اور کہا ہے۔کہ اب وہ کبھی لوٹ کر نہیں آئے گی۔امی جان نے جس لہجے میں کہا تھا۔فرح نے موت مانگی تھی۔اسے اندازہ نہیں تھا۔کہ چچی اس سے اتنا کیوں نفرت کرتی ہیں۔کیوں اس سے خار کھائے بیٹھی ہیں۔مگر وہ اس قدر انتہا پہ پہنچ جائیں گی اس نے سوچا بھی نہ تھا۔اس کا دماغ پھٹنے کے قریب تھا۔

وہ تیزی سے آگے بڑھی اور بابا کے کندھے سے جا لگی۔

اللہ کی قسم بابا جان جیسا چچی جان نے جو آپ سب سے میرے بارے میں کہا سب جھوٹ تھا

میں۔۔۔میں کسی کے لئے نہیں گئی تھی۔

میں۔۔۔میں تو۔۔۔

فرح۔۔۔وہ جو کب سے ان کے ساتھ کھڑی رو رہی تھی۔روکی۔

مہمان کون آئے ہیں؟اور تم کس کے ساتھ آئی ہو۔ان کے لہجے میں سرد مہری تھی۔فرح محسوس کر کے پیچھے ہٹی۔

ماہ نور۔۔۔اس نے اٹکتے ہوئے کہا۔تو وہ اس کی جانب دیکھے بغیر ہی آگے بڑھ گئے۔

اس نے سانس روک کر انہیں جاتے دیکھا اور واپس بیٹھ گئی۔۔۔

____

تمہیں یقین ہے۔کہ یہی ہے وہ؟

اسفند نے کار کے شیشے سے قدرِ حیرت سامنے کھڑے وجود کو دیکھا۔

جی سر پکی خبر ہے۔دوسری طرف سے کہا گیا۔تو اسفند کے پہ چہرے پہ مسکراہٹ گہری ہوئی۔

اچھا ٹھیک ہے۔

For more visit (exponovels.com)

اس نے پہلو میں بیٹھے ایس پی امران کو دیکھا۔ جو گرلز کالج کی پرینسپل سے فون پہ گفتگو میں مصروف تھا۔

اسفند نے اس کے اشارے پہ کار آگے بڑھادی۔ اور وقفے وقفے سے اس نظر ناچاہتے ہوئے بھی گیٹ کی جانب جانب اُٹھ رہی تھی۔

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

فرح نے ہاتھوں کی انگلیاں چٹخاتے ایک نظر ڈرائنگ روم کے بند دروازے کو دیکھا اور کیچن کی جانب بڑھ گئی۔ ملازمہ سے چائے بنوانے کے دوران اسے علم ہو چکا تھا۔ کہ چچی جان اور چچا نے اس کے جانے کے بعد گھر الگ کر لیا تھا۔

گھر میں اس کے جانے کے بعد کافی لڑائی کے بعد چچا جان نے چچی کی ہڈدھرمی دیکھ کر ہی الگ گھر کا فیصلہ کیا تھا۔ کیونکہ چچی جان کو اب اس گھر اور وہاں کے افراد سے بُو آنے لگی تھی۔ ہر وقت کی خاندانی سیاست اور لڑائی جھگڑے نے انہیں اپنے بھائی سے الگ ہونا پڑا۔ جس کا دکھ بڑے خان کو بھی تھا۔ اور شدید تھا۔

فرح کو افسوس ہوا تھا سُن کر۔ بابا کی چچا جان سے محبت و یگانگت کی مثال تو سارا خاندان دیتا تھا۔ اب ایک زبان اور ایک انتہائی قدم نے سارے خاندان کی جڑ اکھیڑ کر رکھ دی تھی۔ فرح کی تکلیف میں اضافہ ہوا۔

ماہ نور خاموشی سے ابرار کو سُن رہی تھی۔ جو بڑے خان کے سامنے ٹانگ پہ ٹانگ رکھے۔ بہت بردباری اور تحمل سے لاہور میں درپیش آنے والے واقعات کی تفصیل بتا رہا تھا۔

انکل آپ کی عزت کی حفاظت ہم نے اپنی عزت سمجھ کر کی۔ وقت و حالات آپ کے گھر کے جو بھی تھے۔ میں نہیں جانتا۔ اور نہ میں ان کی تفصیل میں پڑوں گا۔ آپ کی بیٹی میری بہن کی دوست ہے۔ اس کے ہوسٹل سے ہمارا گھر زیادہ دور نہیں ہے۔ میرا خیال ہے۔ کہ ایک ایسی جگہ سے جہاں عزت جانے کا خطرہ تھا۔ اُنہوں نے ایک سوچ سمجھ کا فیصلہ کیا۔

ضیاء پہ پہلے بھی بہت سے کیس ہیں۔ اور اب تو منشیات فروشی بھی شامل ہو چکی۔ پولیس اس کیس میں خود کافی دلچسپی لے رہی ہے۔ اور یہ معملہ اللہ نے چاہا تو لٹکے گا نہیں۔۔۔

برخوردار تم اتنا اس معملہ سے کیوں اُلجھ رہے ہو۔ حالانکہ یہ تمہارا مسلہ تو نہیں ہے۔ تھوڑی پہ شہادت کی انگلی رکھے۔ خاموش بیٹھے خان نے پوچھا۔ تو وہ جو بول رہا تھا لمحے کو چپ ہوا۔

خان قوم کی عزت کسی ایک فرد سے منسوب نہیں ہوتی۔ ہر فرد سے ہوتی ہے۔ میں نے آپ سے پہلے بھی کہا تھا۔ آپ کی عزت ہماری۔۔۔ اس نے کمال عتماد سے مسکرا کر جواب دیا۔ تو دائیں جانب کے سنگل صوفے پہ بیٹھی ماہ نور کہ چہرے پہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

اللہ میرے بھائی کو نظر نہ لگ جائے۔ کتنی پیاری باتیں کرتے ہیں۔ ماہ نور نے سوچ کر سر جھٹکا تھا۔

ہم۔۔۔ مگر تم اپنا اتنا قیمتی وقت اور عزت داء وپہ کیوں لگا رہے ہو۔ ابرار کی بات نے اُنہیں اگرچہ متاثر کیا تھا۔ مگر وہ اس وقت ایک بیٹی کے باپ تھے۔ اور بہت کا سوچ رہے تھے۔

انکل آپ ایک بیٹی کے والد ہیں۔ آپ کی پریشانی اور فکر سے میں بخوبی آگاہ ہوں۔ اب کی بار ماہ نور بولی تھی۔ خان نے گرد موڑے بغیر محض نظریں پھیر کر اسے دیکھا۔

ماہ نور کو ان کی آنکھوں میں سخت تاثر نظر نہیں آیا تھا۔ اس کا عتماد مزید بڑھا۔ وہ مسکرائی۔

میرے بابا بھی آپ ہی کی طرح میرے لئے پریشان ہوا کرتے تھے۔ میں دس منٹ بھی کالج سے لیٹ ہو جاتی۔ تو وہ خود گاڑی لے کر کالج کے باہر آ کھڑے ہوتے تھے۔ اس لئے آپ کی کیفیت میں نے ان کے چہرے پہ بہت بار دیکھی ہے۔ اور میں سمجھتی بھی ہوں۔

انکل میں آپ کے سامنے اپنے خاندان یا اپنے بھائی کی پاکبازی پہ کوئی تقریر نہیں کر سکتی۔ نہ میرے بھائی کوئی نبی ہیں جن کی پاکبازی کی گواہی آسمان سے آئے۔

وہ کہہ رہی تھی۔ اور ابرار سر جُھکائے محض سُن رہا تھا۔ خان نے اسے ٹوکا نہیں بس خاموشی سے بولنے دیا۔

For more visit (exponovels.com)

انکل میں آپ سے جو خواہش اور گزارش کرنے جا رہی ہوں۔ میں نہیں جانتی وقت ٹھیک پہ کر رہی ہوں یا۔ میری بات سن کر آپ کا ذہین کیا ردِ عمل دے گا۔ بہر حال آپ سوچ سمجھ کر خواب دیجیئے گا۔۔۔ کہتے ہوئے وہ ایک لمحے کو رکی۔ بابر آنکھوں میں نا سمجھی لئے اسے دیکھ رہا تھا۔ ابرار کا سر جھکا ہوا تھا۔ اس نے بابر کو دیکھا۔ اور مسکرا کر ایک بار پھر سے خان کو دیکھا۔

انکل میں فرح کو اپنی بہترین دوست کو اپنے خاندان کی عزت بنانا چاہتی ہوں۔ اس کی عزت کی پاکبازی کی گواہی میں دے سکتی ہوں۔ اور اس کے تمام گھریلو حالات سے محض میں ہی واقف ہوں۔ اس لئے انکل آپ مجھے میری خواہش کا جواب بہت سوچ کر دیجیئے گا۔ اور یہ یقین رکھیں کہ اس میں میرے بھائی کی نئیت شامل نہیں ہے۔ یہ میری خوہش ہے اور کیونکہ میں ہی ہوں جو ان کے لئے سوچنے والی ہوں اس لئے مجھے ہی آپ سے بات کرنی پڑی۔ اس نے تفصیل سے اور مکمل عتماد دیتے ہوئے ہر بات کہی تھی۔ اور اس عرصے کے دوران ابرار جس کے چہرے پہ ہوائیاں اُڑی ہوئیں تھیں۔ اس نے غلطی سے بھی نظر نہیں ڈالی تھی۔

بڑی خان نے چہرے پہ بغیر کوئی تاثر دئے بہت تحمل سے اس کی بات سُنی۔ اور آخر میں ایک نظر ابرار کو بھی دیکھا۔ ابرار نے شرمندگی سے چہرہ جھکا لیا۔

انکل۔۔۔ سوچ۔

بیٹا میں فرح کی والدہ سے مشورہ کر کے بات کروں گا۔ مگر اس سے پہلے میں آپ سے ایک بات پوچھوں گا۔ اور آپ ہی مجھے اس کا جواب دیں گیں۔

جی انکل۔۔ وہ سیدھی ہوئی۔

کیا فرح اس رشتے پہ راضی ہے؟ سوال پوچھنے کا انداز جو بھی تھا۔ مگر ماہ نور کی ایک بیٹ مس ضرور ہوئی تھی۔

انکل یہ تو آپ پوچھیں گے اس سے۔ بڑے آپ ہیں۔اور میرا خیال ہے۔کہ اس کا حق بھی آپ کو ہی حاصل ہے۔کہ آپ اس کے لئے کیا فیصلہ کرتے ہیں۔ مسکرا کر اس نے کہا۔تو وہ بھی سیدھے ہو گئے۔اور تبھی باتوں کے دوران ملازم چائے لے آیا تھا۔باقی کا وقت بہت خاموشی سے ہلکی پھولکی باتوں میں کٹا۔

اس کے ماتھے پہ انگنت بل تھے۔اور وہ لان میں تقریباً بیس چکر لگا چکا تھا۔

ماہ نور فون اُٹھاءو۔فون کان سے لگائے وہ دانت پیس رہا تھا۔اس کے جبڑے تنے ہوئے تھے۔اور اس کا بس نہیں چل رہا تھا۔کہ ماہ نور تک اُڑ کر پہنچ جاتا۔

بیٹا۔۔آپ چائے پیئیں۔میں ماہ نور بیٹی کو فون کرتا ہوں۔وہ ماہ نور کے گھر پہ تھا۔اور کوئی فرد گھر پہ موجود نہ تھا۔پریشانی سے اسے چکر لگاتے دیکھ کر گارڈ نے کہا تو وہ گہرہ سانس لے کر رہ گیا۔

گھر پہ کوئی ملازم یا ملازمہ نہیں ہے بابا؟

نہیں۔۔۔بس میں ہی ہوں۔ابتسام صاحب کی وفات کے بعد ابرار پُتر نے سب ملازمین کو بھیج دیا تھا۔گارڈ ڈھلتی عمر کا سفید داڑھی موچھ والا قدرِ پست قد کا مالک باریش شخص تھا۔کندھے پہ بندوق لٹکائے اس نے قدر تحمل سے بتایا۔تو ذریت نے ایک نظر گھر کے داخلی حصے کو دیکھا۔اور ہاتھ میں پکڑا فون سائڈ کے بٹن سے بند کرتا آگے بڑھ گیا۔

بابا جب وہ لوگ آئیں تو انہیں بتا دیجئے گا۔کہ میں آیا تھا۔اور یہ بھی کہیئے گا۔کہ میں رات میں فون کروں گا۔اپنی پورچ میں کھڑی سیاہ کار کی جانب جاتے اس نے سرد لب و لہجے میں کہا۔تو ملازم سر ہلا گیا۔

اس نے وہاں سے نکلنے میں لمحہ نہیں لگایا تھا۔

اب اسے اندازہ ہو رہا تھا۔کہ وہ اسے اگنور کر رہی تھی۔اس کی سٹیرنگ وہیل پہ گرفت سخت ہوئی۔

عورتوں کا مزاج بڑا شاہ قسم کا ہوتا ہے۔کب کونسی بات ان کے مزاج پہ گراں گزرے مرد سمجھ نہیں سکتا۔

دادی نے کہا تھا۔ کہ وہ ناراض ہو کر نہیں گئی۔ پر اب اسے لگ رہا تھا۔ کہ وہ ناراض ہو کر ہی گئی ہے۔ بلکہ شائد سارے رشتے ناتے توڑ گئی ہے۔

احمق عورت۔۔۔۔ بے اختیاری میں اس کے منہ سے یہی نکلا تھا۔ کیا تھا جو ایک بار فون اُٹھا کر بات سن لیتی۔

اس کا بس نہیں چل رہا تھا۔ کہ نتاشا کو آگ لگا دیتا۔ اس نے کار اکمل کے دفتر کی جانب موڑ دی۔ وہی تھا جو اس کی بات سمجھ سکتا تھا۔

اس نے کالج کے گیٹ سے نکل کر اطراف میں نگاہ دوڑائی۔۔۔ اور وہیں کچھ فاصلے پہ سیاہ کار کو دیکھ کر آنکھوں پہ چشمہ چڑھاتی بازو پہ لٹکا ہینڈ بیگ سنبھالتی آگے بڑھی۔

اپنی گاڑی کی سیٹ سے ٹیک لگائے سگریٹ پیتے اسفند نے آنکھیں سکیڑ کر گیٹ سے نکل کر کار کی جانب جاتی سرخ ٹوپ اور سیاہ جینز والی نتاشا کو دیکھا تھا۔ وہ سکون سے بیٹھا محض اسے دیکھتا رہا۔ اس نے کار کا نمبر نوٹ کر لیا تھا۔ اور پولیس آفس میں کمپیوٹر پہ بیٹھے جوان کو موصول بھی ہو چکا تھا۔

نتاشا اپنی موت کا خود وسیلہ پیدا کر رہی تھی۔ اسے خود بھی معلوم نہ تھا۔

نتاشا کے بیٹھتے ہی چل چلاتی دھوپ میں کھڑی گاڑی کے تمام شیشے اوپر ہوئے۔ اور کار چلاتا ملازم زن سے گاڑی بھگاتا لے گیا۔ اسفند نے بہت سکون سے انہیں جاتے دیکھا۔ اور سگریٹ کے کش پہ کش لگاتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں پہچان کی جو رمق نتاشا کو دیکھ کر ابھری تھی۔ وہ اب رفتہ رفتہ ماند پڑنے لگی تھی۔ وہ آگے بڑھ چکا تھا۔ شادی کر چکا تھا۔ اسے اس کی تمام سیاہ کاریاں بھی معلوم ہو چکی تھیں۔ مگر افسوس کے دل کبھی کبھی پھر بھی اسے کی جانب جھکنے پہ آمادہ ہوتا تھا۔ اس کا دل چاہتا تھا۔ وہ اپنے دل کے اس حصے کو نوچ کر پھینک دے۔ جس میں کہیں نتاشا کا عکس جزب تھا۔ اس کی تصویر دھندلا گئی تھا۔ مگر وہ جو اس کا اسیر رہا تھا۔ اس کی یاد کو دل سے ذہن سے نکالنے کی کوشش کرتا بھی تو مشکل میں پڑ جاتا

تھا۔ وہ اپنی نائلہ کے ساتھ بالکل مخلص تھا۔ اس کے ساتھ کافی حد تک خوش بھی تھا۔ مگر نتاشا کسی کانٹے کی طرح اس کے گل میں اٹکی تھی۔ جو نکلنے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔

گاڑی کی دھول بیٹھ چکی تھی۔ جب وہ آگے بڑھا تھا۔ آگے کا کام امران کا تھا۔ وہ خاموشی سے گھر کی جانب جانا چاہتا تھا۔ اپنی بیوی کے ہاتھ کی چائے پی کر سونا چاہتا تھا۔ اور بس۔۔۔

گاڑی کو آگے لے جاتے سٹئیرنگ ویل گھماتے اس نے بیک ویو مرمر سے ماہ نور کے کھلا کھلاتے چہرے کو دیکھ کر ایک ابرو اُٹھ کر پوچھا۔ تو ماہ نور کی مسکراہٹ گہری ہوگئی۔

سرپرائز تھا بھائی۔۔۔ کیسا لگا میرا سرپرائز؟ وہ معصوم تھی۔ اور بالکل اسے گڑیا ہی لگی۔ بابر نے ناک سے مکھی اُڑا کر ماہ نور کو چہرہ موڑ کر دیکھا۔

میری محنت تو کوئی اہمیت رکھتی ہی نہیں۔

ہاں آپ بس فوراً جلنا شروع کر دیا کرو۔ جل کُکڑے۔۔۔ بابر کو ناک چڑھاتا دیکھ کر ماہ نور کو ہنسی آئی تھی۔

تم بھی شامل تھے اس مادام کے ساتھ۔۔۔ ابرار کا ہاتھ فوراً بابر کی گردن کی طرف گیا۔ وہ فوراً پیچھے ہوا۔

بھائی اللہ کا واسطہ ہے۔ پہلے سلامت گھر پہنچا دو۔ پھر میری پتلی گردن پہ جتنا ظلم کرنا ہو کر لینا۔ ایسے موقعوں پہ بابر ہمیشہ مظلوم بن جایا کرتا تھا۔

اچھا جی۔۔۔ آپ کی تو بیٹے خیر نہیں۔۔۔ گھر کی طرف جاتے۔ وہ تینوں بہت خوش تھے۔ فرح کو اس کے گھر چھوڑ کر اور اس کے والدین سے فرح اور ابرار کے رشتے کی بات کر کے ماہ نور کے کندھے سے بھاری پتھر ہٹ گیا۔ آج وہ بابا کی وفات کے بعد کافی دن بعد دل سے خوش ہوئی تھی۔ وہ تینوں ہی خوش تھے بس ابرار ظاہر نہیں کروا رہا تھا۔

پر اس کا انگ انگ بتا رہا تھا۔ وہ مسرور ہے۔

بھائی ویسے یہ ٹیڈی بڑی میسنی ہے۔اس کو آپ کا سیکرٹ پہلے ہی پتا تھا۔شائد میرے سے بھی پہلے۔۔۔بابر نے اشارہ کرتے کہا تو ماہ نور کا قہقہ گاڑی میں گونجا تھا۔

کونسا سیکرٹ ؟ابرار نے گڑبڑا کر بابر کو دیکھا تھا۔اس نے فوراً ہونٹ دبائے۔

بھائی گاڑی دھیان سے چلائیں۔گھر جا کر آپ کو ابھی بہت حساب چُکانے ہیں۔ماہ نور نے فوراً الفاظ اُچک کر کہا تھا۔ماہ نور کے لہجے سے شوخی جھلک رہی تھی۔ابرار نے بے اختیار ہنس کے ایک ہاتھ سے کار چلاتے دوسرے ہاتھ سے آنکھوں پہ لگا فریم لیس چشمہ درست کیا۔گویا شرمندہ ہو۔

ویسے ماہا تمہیں پتہ کیسے لگا تھا؟اور کب؟بابر اب کی بار پورا پیچھلی سیٹ کی جانب موڑا۔۔۔ماہ نور نے جواب میں آنکھیں گھومائیں تھیں۔

جب میں بیمار ہونے کے بعد گھر آئی تھی۔آپ دونوں آفس گئے ہوئے تھے۔میں ابرار بھائی کا روم صاف کرنے گئی تھی۔تبھی۔۔۔اس نے مسکراہٹ دبا کر بتایا اور ساتھ ہی خوشی سے روشن ہوتے ابرار کے چہرے کے عکس کو دیکھا تھا۔

اللہ میرے بھائی کو ہمیشہ خوش اور مطمئن رکھئے گا۔اس کے دل نے بے اختیار دعا کی تھی۔

توبہ۔۔۔بابر نے فوراً کانوں کو ہاتھ لگائے۔۔۔بھائی یہ چورنی۔۔۔ہمارے پیچھے سے ہمارے کمرے کی تلاشیاں لیتی ہے۔

اللہ معاف کرے۔۔۔بابر بھائی آپ کو تو ایکٹر ہونا چاہئے تھا۔قسم سے بہت آگے جاتے۔ماہ نور نے بدمزہ ہو کر بے اختیار کہا تھا۔

میرا بھی یہی خیال تھا۔پر گھر والوں نے مجھے سنجیدہ ہی نہیں لیا۔ان دیکھے آنسو صاف کرتے اس کی اداکاری عروج پہ تھی۔ابرار نے گاڑی چلاتے بائیں ہاتھ سے اس کی گردن پکڑ کر ہلکے سے دبائی تھی۔بابر کے منہ سے ایک کراہ نکلی۔اور پیچھے بیٹھی ماہ نور ہنستی چلی گئی۔

بھائی میں اگر ایسے ہی مر گیا ناں۔تو اللہ نے آپ کا حساب الگ سے لینا ہے۔

خود تو شادی کرنے لگے ہیں۔اب میری باری جو اللہ کر کے آنے لگی ہے۔تو مجھے ہی مارنے پہ تُلے ہیں۔اس نے منہ بنا کر کہا تو ابرار کی مسکراہٹ ایک بار پھر گہری ہوئی تھی۔اس نے ساتھ ہی اس کی گردن بھی چھوڑ دی۔

نہیں مرتے تم حسرتیں لے کر۔بے فکر رہو۔۔۔آخر ابرار نے کہا تو بابر بھی ہنس دیا تھا۔

سارے سفر کے دوران وہ لوگ ایسی ہی چھوٹی چھوٹی شرارتیں کرتے اور باتیں کرتے آئے تھے۔لمبا سارا سفر کیسے طے ہوا پتہ بھی نہ چلا تھا۔اور گھر پہنچ گئے تھے۔

:::::::::::

فرح نے ٹیبل پہ کھانا لگا کر۔۔۔ایک نظر سامنے لگے گھڑیال کو دیکھا۔اور شش وپنج میں اُلجھتی سر پہ دوپٹہ لیتی کمرے کی جانب بڑھی۔

کمرے میں خاموشی تھی۔اس نے ہلکے سے دروازے پہ دستک دی اور پھر اجازت ملنے پہ دروازہ آہستہ سے دھکیل دیا۔

امی جی بیڈ پہ دراض تھیں۔اور بابا کسی فائل کی ورق گردانی میں مشغول معلوم ہوئے۔اسے اندر آتا دیکھ کر اُنہوں نے آنکھوں سے چشمہ ہٹا کر رکھ دیا تھا۔وہ نظر جُھکا کر اُنگلیاں چٹخانے لگی۔

وہ۔۔۔بابا۔

ک۔۔۔کھانا لگایا ہے۔میں نے۔۔۔اس نے اٹک اٹک کر ذرا گھبراتے ہوئے کہا تو وہ محض غور سے اُسے دیکھتے ہی رہے۔

ٹھنڈا ہو جائے گا۔آپ اور امی آجائیں۔۔۔اس نے کہنے کے دوران ایک بار بھی سر اُٹھا کر اُنہیں نہیں دیکھا تھا۔

وہ بس اُنگلیاں چٹخاتی رہی۔وہ جانتی تھی۔وہ اسے دیکھ رہے تھے۔اس کا حلق خشک ہو رہا تھا۔اس نے نظر گھما کر امی جی کو دیکھا۔جو آنکھیں بند کر چکی تھیں۔فرح کو افسوس ہوا۔

وہ اپنی ماں سے کبھی کوئی تکلیف نہیں شئیر کر سکی تھی۔اور اب حالت یہ تھی۔کہ کوئی کندھا میسر نہیں تھا۔

For more visit (exponovels.com)

بیٹھ جاؤ۔۔۔کچھ سوچ کر اُنھوں نے اسے کہا۔تو وہ خاموشی سے دائیں جانب پڑے سنگل صوفے کی جانب بڑھ گئی۔ جیسے اسی بات کی منتظر تھی۔

مجھے آپ سے لاہور میں ہونے والے تمام واقعات سُننے کی اگرچہ ضرورت نہیں ہے۔میں سب جانتا ہوں۔ مگر میں پھر بھی آپ سے کہوں گا۔ کہ مجھے وہاں کے حالات کے بارے میں بتائیں۔اُنھوں نے اس کی گھبراہٹ دیکھ کر بہت نرمی سے کہا تھا۔فرح کو ان کا دوپہر کا لہجہ یاد آیا۔تو اندر جیسے دل ڈوب کر اُبھرا۔اس نے گہرہ سانس لے کر ایک ایک لفظ بتانا شروع کیا۔اب کی بار وہ بتانے کے دوران رو نہیں رہی تھی۔

شائد ایسا اس لئے تھا۔کیونکہ وہ خوفزدہ تھا۔کہ اگر اس بار وہ خاموش رہی۔کچھ ایسا نہ بتا سکی جو اہم ہو۔تو شائد وہ اپنی صفائی زندگی بھر نہ دے سکے۔ کبھی نہ بتا سکے کہ وہ ہر طرح کی صورتِ حال میں مظلوم تھی۔اس نے کوئی گناہ کوئی غلطی جانبوجھ کر اُنہیں ستانے کو یا نفس کے بہلانے پہ نہیں کی تھی۔

اس کی گفتگو کے دوران امی جی بھی اُٹھ بیٹھی تھیں۔خان نے اسے ایک سیکنڈ کے لئے بھی خاموش ہو جانے کا نہیں بولا۔بس خاموشی سے کرسی کی پُشت سے پُشت ٹکائے سُنتے رہے۔

وہ بھول چکی تھی۔کہ وہ کھانے کا کہنے آئی تھی۔اور یقیناً اب تک کھانا ٹھنڈا ہو چکا ہو گا۔

:::::::::::

ٹھیک ہے بچے۔۔۔اب آپ جاؤ۔میں اور آپ کی والدہ آتے ہیں۔اس کے خاموش ہو جانے پہ اُنھوں نے کہا۔تو وہ سر ہلا کر اُٹھ گئی۔اس نے ان کے جواب کا انتظار کیا تھا۔اور نہ ایسی کوئی خواہش۔۔۔وہ بس اُنہیں ایک بار سب کہنا،سب بتانا چاہتی تھی۔ حقیقت سے آگاہ کر دینا چاہتی تھی۔اس نے یہی کیا تھا۔اپنی کہہ کر اُنہیں ان کا موقع دیتی اُٹھ آئی۔

::::::::::::

زندگی میں اس نے بُرے سے بُرے حالات کے بارے میں تصور کیا تھا۔مگر

مگر منشیات فروشی میں بھی شامل ہو گی۔ یہ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ وہ ایک ایسی دلدل میں جا پھنسی تھی۔ جو اس کی سوچ سے کہیں زیادہ خطرناک تھی۔ اس نے گاڑی رُکنے پر آنکھوں سے چشمہ ہٹا کر ہاتھ میں پکڑا اور پھر گاڑی کا دروازہ کھولتی باہر نکل آئی۔

یہ ایک پُرانی شہر سے باہر بنی سکول کی عمارت تھی۔ جس کا داخلی دروازہ بہت خستہ حال تھا۔ ٹوٹی پھوٹی عمارت کی جانب جاتے اس کے قدم لمحے کو لڑکھڑائے تھے۔ مگر پھر صبح رامش سے ہونے والی لڑائی اسے یاد آئی تھی۔

وہ اسے پیسے دے کر طلاق لینے والی تھی۔ یہی اس کی شرط تھی۔ ڈیڈ نے ایک نئی گرل فرنڈ ڈھونڈ کر اس کے ذریعے سے ڈوبتے بزنس کو سنبھالنے کا منصوبہ بنا رکھا تھا۔ اور اسے اس کے حال پہ چھوڑ دیا تھا۔

ایسا نہیں تھا۔ کہ اُنہیں اس سے پیار نہیں تھا۔ وہ اس سے پیار کرتے تھے۔ مگر اس نے کبھی ان کو اتنی اجازت نہیں دی تھی۔ کہ وہ اس کی ذاتیات کو اپنی ذات سمجھتے۔ اور وہ بھی اپنے معملہ میں اس سے یہی توقع رکھتے تھے۔ اور اس چکر میں وہ سب ایک دوسرے سے الگ ہو کر کہیں خلاء میں چلے گئے تھے۔ وہ جس معاشرے کو پسند کرتے تھے۔ جس کو قابلِ فخر سمجھتے تھے۔ وہاں یہیں ہوتا تھا۔ سب کے مسائل اپنے تھے۔ کوئی کسی کے لئے پریشان نہیں ہوتا تھا۔ وہ بھی ایک دوسرے کے لئے نہیں تھے۔

اس نے سکول کی عمارت میں داخل ہونے کے بعد اطراف میں نظر دوڑائی۔ اور قدم ایک کمرے کے کھولے دروازے کی جانب قدم بڑھادئے۔

خستہ حال سکول میں گرد اور ٹوٹ پھوٹ کی علامتیں۔۔۔ اس بات کی گواہ تھیں۔ کہ عرصے سے وہاں سے کسی کا گزر نہیں ہوا۔ گرد پہ قدم بناتے وہ کمرے میں داخل ہوئی۔ نیم تاریک کمرے کے وسط میں ایک میز پڑی تھی۔ جس کے دائیں جانب کرسی پہ کوئی بیٹھا تھا۔ جس کے چہرے پہ سیاہ کپڑا لپٹا تھا۔ نتاشا کو اس کی آنکھوں کی سرخی دور سے ہی نظر آئی۔ اس کا دل سُکڑ کر پھولا۔ ہتھیلیوں میں پسینہ بھرا۔۔۔ اس نے حلق تر کرتے قدم آگے بڑھائے اور ہاتھ میں پکڑا بیگ میز پہ رکھ کر تیزی سے اندر پڑے پیکٹس باہر نکالنے لگی۔

اس کی ایک ایک حرکت کرسی پہ بیٹھے مرد کی نگاہ میں تھی۔اس کے ہاتھ کپکپا رہے تھے۔وہ دیکھ سکتا تھا۔

وہ اپنی جگہ سے اُٹھا اور آہستہ آہستہ سے۔۔۔مدھم مدھم جوتوں کی دھمک پیدا کرتا۔اس کی پُشت کی جانب بڑھا اور پیچھے جا کر کھڑا ہو گیا۔نتاشا کا سانس اٹکا۔اس کے ہاتھوں میں تیزی آئی۔پُشت پہ کھڑا مرد اس کی گھبراہٹ دیکھ کر مسکرایا۔اور اس کے چلتے ہاتھوں پہ اپنا ہاتھ رکھ کر جیسے کام کرنے سے روکا۔

نتاشا کا چلتا سانس رُکا۔خوف کی انتہا تھی۔اس کی آنکھوں میں پہلی بار ایک ایسا تاثر تھا جو وہ پہلے لوگوں کی نظروں میں دیکھ چکی تھی۔

ان کو ایسے ہی بیگ میں رہنے دو۔اس کے کان کے بالکل قریب وہ بولا۔تو نتاشا کی آنکھیں جیسے حیرت سے پوری کھل گئیں۔یہ۔۔۔یہ۔

آواز تو۔۔۔اسے لگا جیسے اس نے کسی اور کی آواز سُنی ہو۔اسے لگا وہ پاگل ہے۔ایسا کیسے ہو سکتا تھا۔اسے اپنے کانوں پہ شک گزرا۔

الفاظ تھے یا لہجہ۔۔۔وہ مڑی اور آنکھوں میں بے یقینی لئے اسے دیکھا۔

کیا ہوا؟

حیران نظر آ رہی ہو۔سامنے کھڑے شخص نے مسکرا کر کہا تھا۔اس کی سرخ انگارہ آنکھیں مسکرا رہی تھیں۔وہ رات بھر سے سویا نہ تھا۔اس کی آنکھیں گواہ تھیں۔

ت۔۔۔تم یہاں۔۔۔نتاشا کی آنکھوں میں بے یقنی تھی۔مگر لہجہ سب سے زیادہ بول رہا تھا۔

ہاں میں یہاں۔۔۔اور مجھے ہی یہاں ہونا چاہے تھا۔ہنستے ہوئے اس نے چہرے سے نقاب ہٹا دیا۔سیاہ نقاب ہٹا کر اس نے اسے کرسی کی جانب اُچھال دیا۔جو سیدھا ٹارگٹ پہ گرا۔۔۔

تم یہاں کیسے؟نتاشا کو خوف تھا۔پکڑے جانے کا رسوائی کا یا پھر کچھ اور۔۔۔

For more visit (exponovels.com)

تم جو کام کرنے آئی ہو۔اس کو کروانے والا میں ہی ہوں۔سو جسٹ چیل۔۔۔اس کی مسکراہٹ میں بہت کچھ بدلا تھا۔وہ پہلے والا شخص نہیں تھا جسے وہ جانتی تھی۔

وہ مسکراتا کچھ لمحے اسے دیکھتا رہا۔اور پھر جا کر واپس کرسی پہ بیٹھ گیا۔

تم میرے ساتھ کیا گیم کھیل رہے ہو؟نتاشا کا غرور برداشت کر گیا کافی تھا۔اس نے اب کی بار رعب سے پوچھا۔تو سامنے بیٹھا شخص ایک دم سے قہقہہ لگا کر ہنسا۔

کھیل؟

نتاشا بی بی کھیل تو شروع آپ نے کیا تھا۔ہم تو اس کے معمولی مہرے ہیں۔ہماری کیا مجال تھی۔جو ملکہ کے خلاف بغاوت کرتے۔۔۔سامنے بیٹھا شخص عجیب لب و لہجے میں مخاطب تھا۔

مگر انداز اب بھی پیادہ والے نہیں ہیں۔۔۔ایک ابرو اُٹھاتی وہ کہتی اس کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

جی۔۔۔کیونکہ طاقت کسی ایک کو وراثت میں نہیں دی جاتی۔کبھی آپ کی کبھی ہماری یہی زندگی کا اصول ہے۔یہی یہاں چلتا ہے۔۔۔وہ اس کے سامنے کھڑی تھی۔چہرے پہ کوئی تاثر نہیں تھا۔سامنے کھڑے شخص نے ایک جھٹکے سے اپنی جگہ چھوڑی اور اس کا مقابل کھڑا ہو کر دائیں بائیں بازو رکھ کر اس کا رستہ روکا۔اور جب بولا۔تو لہجے میں تلخی۔۔۔اس لہجے اور اس محبت کی چاشنی سے نابلد تھی۔جس کی نتاشا عادی تھی۔وہ خوف سے پیچھے ہٹی۔

اب کی بار بازی میرے ہاتھ میں۔۔۔اور اس بار کھیل کا فیصلہ میں کروں گا۔اس کے لہجے میں کاٹ تھی۔نتاشا کے چہرے کا رنگ متغیر ہوا۔۔

مبارک ہو نتاشا بی بی۔۔۔فیصلے کا دن آ گیا۔آپ کے لئے حشر کا دن سمجھیں آج ہی ہے۔وہ اپنی جگہ پہ کھڑا کہہ رہا تھا۔لہجہ مدھم سرگوشی کرتا تھا۔مگر محسوس کرو تو جیسے سرد و سخت۔۔۔چھو کر دیکھو تو لاوے کی طرح پکتا۔۔۔پھٹنے کو بے تاب۔۔۔

ک۔۔۔کیا مطلب؟

ظلم کرکے بعد میں مطلب پوچھنے والے تم مجبوب صفت لوگوں کے بھی عجیب رنگ ہوتے ہیں۔ہر ادا پہ مات دیتے ہو۔ہر ادیتے ہو۔۔۔مارتے ہو تو عاشق کو تب بھی شکوہ کرنے کا دل نہیں چاہتا۔مگر جانتی ہو۔۔یہاں معملہ مختلف تھا۔

مجھے۔۔۔

مجھے ذریت حسن کو تو تم سے کبھی عشق تھا ہی نہیں۔۔۔

نہ میں اندھا ہوں آذر کی طرح نہ اس کی طرح دیوانہ۔۔۔

نہ۔۔۔نہ نتاشا بی نہ۔۔۔اس کھیل کو تم نے را کھیل بن کر پیش کیا تھا۔تم نے۔۔۔تم نے میرے دوست میرے بھائی۔کو اس کردار کی شکل دی۔۔۔جو اس ساری کہانی میں سب سے مظلوم تھا۔۔۔تم نے اسے مار ڈالا۔تم نے اسے سرکس کا کھلاڑی سمجھ کر استعمال کیا۔اور آخر میں خود ہی انچائی سے دھکا دے کر مار دیا۔اس کے چہرے کا ایک ایک نقش نتاشا کو بلکتا روتا محسوس ہو رہا تھا۔

نتاشا کی آنکھیں خوف سے پھیلیں۔۔۔

تم۔۔آذر کے؟اس کے الفاظ آدھے مگر ذریت کے لئے مکمل تھے۔وہ اپنی جگہ سے ہٹا۔اور اثبات میں سر ہلایا۔

ہاں۔۔۔میں۔۔۔اس کا بھائی۔۔اس کا دوست تھا۔میں ہوں ذریت حسن۔۔۔جس کو آذر کی محبت سے شدید نفرت ہے۔وہ بول رہا تھا۔لفظ لفظ نتاشا کی شاہ رگ کو کاٹ رہا تھا۔مگر لہجہ کمال دھیمہ۔

وہ آگے بڑھی۔۔۔

مزاق مت کرو۔۔۔تم مجھ سے محبت کرتے ہو۔تم نہ جانے کتنی بار مجھ سے وعدہ کر چکے ہو۔وہ بے یقین تھی۔

وہ ہنسا۔۔۔ہاں۔۔کئے وعدے۔۔۔مگر صرف تمہیں یاد دلانے کے لئے۔کہ یاد رکھو۔کہ جب وعدے ٹوٹتے ہیں۔تو کتنی تکلیف پہنچتی ہے۔

For more visit (exponovels.com)

ذر۔۔۔ذریت۔۔۔تم۔۔۔تم میرے ساتھ ایسا نہیں کر سکتے۔تم جانتے ہو ناں مجھے تم سے کتنی محبت ہے۔میں۔۔۔اس نے کہنے کے دوران ہاتھ اس کے چہرے کی جانب بڑھایا تھا۔وہ اس کے قریب آئی۔۔۔آگے بھی۔اور اس نے بے دردی سے اس کے ہاتھ کو جھٹک دیا۔نتاشا کو بے اختیار آذر یاد آیا تھا۔جب اس نے نتاشا کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا تھا۔کہ نتاشا دل مت توڑو۔اللہ ناراض ہو گا۔تو نتاشا نے تب بہت غرور اور بے دردی سے اس کا ہاتھ جھٹکا تھا۔یوں جیسے اس کے لئے عدالت کبھی نہ سجے گی۔

ظلموں کو اللہ کبھی نہیں چھوڑتا۔

نتاشا محبت کا نام مت لو۔۔۔یہ تمہارے منہ پہ سجتی نہیں ہے۔تم ہی وہ قاتلہ ہو۔جس نے میرے بھائی کو مارا۔

یار اگر تم اسے نہیں چاہتی تھی۔تو کیوں تم نے اسے ورغلایا۔کیوں؟تم نے اسے خواب دیکھائے

کیوں؟۔۔۔کیوں تم نے اسے محبت کے جال میں پھنسا کے مارا؟۔۔۔اس کی آنکھوں کی سرخی میں مزید شدت آئی۔وہ ایک دم دھاڑا۔نتاشا سہم کر پیچھے ہٹی۔

مگر اس نے خود۔۔۔خودکشی کی تھی ذریت۔۔۔میں نے اسے نہیں مارا۔لفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر ادا ہوئے۔

اپنی بکواس بند کرو۔۔۔وہ چیخا۔۔۔

تم۔۔۔تم دو ٹکے کی لڑکی تمہاری اوقات تھی۔اس جیسے معصوم کی محبت کی۔۔۔تم۔۔۔تم کہتی ہو۔اس نے خودکشی کی۔۔۔

تم۔۔۔جانتی تھی۔وہ زہر پی رہا ہے۔اس نے جب تمہیں فون کر کے کہا تھا۔کہ نتاشا ایک بار کہہ دو کہ میں آذر تم سے محبت کرتی ہوں۔میں نے جو بھی کنسرٹ پہ تم سے کہا۔اپنے دوستوں کے سامنے کہا۔سب مزاق تھا۔تو تم نے پتہ ہے آگے سے کیا کہا تھا۔وہ اسے یاد دلا رہا تھا۔اور نتاشا کب بھولی تھا۔اسے ہی تو حرف بہ حرف تمام الفاظ یاد تھے۔مگر وہ پھر بھی کہہ رہا تھا۔

For more visit (exponovels.com)

تم نے اس سے کہا تھا۔ محبت کا ثبوت دو۔ ثابت کرو کہ تم مجھ سے محبت کرتے ہو۔ زہر پی کر اپنی محبت کی گواہی دو۔۔۔

تم نے۔۔۔ تم نے اس سے اس کی زندگی کی گواہی مانگی نتاشا۔ تم نے اس کی محبت کا مزاق اُڑایا۔۔۔ اس کی آنکھ سے آنسو نکلا۔ اور گال پہ بہہ گیا۔ نتاشا نے نفی میں سر ہلایا۔۔۔

نہیں۔۔۔ نہیں ذریت۔۔۔ میں نے آذر کو نہیں مارا۔ وہ اسے کھونا نہیں چاہتی تھی۔ جس سٹیج سے آذر گزرا تھا۔ اس سٹیج پہ وہ کھڑی تھی۔ وہ ذریت حسن کو اپنی زندگی کا مقصد تصور کرتی تھی۔ وہ آگے بڑھی۔۔۔ ذریت پیچھے ہٹا۔

محبت اور نتاشا دو الگ الگ چیزیں ہیں نتاشا۔ تم سے ذریت حسن نے کبھی محبت کی اور نہ کبھی کرے گا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ اور نتاشا کی ٹانگوں سے جیسے جان نکلتی جا رہی تھی۔

نہیں ذریت۔۔۔ تمہیں اللہ کا واسطہ ہے۔ مجھ سے جھوٹ مت بولو۔ وہ روئی۔ اس کی آنکھ سے پہلا آنسو نکل کر اس کی گال پہ پھسلتا۔ گرد آلود مٹی پہ گرا۔ اور ساتھ ہی وہ خود بھی بھر بھری مٹی کی مانند زمین پہ آتی رہی۔

مجھ سے محبت نہ کرنے کا جھوٹ۔۔۔ وہ کہہ رہی تھی۔

مت بولو۔۔۔

تم جانتی ہو۔ جس کی تم نے جان لی۔ مجھے اس شخص سے عشق تھا۔ مجھے آذر سے محبت تھی۔ بے تحاشا محبت۔۔۔ جس وقت وہ مر رہا تھا۔ پتہ ہے۔ اس نے کیا کہا تھا۔ وہ پشت کی جانب چلتے چلتے رکا۔ اور زمین پہ بیٹھ کر گرد آلود زمین پہ چند لکیریں کھینچیں۔

کہتا رہا۔۔۔ ذریت محبت ہمیشہ کہ لئے امر ہونے جا رہی ہے۔ اسے میری زندگی میں ہوتے ہوئے۔ میری محبت پہ یقین نہیں ہے۔ تو میں اسے مر کر ثبوت دوں گا۔ کہ آذر کی محبت سے بڑھ کر نتاشا کے لئے دنیا کی اور کوئی محبت نہیں ہو سکتی۔ دنیا کے کسی شخص نے اس سے اس طرح محبت نہیں کی ہو گی۔ جس۔۔۔ جس طرح میں نے اسے چاہا۔ دوسرا آنسو بھی نکلا۔ اور گرد میں جزب ہو گیا۔ نتاشا کے رونے میں مزید شدت آئی۔

ذریت پلیز۔۔۔پلیز ذریت مجھے معاف کردو۔میں نہیں جانتی تھی۔کہ آذر سچ میں خودکشی۔۔۔

خودکشی نہیں کی تھی اس نے۔مت۔۔۔مت کہو بار بار۔اس کی بات کاٹ کر ایک دم وہ دھاڑا۔تو وہ اپنے الفاظ چھوڑ کر پھپھک کر رو دی۔میں نے اسے نہیں مارا۔وہ بھی بے جان سی چیخی۔۔۔

وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

میں نے ضیاء سے ڈیل کر کے تمہیں یہاں بلوایا تھا۔وہ جیسے سُن ہی نہیں رہا تھا۔وہ آج اسے سنانے آیا تھا۔

تم آذر کی موت کی ذمہ دار ہو میں جانتا ہوں۔قانون نہیں۔مگر تم منشیات فرشی میں شامل ہو۔پولیس جانتی ہے۔فیصلہ اب قانون کرے گا۔ذریت حسن نے اپنے دوست کا بدلہ لے لیا۔کہہ کر وہ وہاں رکا نہیں۔تھا۔اس کے الفاظ کی بازگشت نتاشا کو سن رہی تھی۔مگر وہ نتاشا کی محبت کو ٹھوکر مار کر جا چکا تھا۔

۔۔نتاشا کی چیخیں اس کا گڑگڑانا کچھ اس کو نہ روک سکا تھا۔اسے اس عورت سے نفرت تھی بے تحاشا نفرت۔

نتاشا کا سانس یہ سوچ کر ہی بند ہو رہا تھا۔کہ جس شخص کی محبت کو اس نے سر کا تاج بنایا۔وہی اسے ڈھونگی اور دغا باز کہہ گیا تھا۔وہ اس کے لئے چین اور رامش کو چھوڑ آئی تھی۔اس نے شخص کو اپنی زندگی میں جو مقام دیا تھا۔اس سے ذریت حسن کو برخاست کرنا نا ممکن تھا۔وہ بلند آواز روتی رہی۔۔۔اور روتی چلی گئ۔اس کی زندگی کا انجام یہ ہوگا اس نے سوچا بھی نہ تھا۔وہ زمین پہ گھوٹنوں کو زمین پہ رکھے جھکی اور چیختی رہی۔اس کے آنسو۔۔۔اس کی پلکوں سے گرتے زمین پہ پڑ رہے تھے اور تبھی اسے آذر کی آواز سُنائی دی۔

نتاشا دل مت توڑو۔۔۔وہ رو رہا تھا۔ہاں اس روز اس کا لہجہ بھیگا ہوا تھا۔وہ۔۔۔

وہ کہہ رہا تھا۔نتاشا دل مت توڑو اللہ ناراض ہوگا۔نتاشا کے آنسو میں سیلاب کا سا جوش تھا۔مگر وہ آنسو اس تکلیف کو بھی بیان کرنے سے قاصر تھے جو اس وقت وہ محسوس کر رہی تھی۔

اس نے پھر سُنا۔۔۔وہ کہہ رہا تھا۔

نتاشا۔۔۔ مجھ سے کہہ دو۔۔۔ کہہ دو۔ کہ آذر جو بھی میں نے کہا سب جھوٹ تھا۔ نتاشا تمہیں اللہ کا واسطہ میرے دل کو میری محبت کو ردمت کرو۔ میرا زندہ رہنا مشکل ہو جائے گا۔ وہ گڑ گڑا رہا تھا۔ نتاشا ایک دم چیخی۔۔۔ کمرے کی دیواریں۔ کان لپیٹ چکی تھیں۔ ظالموں کا انجام بُرا ہی ہوتا ہے۔

نتاشا دل مت توڑو اللہ ناراض ہو گا۔ وہ ایک بار پھر سے کہہ رہا تھا۔ اور نتاشا رو رہی تھی۔ زمین پہ اپنا سر مار رہی تھی۔ اور کہہ رہی تھی۔ ذریت واپس آجاو۔ نتاشا مر جائے گی۔

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

تم گھر آ رہی ہو۔ یا میں خود لینے آءوں۔ وہ کمرے میں کھڑی بال برش کر رہی تھی۔ ساتھ فون کان سے لگا تھا۔ ابرار بھائی اور بابر آفس جا چکے تھے۔ اور وہ ابھی ابھی برتن دھو کر کمرے میں آئی تھی۔ جب ذریت کی دوبارہ کال آئی۔

رات ملازم نے اسے ذریت کا پیغام دے دیا تھا۔ مگر اس کے انتظار کر کے باوجود بعد میں اس نے کال نہیں کی تھی۔ اور اب صبح کر رہا تھا۔

آپ کو آنے کی ضرورت نہیں ہے۔۔۔ بال کھول کر سر کو سہلاتے اس نے کہا تھا۔

وجہ؟ آفس کی کرسی پہ بیٹھے ذریت کے ماتھے پہ بل نمودار ہوئے۔ اور لہجہ خشک ہوا۔

وجہ آپ جانتے ہیں۔ اس نے سنجیدگی سے کہا۔ تو وہ افسوس سے سر ہلا کر رہ گیا۔

تم عورتوں کے دماغ سچ میں بہت چھوٹے ہوتے ہیں۔۔۔ یہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں تھی۔ کہ تم میرے آنے کا انتظار کئے بغیر۔۔۔ مجھ سے بات کئے بغیر اپنے بھائی کے ہاں پہنچ گئ۔

ہاں۔۔۔ آپ کے لئے تو ظاہر ہے غیر اہم ہی ہو گی۔ پر میرے لئے بہت اہم تھی۔ مجھے اندازہ ہو گیا ہے۔ کہ آپ کی زندگی میں میری کیا حثیت ہے۔ اس نے منہ بنا کر کہا۔ تو ذریت کے ہونٹ بے ساختہ مسکرائے۔

اچھا کیسے۔۔۔ ایک اداکارہ کی وجہ سے۔۔۔؟

واہ کیا بات ہے آپ کی ذہانت کی۔۔۔وہ محظوظ ہوا۔ماہ نور کو بُرا لگا۔

میں نے آپ سے بس مزید بات نہیں کرنی۔آپ کو لگتا ہے۔کہ میں بے وقوف ہوں۔ایک فضول سی بات پہ اپنے بھائی کے گھر آ گئ۔تو پھر ایسے ہی سہی۔

اللہ حافظ۔۔۔اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا۔وہ فون کھٹاک سے رکھ چکی تھی۔

ذریت نے بہت ناگواری سے فون کی سکرین کو دیکھا۔اور پھر سامنے کار کی چابی دیکھ کر اُٹھ کھڑا ہوا۔

جب تک عورتوں کی عقل ٹھیکانے پہ نا لگائی جائے۔یہ ایسے ہی مردوں کو پاگل بناتی رہتی ہیں۔بڑبڑا کر اس نے آفس کا دروازہ دھکیلا اور سیکٹری کو چند حدایات دے کر باہر نکل گیا۔

ماہ نور نے بال برش کر کے ان کو چوٹی میں مقید کیا۔اور پھر کھڑکی سے چھن کر آتی دھوپ دیکھ کر کمرے سے نکل کر لان میں آ گئ۔

لان میں آکر اس نے پودوں کی صفائی ستھرائی کے کام کا بیڑا اُٹھایا۔اور پھر اس میں جُت گئ۔ساتھ ہی ساتھ دل ہی دل میں نتاشا اور ذریت کو خوب کوسنے بھی دے رہی تھی۔

ہم عورتیں جاہل ہوتی ہیں۔تو مردوں نے بھی کم ظرف ہونے میں پی ایچ ڈی کر رکھی ہے۔

کیا تھا اللہ میاں۔۔۔کوئی اچھا۔۔۔رومینٹک سا شوہر مل جاتا تو۔اب دیکھیں۔۔۔ذریت کو پتہ بھی ہے۔کہ میں ناراض ہوں۔مجال ہے۔جو ایک بار کان پکڑ کر سوری بول دیں۔یا کہہ دیں۔کہ ماہ نور سوری۔۔۔

کیا تھا۔جو کہہ دیتے کہ ماہ نور میری زندگی میں تمہارے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔کہو تو ناک سے لکیریں کھینچ کر یقین دلا دوں۔بڑبڑاہٹ عروج پہ تھی۔اس نے آخر میں سر جھٹک کر کیاری میں اکھٹی کی گھاس اور جلے ہوئے پتے اکھٹے کئے اور اُٹھا کر پھر انہیں کچھ فاصلے پہ نسب کوڑے دان میں ڈال دیا۔

For more visit (exponovels.com)

میں نے کونسا۔ کہہ دینا تھا۔ کہ ناک سے ہی لکیریں کھینچیں۔۔۔بس مردوں کو محض اپنی انا کے سوا کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ سوچ سوچ کر ہی اس کا دل جل رہا تھا۔

کیسے اس لڑکی کے ساتھ پوز دے دے کر تصویریں بنائی تھیں۔اور ایک میں ہوں۔ جس کے ساتھ کبھی ایک بھی تصویر نہیں بنائی۔اس کا من مزید افسردہ ہوا۔

میں نے تم سے کہا تھا۔ تیار رہنا میں لینے آرہا ہوں۔اور تم کس کام کو لگ گئی ہو۔اپنی شرٹ کی آستین فولڈ کرتے ذریت نے اس کی بڑبڑاہٹ سُن کر بھی اگنور کرتے ہوئے کہا۔ تو ماہ نور کی زبان جو شاندار گل افشانی کرنے والی تھی۔ وہ ڈر کر مڑی۔اور پھر ذریت کو دیکھ کر منہ بھی بگاڑا۔۔۔

آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟ دائیں کندھے پہ جھولتی چوٹی کو پشت پہ ڈالتے اس نے ناگواری سے پوچھا۔ تو وہ جو اس کے مٹی سے اٹے ہاتھ دیکھ کر،اس کا عجیب سا حولیہ دیکھ کر محظوظ ہوا تھا۔ اسے گھور کر دیکھنے لگا۔ وہ اپنی کار باہر چھوڑ آیا تھا۔

میں نے تم سے کہا تھا۔ کہ تیار رہنا میں لینے آرہا ہوں۔اور تم مجھے یہاں کھڑے ہو کر بد دعائیں دے رہی ہو۔

اللہ۔۔۔ توبہ بد دعا کب دی۔اس الزام پہ تو اس کا منہ ہی کھل گیا تھا۔

اچھا تعاریف بھی نہیں کر رہی تھی۔اس کی طرف ایک نظر دیکھ کر اس نے ایک بار مڑ کر گیٹ کی جانب گارڈ کو دیکھا۔ جو ان کی جانب پشت کیئے کھڑا تھا۔اور پھر جھک کر ماہ نور کے چھوڑے ہوئے کام کو کرنے لگا۔ماہ نور نے اس کی ایک ایک حرکت نوٹ کی تھی۔

یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔اسے کیاری کی مٹی صاف کرتے دیکھ کر ماہ نور نے اچھنبے سے کہا تھا۔

جاءو مجھے وہ کٹر لا کر دو۔اس پودے کی صفائی ہونے والی ہے۔اس کی بات کا جواب دئے بغیر اس نے کہا۔ تو ماہ نور نے کچھ فاصلے پہ پڑے کٹر کو دیکھ کر ایک نظر دوبارہ مڑ کر اسے دیکھا۔اور پھر جا کے لے آئی۔

ذریت میں آپ سے کچھ پوچھ رہی ہوں۔ پتے دوبارہ سے اُٹھاتے اس نے چھوڑا سوال دوبارہ پوچھا۔ تو وہ جو اپنے کام میں مصروف تھا۔ ایسے لگتا تھا۔ جیسے اس کا کام ہی یہ ہو۔

کوئی ڈھنگ کا سوال پوچھو۔۔۔ جواب نہ ملے تو کان پکڑوا لینا۔ مسکراہٹ روک کر اس نے کہا۔ تو ماہ نور نے ناک چڑھائی۔

کسی کی باتیں نہیں سُنتے۔۔۔ اخلاق سے گری حرکت ہوتی ہے۔۔۔

کسی کی نہیں سنی تمہاری سنی ہے۔۔۔

آج خاصی فراغت معلوم ہوتی ہے۔

ظاہر ہے۔۔۔ تبھی تو بیٹھا ہوں۔۔۔ پتے کاٹ کاٹ کر پودے کی صفائی کرتے اس نے کہا۔ تو ماہ نور نے اس کے پاس پڑے پتے بھی اُٹھا لئے۔

میرے پودوں کی شکل تباہ مت کریں۔۔۔ پودے کے مزید پتے کٹتے دیکھ کر اس نے ٹوکا۔ تو وہ تو جیسے بعض آنے والا تھا۔

بگاڑ نہیں رہا سنوار رہا ہوں۔۔۔ خیر۔۔۔

تم بتاؤ۔۔۔ تم گھر کیوں چھوڑ کر آئی؟

ذریت آپ بار بار مجھ سے ایک ایسی بات پوچھ رہے ہیں۔ جس کا جواب آپ خود جانتے ہیں۔ اس نے چڑھ کر کہا۔ تو وہ جو دوزانوں ہو کر قمیض کے بازو فولڈ کئے۔ اپنے اہم کام چھوڑ کر کیاری صاف کر رہا تھا۔ محض اسے یہ یقین دلانے کے لئے۔ کہ وہ اس کی زندگی میں کیا حثیت رکھتی ہے۔ رُکا۔۔۔ اور آنکھیں سکیڑ کر اسے دیکھا۔۔۔

ماہ نور وہ لڑکی آذر کی قاتلہ ہے۔ تم جانتی ہو۔۔۔ میں آذر سے کتنا اٹیچ تھا۔ تو تم مجھے بتاءو کہ کیا۔۔ میں ایک ایسے انسان کے ساتھ دلی طور پہ وابستہ ہو سکتا ہوں۔ جس کے بارے میں میں جانتا ہوں۔ کہ میرے بھائی کی قاتلہ ہے؟ وہ اس سے پوچھ رہا تھا۔ ماہ نور خاموشی سے اس کے برابر آبیٹھی۔ اور مٹی صاف کرنے لگی۔

ذریت آپ کو میں غلط نہیں سمجھ رہی تھی۔۔۔ وہ کہہ رہی تھی۔ میں نے آپ کی اور اکمل بھائی کی باتیں سُن لی تھیں۔ ذریت چونکا۔

میں جانتی تھی۔ کہ وہ لڑکی آذر بھائی کی قاتلہ ہے۔ پر میں ہرٹ اس بات پہ ہوئی تھی۔ کہ آپ کو مجھ پہ بھروسہ ہی نہیں ہو سکا۔ میری خواہش تھی۔ کہ آپ اپنی تمام تر تکالیف مجھ سے شئیر کرتے۔ پر۔۔۔ آپ۔۔۔ اس کے لہجے میں افسوس تھا۔ ذریت نے اس کے مٹی میں حرکت کرتے ہاتھ پکڑے۔۔۔ اور آہستہ سے پشت پہ بوسہ لیا۔ ماہ نور نے خائف ہو کر دیکھا۔ اور ہاتھ کھینچا۔ مگر اس نے گرفت مضبوط کر لی۔

ماہ نور۔۔۔ اگر میں تم سے اپنی تکلیف شئیر نہیں کر رہا تھا۔ تو اس کا مطلب ہر گز یہ نہیں تھا۔ کہ مجھے تم پہ بھروسہ نہیں تھا۔ میں بس تمہیں ٹنشن نہیں دینا چاہتا تھا۔ مجھے لگا تھا۔ وہ چین چلی جائے گی۔ تو سب ٹھیک ہو جائے گی۔ پر وہ واپس آ گئی۔ اور یہ سب ہو گیا۔۔۔ اس کے ہاتھ کہ نرم غلابی غلابی مٹی سے اٹی ہتھیلی پہ انگلی سے لکیریں کھینچتے اس نے کہا۔۔۔ بلکہ سمجھایا۔ تو ماہ نور نے ہاتھ واپس کھینچ لیا۔ اور پتے اکٹھے کرنے لگی۔

آپکو اس لڑکی کی وجہ سے عورتوں سے نفرت ہوئی تھی ناں؟ اس نے پوچھا۔ تو اس نے جواب میں سر ہلا دیا۔

ذریت۔۔۔ آپ جانتے ہیں۔ معاشرے میں جب بُرے لوگوں کی بات کی جاتی ہے ناں۔۔۔ تب اُن لوگوں میں عورت اور مرد دونوں شامل ہوتے ہیں۔ اگر کہا جائے کہ صرف عورت بُری ہے۔ یا صرف وہی نفرت کے قابل ہے۔ تو غلط ہو گا۔۔۔

میری دوست نے در در ٹھوکریں کھائیں۔ اس کی وجہ بھی مرد تھے۔ اس کے خاندان کے مرد، معاشرے کے کچھ بُرے لوگ۔۔۔ اس نے بہت تکلیفیں برداشت کیں۔ میں اس کی حالت کی گواہ ہوں۔ انتہائی معصوم تھی وہ۔ مگر اس کی

معومیت نے ہی اسے بے گھر کیا۔ میرے لئے بھی وہ بہن ہی ہے۔ مگر اس کی حالت دیکھ کر میں اللہ کا شکر ادا کرتی تھی۔ کہ مجھے ایک اچھے انسان کا ساتھ ملا۔ اچھے بھائی۔۔ اور اعتبار کرنے والے والدین ملے۔۔۔ میرے ذیہن میں لمحے کو نہیں آیا۔ کہ سب مرد ایک جیسے ہوتے ہیں۔ تو آپ نے مجھے کیوں ایسا سمجھا۔۔۔ آج وہ معاف کرنے کے موڈ میں نہیں لگ رہی تھی۔ ذریت اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

تم ٹھہری عقل مند عورت۔۔ اور میں جلد باز اور ناک پہ غصہ رکھنے والا۔ انا پرست مرد۔۔۔ ہونٹوں پہ اُمڈتی مسکراہٹ روکتے اس نے کہا۔ تو ماہ نور جو اب پودے کی شاخوں کو دھاگے سے باندھ رہی تھی۔ ایک ابرو اُٹھا کر اسے دیکھا۔ چلو شکر آپ مانے تو سہی۔

اچھا اب تم بھی مان جاءو۔ تمہارے ساتھ کام کروایا۔۔۔ تمہارے پودے ٹھیک کئے۔۔۔ کیاری بھی ٹھیک کر دی۔ اب تو مان جاءو۔

اب کیا سچ میں ناک سے لکیریں کھینچواءو گی۔ بیچاری سی شکل بنا کر اس نے کہا۔ تو ماہ نور بے ساختہ ہنس دی۔

آپ بہت خراب ہو۔ آپ نے میری ساری باتیں سُن لی تھیں۔۔۔

ظاہر ہے۔۔۔ جتنی آواز تمہاری تھی۔ کوئی بھی تمہاری لفاظی سے محظوظ ہو سکتا تھا۔ خیر۔۔۔ اب صُلح؟ اس کو ہنستا دیکھ کر ذریت ہلکا پھلکا ہو گیا تھا۔

ہاں۔۔۔ لیکن ایک شرط پہ؟

ابھی بھی کوئی شرط پڑی ہے؟ تم زیادہ ہی سر پہ سوار ہو رہی ہو۔۔۔

تو؟ اپنے میاں جی سے بول رہی ہوں۔ اب کیا آپ میری چھوٹی سی خواہشیں بھی پوری نہیں کریں گی۔ کمال کا انداز تھا۔ ذریت محظوظ ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس کا سادھا مگر دلکش انداز ذریت حسن کے لئے نیا مگر انوکھا تھا۔

پہلی شرط یہ ہے۔ کہ چائے پی کر آپ کو گھر جانے دیا جائے گا۔ رات کا کھانا آپ میرے ہاتھ سے بنا کھا کر جانا چاہیں تو آپ کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے۔ تمام کھانے آپ کی پسند کے بنائے جائیں گے۔ ذریت نے اسے گھورا تھا۔ ماہ نور مسکراتی رہی۔

دوسری شرط یہ کہ۔ میں اب ابرار بھائی کی شادی کے بعد ہی آءوں گی۔ کیونکہ۔۔۔ میں بات کر چکی ہوں۔ اور اللہ پاک نے چاہا تو کچھ دنوں میں ہم ان کی شادی کی ڈیٹ فکس کر دیں گے۔ اس نے بہت مزے سے بتایا۔ تو ذریت کو مان کے ہی بنی۔

تم گھر آءو۔ تمہارے سارے پر کاٹتا ہوں۔ گھر کی جانب جاتے اس نے بڑبڑا کر کہا۔ تو ماہ نور ہنستی چلی گئی تھی۔

اب اندر آ کر ہنس لو۔۔۔ مجھے جانا ہے۔ جلدی سے ایک کپ چائے بنا دو۔ وہ کبھی بھی نارمل مرد کی طرح ایکٹ نہیں کرتا تھا۔ کوشش بھی کرتا۔ تو مزاج سخت ہی رہتا۔ خواہ انداز پیار لئے ہی ہوتا۔ ماہ نور نے افسوس سے اسے دیکھا تھا۔

\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-

فرح نے چائے کے تین کپ ٹرے میں ترتیب سے رکھے۔ شیلف سے بسکٹوں کی پلیٹ اُٹھا کر ابھی اس نے رکھی ہی تھی۔ جب لاءونج کا فون بجا۔۔۔

اس وقت وہی تھی۔ جو وہاں موجود تھی۔ ملازمہ باہر لان میں امی جی کے پاءوں کی ورزش کروا رہی تھی۔ بابا کوئی کتاب پڑھ رہے تھے۔ وہ آج گھر پہ ہی تھے۔ اس نے ایک نظر ساری ٹرے کی سیٹنگ کو دیکھا۔ اور کیچن سے نکل کر فون سٹنڈ کی جانب آ گئی۔

بجتے فون کو اس نے ایک سانس لے کر اُٹھایا۔

اسلام علیکم۔۔۔ بردبار انداز دوسری جانب بیٹھا ابرار مسکرایا۔ اور آنکھوں پہ لگا۔ چشمہ درست کیا۔

وعلیکم اسلام۔۔۔اس نے بظاہر لہجے کو نارمل رکھا تھا۔ مگر اندر سے وہ کتنا پرجوش اور خوش تھا۔ وہی جانتا تھا۔

ابرار کی آواز سُن کر فرح کے دل کی دھڑکن کی ایک بیٹ مِس ہوئی۔۔۔دل سکڑ کر پھولا۔۔۔اس نے ہونٹوں پہ زبان پھیری۔۔۔گویا نروس ہوئی۔

میرے خیال میں آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔۔۔اس کی خاموشی پا کر اسے یہی لگا تھا۔

نہ۔۔۔نہیں۔۔۔میں تو سوچ رہی تھی۔ کہ آپ نے مجھے کیونکہ کر کال کرلی۔ اس نے صاف گوئی اختیار کی۔ تو ابرار مسکرا دیا۔

وہی بیان کروں گا۔ اگر آپ وقت اور اجازت دیں تو۔

جی۔ بولیں۔۔۔

آپ اس رشتے پہ راضی ہیں؟ میرا مطلب ہے۔ ماہ نور کی وجہ سے یا اپنے۔ گھر والوں کی وجہ سے تو آپ ہاں نہیں بول رہیں۔؟ اس نے جو سوال پوچھا تھا۔ اس نے فرح کو حیران کر دیا تھا۔ وہ ہونٹ کاٹنے لگی۔ وہ تو جانتی ہی نہیں تھی۔ کسی رشتے کے بارے میں۔

بابا نے آپ کو جواب دے دیا؟ اس نے عجیب سا سوال پوچھا تھا۔

جی ہاں۔۔۔لیکن میری خواہش تھی۔ کہ آپ مطمئن ہو جائیں۔ وہ ابرار تھا۔ اس کی فکر کرنے والا۔ کیسے اس کی خوشی کا خیال نہ رکھتا۔

فرح کی آنکھیں نم ہوئیں۔

میری چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔ اللہ حافظ۔۔۔اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا۔ وہ فون رکھ چکی تھی۔ اسے شدید حیرت ہوئی ۔ماہ نور نے کب بات کی۔ اور بابا کیا مجھ سے پوچھے بغیر ہی مان گئے۔ اس حیرت پہ حیرت تھی۔ اور اسی حیرت میں گھری وہ چائے تک واپس آئی۔ اور ٹرے لئے باہر کی جانب چل دی

فرح آپ کا اگلے ہفتے ہم نے نکاح طے کر دیا ہے۔ چائے کی کا گھونٹ لیتے بابا نے کہا تھا۔ فرح جو امی جی کو چائے پکڑا رہی تھی۔ اس کا ہاتھ کامپا۔۔۔

با۔۔۔

آپ کو عتراض ہے۔۔۔؟ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی۔ مگر ان کے ٹوک کر پوچھنے پہ اس نے سر نفی میں ہلا دیا۔ اس نے پوچھا نہیں کس سے۔

پوچھیں گی نہیں کس سے؟

بابا آپ پہ مجھے بھروسہ ہے۔ آپ مجھے اب کنویں میں چھلانگ لگانے کو بھی کہیں گے تو یقین جانے سوال نہیں کروں گی۔ یہ تو پھر نکاح ہے۔ اس نے ہاتھ کی ہتھیلی دیکھتے کہا۔ تو امی جی نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

مجھے افسوس ہے۔ کہ میں اپنی بیٹی کے اس حال کی ذمہ دار خود ہوں۔ ان کے لہجے میں گہری شرمندگی تھی۔ فرح نے ان کے ہاتھ پکڑ لئے۔

نہیں امی جی۔۔۔ مجھے آپ سے کوئی شکائت نہیں۔ بلکہ میں شرمندہ ہوں۔ میں ہی اچھی نہ تھی۔ اس کی آنکھیں مزید نم ہو گئیں۔ بڑی بیگم نے اس کا سر اپنے کندھے سے لگا لیا۔

بیٹا آپ کل شاپنگ کر لیں۔ بوا۔۔۔ آپ بھی فرح کے ساتھ چلی جائیں۔ دو تین دن میں بیگم کا پلاسٹر کھل جائے گا۔ تو آسانی ہو جائے گی۔ اُنہوں نے تو سب ترتیب سے سیٹ کر چھوڑا تھا۔ فرح نے اثبات میں سر ہلایا تو ملازمہ کی کیا جرت تھی جو انکار کرتی۔

مسائل ہماری زندگیوں کا حصہ ہوتے ہیں۔ آتے ہی رہتے ہیں۔ کبھی بھی کچھ بھی ہمیشہ کے لئے نہیں ہوتا۔ خوشی اور نہ غم۔۔۔ سب آتے ہی جانے کے لئے ہیں۔ اگر یہ لکھوں کے اس کے بعد وہ ہمیشہ کے لئے خوش رہنے لگی۔ تو غلط

ہو گا۔ وہ انسان تھی۔ زندگی گزار رہی تھی۔ خوشی اور غم کا سلسلہ اس کی زندگی میں بھی مسلسل تھا۔ ہاں پر اب لوگ اس کا خاندان اس پہ اعتماد کر رہے تھے۔ اس کی زندگی میں آسانیاں آ رہی تھیں۔ ایک اچھے انسان کا ساتھ مل رہا تھا۔ یہ تھا جو زندگی رہنے تک مستقل تھا۔

فرح نے خاموشی سے کپ اُٹھایا اور چھوٹے چھوٹے گھونٹ لینے لگی۔ اس کی نظران سے کچھ فاصلے پہ دانا چگتی چڑیا پہ تھی۔

تھانے میں معمول کی گہما گہمی تھی۔ بھانت بھانت کی آوازیں۔ شور اور سلاخوں کے پار نیم تاریکی۔۔۔

اس نے تھانے کے اندر قدم رکھا۔ تو اسے محسوس ہوا جیسے اس کے قدم ایک دم سے من من بھاری ہو گئے ہوں۔ اور چلنا محال ہو۔ مگر وہ پھر بھی چلتا رہا۔۔

زمان؟ تھاندار صاحب دفتر میں ہی ہیں۔؟ سامنے سے آتے جوان سے اس نے پوچھا۔

ہاں جی۔۔۔ اندر ہی ہیں۔۔۔ اس کے مثبت جواب پہ اسفند ایک کمرے کا دروازہ دھکیلتا اندر غائب ہو گیا۔

پیلی دیواریں۔۔۔۔ معمولی سا فرنیچر اور ڈھیر فائلیں لئے الماری۔۔۔

تقی مصروف ہو؟ اس نے اندر آتے ہوئے پوچھا۔ تو اٹھائیس کو جاتا نوجوان تقی جو کسی فائل کی ورق گردانی میں میں مصروف تھا۔ اس کی آواز سن کر سیدھا ہوا۔

آءو اسفند۔۔۔۔ خیریت؟

تم تو آج کل عادی مجرموں کی طرح روز تھانے حاضری دے رہے ہو۔۔۔ سر سے ٹوپی اُتار کر میز پہ رکھتے اور بالوں پہ ہاتھ پھیرتے اس نے پوچھا۔ تو اسفند مسکرا دیا۔

ایک جان پہچان کا مجرم ہے۔ جسے آپ نے قید کر رکھا ہے۔ بس روز اسی کو دیکھنے آتا ہوں۔ کہ زندہ ہے۔ یا۔۔۔ آخر سے فقرہ چھوڑ دیا۔۔۔ وہ اس کے لئے کبھی غلط الفاظ استعمال نہیں کر سکتا تھا۔

ابھی تو کیس چل رہا ہے۔ اتنی جلدی اُنہیں کچھ نہیں ہو گا۔۔۔ تم روز مت آیا کرو۔ خامخواہ شور مچا کر سارے تھانے کا ماحول بگاڑتی ہیں۔ تقی کے چہرے پہ ناگواری کے تاثر تھے۔ اسفند افسردگی سے مسکرایا۔ مجھے کیوں ان لوگوں میں شامل کرنا چاہتے ہو۔ جن کی محبت بھی مطلبی ہوتی ہے۔۔۔

محبت تم بڑے لوگوں کا کام ہے۔ سو سمجھ بھی تمہی کو ہے۔۔۔ اس نے ہاتھ اُٹھائے تو اسفند اُٹھ کھڑا ہوا۔

کوئی بات نہیں تم بھی سمجھ جاؤ گے۔۔۔ میں ذرا مل لوں۔ وہ جس کام سے آیا تھا۔ وہ اس کے لئے اہم تھا۔ تقی کے سر ہلانے پہ باہر کی جانب بڑھا۔

تقی نے بڑے افسوس سے اس کی پشت کو دیکھا تھا۔ وہ اس کا دس سال پرانا دوست تھا

اس کی رگ رگ سے واقفیت رکھتا تھا۔ وہ جانتا تھا۔ اس کے لئے موو آن کرنا مشکل تھا۔

سلاخوں کے پیچھے وہ سر جھکائے سیلن زدہ دیوار سے پشت ٹکائے اونگ رہی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھوں کے ناخن بڑھے ہوئے گندے اور بال میلے اور بدبودار تھے۔ اس کا چہرہ جو صبح شام میک اَپ میں اٹا رہتا تھا۔ آج گرد سے اٹا تھا۔ چند دنوں میں ہی اس کی خوبصورت آنکھوں تلے بڑے بڑے سیاہ دائرے بن چکے تھے۔ اس کے چہرے کی ہڈی کچھ اُبھری ہوئی تھی۔ اور ہونٹ خشک تھے۔ جیسے صحرا کا سفر طے کر آئی ہو۔

نتاشا۔۔۔ اسفند سے اس کی حالت پوشیدہ نہیں تھی۔ وہ روز اس کو ایسے ہی دیکھتا تھا۔

نتاشا نے جھکے سر کو جھٹکے سے اُٹھا کر سامنے سیاہ کھدر کر شلوار سوٹ میں ملبوس صوبر سے اسفند اکرام کو دیکھا۔ اور چند لمحے دیکھتی رہی۔

تم روز کیا دیکھنے آتے ہو؟ اس کے لہجے میں آج غرور کی بجائے صرف سختی تھی۔

For more visit (exponovels.com)

یہی کہ تم زندہ ہو۔۔۔

میرے زندہ رہنے یا نہ رہنے سے تمہیں کیا فرق پڑے گا۔ مجھے بھی نہیں پڑا اس کے رہنے سے۔۔۔ اس نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے عجیب سے لہجے میں کہا۔ تو اسفند کے دل کو تکلیف ہوئی۔

نتاشا تم اتنی ظالم نہ ہوتی۔ تو میں اپنے پہ کیئے تمام گناہ و ظلم معاف کر کے تمہیں یہاں سے باہر نکلوا دیتا۔ مگر تم جانتی ہو۔ ظالم کا ساتھ دینے والا بھی ظالم ہی ہوتا ہے۔

اسفند کی بات سن کر اس کے چہرے پہ مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔

اور تمہیں لگتا ہے۔ کہ میں تم سے احسان لیتی۔۔۔ ایک ابرو اُٹھا کر پوچھا۔ اسفند اس کی خود عتمادی اور غرور دیکھ کر حیران نہیں ہوا تھا۔ وہ عادی تھا۔

جاءو۔ مجھے تم سے بات نہیں کرنی۔ آج میں نے جس کو خواب میں دیکھا ہے۔ مجھے صرف اس کا انتظار ہے۔ اس نے اس سے نظریں ایک دم پھیر کر کہا۔ تو اسفند اُلجھا۔

نتاشا تم نے ضیاء کے خلاف بیان ریکارڈ کروا دیا۔ تو تم یہاں سے جلد نکل جاءو گی۔ تم کو سزا ہو گی بھی تو زیادہ لمبی نہیں ہو گی۔۔۔ اس کا انداز دیکھ کر اس نے اگنور کرتے ہوئے کہا۔ تو نتاشا کا چہرہ تعش سے سرخ ہونے لگا۔ اسے جیسے اپنی توہین محسوس کوئی۔۔۔

میں کہہ رہی ہوں یہاں سے جاءو۔ وہ دھاڑی۔۔۔ اسفند نے ہونٹ بھینچ لئے۔

جاتا ہوں۔۔۔ اپنا خیال رکھنا۔ کہہ کر اس کے چہرہ موڑ لینے پہ اسے وہ وہاں چند لمحے دیکھتا رہا۔ اور پھر واپس مڑ گیا۔

وقت اور حالات کبھی ایک سے نہیں رہتے۔ان کا بدلنا فطری عمل ہے۔زندگی میں خوشیاں اگر ایک وقت ہیں تو ممکن ہے۔کہ کل دکھ کا سامنا کرنا پڑے۔دلیر اور اللہ پہ یقین رکھنے والے چاہے خوش ہوں یا غمگیں ہر صورت میں مضبوط رہتے ہیں۔اور اللہ پاک سے طاقت مانگتے ہیں۔

ان کا حال اس کھجور کے مضوط درخت سا ہوتا ہے۔جو شدید سیلاب میں بھی کھڑا رہتا ہے۔طوفان آئے آندھی آئے کوئی چیز اس کی جڑوں کو کمزور نہیں کر سکتی۔

میں آخر میں یہ نہیں لکھوں گی۔کہ پھر سب ہنسی خوشی رہنے لگے۔ان کی زندگیوں سے مسائل بالکل ختم ہو گئے۔نہیں۔۔۔۔

مسائل تھے۔۔۔خوشیوں کے ساتھ غم بھی تھے۔مگر اس بار ان سے مقابلے کے لئے کسی ایک کو قربان نہیں ہونا تھا۔وہ سب ساتھ تھے۔اتحاد میں ہی تو طاقت ہے۔

فرح اور ابرار کا نکاح جمعے کے روز سوات میں فرح کے آبائی گاءوں میں۔۔۔۔بہت سادگی سے مگر خوب خوشی کے ساتھ انجام پایا۔۔۔نکاح کے خوبصورت تعلق نے لمحوں میں زندگی کا رخ بدل ڈالا تھا۔

ماہ نور اور بابر سوات پہلے نکاح سے ایک روز پہنچ گئے تھے۔ان کو حویلی کا بلائی حصہ رہائش کے لئے دے دیا گیا تھا۔جہاں انہیں تین روز تک قیام کرنا تھا۔

ماہ نور نے ہی فرح کے نکاح کا جوڑا خریدا تھا۔

خوبصورت سفید اور مونگیا رنگ گھیری دار پاءوں کو چھوتی فراک کے ساتھ چوڑی دار پجامے میں۔سر کو سفید دوپٹے سے ڈھکے۔۔۔کندھے کو مونگیا اور سرخ وسفید چادر سے ڈھکے فرح خان ہلکے پھلکے میک اپ میں خوب جچ رہی تھی۔اس کے ہونٹ شوخ رنگ سے رنگے گئے تھے۔گالوں کی سرخی اگرچہ قدرتی تھی۔مگر پھر بھی ہلکا ٹچ دیا گیا۔

کانوم میں جھولتے گول گول آویزے اس کے گالوں کو چھوتے کھلکھلاتے محسوس ہوتے تھے۔اور اس پہ اس کا شرما کے مسکرانا وہاں مجود تمام مہمانوں کو رشک میں مبتلا کر رہا تھا۔

دوسری طرف ابرار تھا۔ جو اپنے نکاح سے تقریباً آدھا گھنٹہ پہلے پہنچا تھا۔ ماہ نور اس کا نکاح کا لباس ساتھ ہی لائی تھی۔ اس نے نکاح پہ سفید شلوار قمیض پہ نیوی بلو واسکٹ پہن رکھی تھی۔ اور اس پہ اس کی مسکراہٹ۔۔۔

ان دونوں کی جوڑی چاند سورج کی تھی۔

نکاح سے کچھ دیر قبل وہ کمرے میں آئی تھی۔

گولڈن درمیانی قمیض اور سفید شرارے میں کندھے پہ سفید ہی دوپٹے کو سیٹ کئے۔ بالوں کو مصنوعی کرل دے کے پشت پہ چھوڑے۔ سرخ لپسٹک لگائے۔ وہ بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔

ذریت ابھی بیس منٹ پہلے دادی جان کو لے کر پہنچا تھا۔ وہ دادی جان سے مل کر کچھ سامان لینے میں کمرے میں آ گئی تھی۔ اس لئے ذریت سے مل نہ سکی۔

ذریت جب راہداری سے ہوتا۔ مہمانوں اور میزبانوں سے ملتا لاؤنج میں آیا۔ تو وہاں بہت سی خواتین موجود تھیں ایک سوائے ماہ نور کے۔ اس نے مسکرا کر سب کو پہلے سلام کیا۔ اور پھر چند لمحوں تک بیٹھ کر اس کے آنے کا انتظار کرتا رہا۔

جب وہ نہ آئی تو اسے خود ہی اُٹھنا پڑا۔

سیڑھیاں چڑھتے اُوپر کمروں میں تیسرا کمرہ تھا۔ جہاں ماہ نور الماری کھولے کچھ تلاش کر رہی تھی۔

وہ ناموشی سے جا کر کھڑا ہو گیا۔

ماہ نور کے ہاتھ میں جولری باکس تھا۔ اس نے فرح کے لئے نکاح پہ پہننے کے لئے ابھی نیا ہی بنوایا تھا۔

وہ ڈبہ لے کر جیسے ہی پلٹی۔ ذریت کو ایک دم سے سامنے دیکھ کر گھبرا گئی۔

آ۔۔ آپ۔۔۔ دل ڈر کر اُچھلا اور حلق میں آنے کو تھا۔۔ ذریت مسکرا دیا۔۔۔ ماہ نور سے شادی کے بعد اب اسے عید کے عید مسکرانا نہیں پڑتا تھا۔ وہ جب جب اسے دیکھتا تھا۔ اس کے چہرے پہ مسکراہٹ اُمڈ آتی۔

میں دیکھنے آیا تھا۔ کہ میری بیوی کہاں گئ۔ نظر نہیں۔آ رہی۔

کیا آپ نے میری ماہ نور کو دیکھا ہے ؟اس کے دائیں جانب بازو رکھ کر رستہ روکتے اس نے آنکھوں میں چمک لئے پوچھا۔ تو ماہ نور دھیمے سے ہنس دی۔

ہاں جی دیکھا ہے۔۔۔ ابھی یہیں تھی۔کچھ دیر پہلے۔۔۔ بالوں میں ہاتھ پھیر کر اُنہیں بار بار چہرے پہ آنے سے روکتے اس نے کہا۔ تو وہ اب کی بار محض مسکرایا۔

اچھا۔۔ کہاں ہے اس وقت ؟ مجھے اس سے ملنا ہے۔ کیا آپ مجھے اس کے پاس لے جائیں گیں۔

اچھا۔۔ بس باتیں ہو گئیں بہت۔۔۔ سامنے سے ہٹیں۔اور جا کر چینج کریں۔آپ کی وجہ سے نکاح شام میں رکھوایا تھا۔ مگر آپ پھر بھی لیٹ۔۔۔ چہرے پہ مصنوعی ناراضی لئے۔اس نے اس کے سامنے سے ہٹ کر بائیں جانب سے نکلنے کی تھی۔پر وہ پھر سے سامنے کھڑا رہا۔

میں آپ سے کہہ رہا ہوں۔ مجھے میری بیوی ڈھونڈ دیں۔اور آپ مجھ سے بحث کر رہی رہیں۔اس کے چہرے پہ پھیلتے رنگین دھنک سے رنگ ذریت کو دلچسپ لگ رہے تھے۔ سو وہ مزید چوڑا ہو کر کھڑا ہو گیا۔ماہ نور نے اُمڈتی مسکراہٹ روکی۔۔۔

آپ ہٹ رہے ہیں یا۔۔۔

یا؟انداز چڑانے والا تھا۔

کچھ نہیں۔۔۔ ذریت ہٹیں۔ جائیں جا کر تیار ہوں۔ وہ جانتی تھی۔ وہ اسے تنگ کر رہا تھا۔اس لئے بیچارگی سے کہا۔ تو اس نے ہاتھ بڑھا کر اس کے جھمکے میں اٹکے بالوں کو نکالنا شروع کر دیا۔

For more visit (exponovels.com)

ماہ نور تمہیں پتہ ہے۔ مجھے لگتا تھا۔ کہ تمہارے بال بہت لمبے اور سیاہ ہوں گے۔ جب میں نے تمہیں پہلی بار سڑک پہ دیکھا تھا۔ تو میں نے یہی سوچا تھا۔ کہ اس لڑکی کے بال پتہ نہیں کس رنگ کے ہوں گے۔ پھر دوسری بار جب میں نے تمہیں یونیورسٹی کے ایک سیمینار میں دیکھا۔ تو میرا خیال تھا۔ کہ تمہارے بال لمبے اور بہت کالے ہوں گے۔ اور۔۔۔

اور ؟ ماہ نور کو اسے سُننا اچھا لگ رہا تھا۔

اور تم اس کے بالکل مختلف تھی۔ مجھے یقین مانو شدید افسوس ہوا تھا۔ اس کے چہرے پہ حقیقتاً افسوس اور دکھ کے تاثرات دیکھ کر ماہ نور ہنستی چلی گئی۔

اوہ۔۔۔ پھر تو آپ کے ساتھ بہت بُری ہوئی۔ لمبے بال تو میں نے کبھی زندگی میں نہیں رکھے۔ اس کے چہرے پہ مسکراہٹ تھی۔

چلو اب کیا کیا جا سکتا ہے۔ جب کھا لیا دھوکا تو۔ اسے دلچسپی سے دیکھتے ذریت کی شوخی عروج پہ تھی۔ ماہ نور نے گھور کے دیکھا۔ اور پھر اس کے دائیں کندھے پہ ایک دھپ لگاتی سائڈ سے نکل گئی۔ ذریت حسن مسکرا دیا۔

دس منٹ میں باہر آ جائیں۔ کہتی وہ ایک نظر اسے دیکھتی باہر نکل گئی۔

جو حکم مادام۔۔۔ مسکراتے ذرا سا جھکتے اس نے حکم بجالانے والے انداز میں کہا۔ مگر وہ جا چکی تھی۔ ذریت مسکراتا سر جھٹکتا باتھ روم کی جانب بڑھ گیا۔ جہاں ماہ نور نے اس کے کپڑے لٹکا دئے تھے۔

کھانے کا وقت تھا۔ جب اسفند بھاگتا دوڑتا اس کے نکاح پہ پہنچا تھا۔ نائلہ بھی ساتھ تھی۔

نائلہ نے فیروزی اور جامن رنگ ساڑھی پہن رکھی تھی۔ اور ساتھ ہی ہم رنگ خوبصورت امتزاج کھاتے چھوٹے چھوٹے ٹوپس اور ایک ہار تھا۔ جو آج ہی اسفند نے اسے تحفے میں دیا تھا۔

For more visit (exponovels.com)

حال میں ذریت اکمل سے کوئی بات کرتے اطراف میں دیکھ رہا تھا۔جب اس کی نظران دونوں پہ پڑی تھی اور پھر پلٹنا بھول گئی۔

یہ۔۔۔ یہاں کیا کر رہا ہے؟ ذریت کا چہرہ اسفند کی طرف تھا۔ جبکہ اکمل کی ان کی جانب پشت تھی۔اکمل فوراً موڑا۔

اسفند اور نائلہ ماہ نور اور ابرار کے ساتھ بات کر رہے تھے۔ماہ نور نے مسکراتے ایک نظر ہال میں لوگوں پہ ڈالی اور پھر کچھ فاصلے پی کھڑے ذریت کو دیکھ کر مسکراتے اس نے اس کی جانب اشارہ کیا تھا۔وہ شائد اس سے ذریت کا پوچھ رہے تھے۔ان دونوں نے چونک کر اس کی جانب دیکھا اور ذریت جو کچھ حیران حیران سا ان اسفند کو دیکھ رہا تھا۔بدوقت مسکرایا۔

تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں۔کہ ابرار اسفند کو جانتا ہے؟ دانت کچکچا کر بظاہر مسکراتے اس نے اکمل کو گھور کر دیکھا تھا۔اکمل نے مسکرا کر پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈال لیا۔

مجھے تو خود معلوم نہیں تھا۔ویسے یہ والا سرپرائز اچھا ہے۔اس کی مسکراہٹ میں گہری چوٹ تھی۔۔۔ جیسے کہہ رہا ہو۔کہ ہمیشہ ویسا نہیں ہو سکتا جیسا ہم سوچتے ہیں۔ذریت نے اسے گھورا۔اور پھر ان لوگوں کی جانب بڑھا۔جہاں کھڑی ماہ نور مسلسل بولتی اسے وقفے وقفے سے دیکھ بھی رہی تھی۔

بیگم صاحبہ تھوڑی سپیڈ ہلکی رکھیں۔جوش میں بولتے اس کا چہرہ خوشی سے سرخ ہو تا وہ دیکھ سکتا تھا۔اس کے برابر جاتے اور اس کے کندھے کے گرد اپنا بازو پھیلاتے اس نے مسکرا کر کہا۔تو نائلہ اور اسفند مسکرا دئے۔

اسفند نے ذریت کو نہیں پہچانا تھا۔

السلامُ علیکم۔۔۔ان دونوں کو سلام کرتے۔اس نے اسفند کی جانب ہاتھ بڑھایا۔تو اسفند نے بہت پرجوش انداز میں تھام لیا۔ذریت پرسکون تھا۔وہ نہیں جانتا تھا۔کہ ذریت حسن اس پہ نتاشا سے پیچھا چھڑوا کر کتنا بڑا احسان کر چکا تھا۔اور نہ ہی وہ ایسی کوئی خواہش رکھتا تھا۔ہاں وہ ماہ نور کو اس کے بارے میں ضرور بتائے گا۔یہ اس نے ابھی ابھی سوچ لیا تھا۔

آپ مصروف ہیں؟

For more visit (exponovels.com)

رات کا پہلا پہر شروع ہونے والا تھا۔ جب اس نے ماتھے پہ لگے ٹیکے کو اُتارتے پاس پڑے فون کو بجتے سن کر اُٹھایا تھا۔ یہ وہی فون تھا۔ جو ابرار کے پاس تھا۔ اس نے کچھ دیر پہلے ماہ نور کے ہاتھ اس کے ہاں پہنچایا تھا۔

فرح نے مسکرا کر سر اثبات میں ہلایا۔ جیسے وہ دیکھ رہا ہو۔

گُڈ۔۔۔ کام کرنا اچھی بات ہے۔ اس اس کا سر ہلانا جیسے وہ محسوس کر چکا تھا۔ فرح کے گال چمکے۔۔۔

آپ۔۔۔ کو۔۔۔ کوئی بات کرنی تھی۔ اٹک اٹک کر اس نے پوچھا۔ تو ابرار جو کمرے کی قد آدم کھڑکی کے سامنے کھڑا۔۔۔ سوات کے اونچے اونچے دھند میں لپٹے پہاڑوں کو دیکھ رہا تھا۔ ہنس دیا۔

آپ اتنا گھبرا کیوں رہی ہیں۔۔۔

نہ۔۔۔ نہیں میں گھبرا کیوں رہی ہوں۔۔۔ منہ میں چلتی زبان اور دماغ دونوں اس وقت دل کے غلام تھے جو اس وقت ایک سو بیس کی سپیڈ پکڑے کوئے تھا۔

اچھا۔ تو آپ نہیں گھبرا رہیں ؟ اسے جیسے مزہ آیا۔

نہیں۔۔۔ آنکھیں بند کر کے کھولیں۔ جیسے چاہتی ہو۔ کہ راز اُگلا نہ جائے۔ جیسے اپنا آپ پاگل لگا رہا ہو۔ جیسے خوشی کی انتہا ہو۔۔۔۔

ہم۔۔۔ آپ تو پھر بہت بہادر ہیں۔ ابرار کی انکھوں میں شرارت کی چمک جبکہ لہجے میں مسکراہٹ کی آمیزیش تھی۔

چلیں باہر ملتے ہیں۔ مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔ اور آپ کو دیکھنا ہے۔

جی ؟ فرح کی دونوں آنکھیں ایک دم سے پوری وا ہوئیں۔ ابرار نے مسکراہٹ دبا کر ایک نظر پہاڑوں پہ اُڑتی۔۔۔ ناچتی گاتی دھند کو ایک آخر نظر دیکھا۔ اور واڈروعب کی جانب بڑھا۔ جبکہ وہ کہہ رہی تھی۔

نہیں۔۔۔ میرا مطلب ہے۔ کہ کیسے۔۔۔۔ میں

آپ سے مل سکتی ہوں۔ بابا اجازت نہیں دیں گے۔۔۔ اس کو دونوں ہاتھوں میں شدید کپکپاہٹ تھی۔

For more visit (exponovels.com)

اچھا تو یہ مسلہ ہے۔۔۔

یار آپ پہلے کا مپنا تو بند کرو۔ماہرِ نفسیات اس وقت اس کے ہر ہر انداز کو بغیر دیکھے پڑھ رہا تھا۔اور خوب محظوظ ہو رہا تھا۔فرح کو دل چاہا رو دے۔وہ اسے کتنے اچھے انداز میں۔اس کی ایک ایک خاموشی اور ہر ہر لہجے کو بن دیکھے زبان دے رہا تھا۔اور فرح بحوش ہونے کو تھی۔

وہ اپنے ہونٹ کاٹنے لگی۔

اچھا۔۔۔پھر میں ماہ نور کو بھیج رہا ہوں۔وہ آپ کو میرے پاس لے آئے گی۔اس کی خاموشی بتا رہی تھی۔کہ وہ رونے کو ہے۔

پر۔۔۔وہ۔۔

اب کیا بابا اس پہ بھی ناراض ہوں گے ؟

نہ۔۔۔نہیں۔پر جھوٹ۔۔۔بول کر ملنا اچھی بات تو نہیں ہے۔معصومیت کی انتہا پہ تھی وہ۔ابرار کی مسکراہٹ مزید گہری ہوئی۔اس لڑکی کا ہر ہر انداز اسے اس کا گرویدہ بنا دیتا تھا۔

پھر میں ان سے بات کر لے خود آ جاتا ہوں۔۔۔

اللہ توبہ۔۔۔ابھی میں نے آپ کو کیا کہا ہے۔۔۔بابا کیا سمجھیں گے۔

ابرار اس کے لہجے کو سن کے بے اختیار ہنس دیا۔فرح نے سر جھکا لیا۔

اچھا۔تو پھر میں انکار سمجھ لیتا ہوں۔آپ خود ہی مجھ سے ملنا نہیں چاہتیں۔لہجے میں مصنوعی بے چارگی لئے۔اس نے لئے کہا۔تو فرح ہونٹ کاٹتی شیشے کے سامنے سے ہٹتی بیڈ پہ آ بیٹھی۔اور سر سے دوپٹہ اُتارنے لگی۔فون کندھے اور کان کے درمیان رکھا تھا۔

نہیں۔۔۔ایسی بات نہیں ہے۔پر میرے والدین مناسب نہیں سمجھتے۔آپ کو جو بات کرنی ہے۔کریں میں سن رہی ہوں۔اب کی بار گھبراہٹ میں کمی آئی۔ابرار سر ہلاتا۔فون کان سے ہی لگائے دروازے کی جانب بڑھا۔وہ اس پہاڑ کی جانب اب اکیلا جا رہا تھا۔

آپ نے اس دن مجھے بتایا نہیں تھا۔کہ آیا کہ آپ اس نکاح سے خوش ہیں یا نہیں۔میں اب کی بار آپ سے دوبارہ پوچھنا چاہتا ہوں۔پلیز آپ مجھے بغیر کسی ڈر اور خوف کے کسی جھجک یا گھبراہٹ کے بتائیں۔

فرح جو کسی اور بات کی توقع میں تھی۔اس کے اگلے الفاظ سن کر مسکرا دی۔

وہ بندا خود غرض نہیں تھا۔اپنی خوشی کو قربان کرنا اسے آتا تھا۔

آپ کو کیا لگتا ہے۔؟مسکراتے ہوئے اس نے سر سے اُتار دوپٹہ سامنے سنگل صوفے پہ طریقے سے رکھتے پوچھا تھا۔

مجھے تو لگتا ہے۔کہ آپ خوشی سے ساری رات بھنگڑا ڈالتی رہی ہیں۔پر پھر بھی میں نے سوچ کنفرم کر لوں۔سوات کی ریت، پہاڑ کی بجری اور مٹی اس کے قدموں کے نیچے تھی۔اور وہ گاؤں کی آوارہ سڑک پہ تنہا چلتا۔دلچسپی سے کہہ رہا تھا۔

یہ مجھے آپ کے لئے کہنا تھا۔اس کی بات سن کر ہنستے اس نے کہا۔تو ابرار نے ایک ابرو اُٹھایا۔

وہ کیوں۔۔۔؟

وہ اس لئے۔کہ آپ کا راز اب راز نہیں رہا۔آپ کے دل کی بات ہم جانتے ہیں۔اور پہلے سے جانتے ھیں۔ہنستے ہوئے سرخ پڑتے اس نے بات مکمل کر کے دوسری جانب حیران پریشان سے سڑک کے بیچ و بیچ کھڑے ابرار کو کہا۔اور اس کی بات سننے سے پہلے فون کاٹ دیا۔ابرار نے دانت پیس کر بند فون کو دیکھا۔اور تیزی سے واپس نمبر دبایا۔مگر اب کی بار فون بند جا رہا تھا۔

وہ فون بند کر کی ہنستی لباس بدلنے جا چکی تھی۔ابرار نے افسوس اور کچھ خوشی سے آسمان کی جانب دیکھا۔

شکر یہ اللہ۔۔۔ مسکراتے مالک کا شکر ادا کرتے اس نے ہاتھ میں پکڑے فون کو جیکٹ کی جیب میں ڈالا۔اور سفر پھر سے شروع کیا۔اب کی بار وقفے وقفے سے گونجتے قہقہے اس کی خوشی کا پتہ دے رہے تھے۔اور سوات کی اس گاءوں کی ویران گلی میں اس کی خوشی پاءوں میں گھونگرو پہنے محوِ رقص تھی۔

ماہ نور ابھی بھاری بھر کم لباس بدل کر کمرے سے نکل کر دادی جان کی طرف جا رہی تھی۔جب سامنے سے آتے ذریت نے رستہ روکا۔اور اس کی کلائی پکڑی۔ماہ نور نے گھبرا کے ارد گرد دیکھا۔

ذریت یہ کیا طریقہ ہے۔اس کے ہاتھ سے بازو نکالتے اس نے دانتے پیس کر کہا۔پر وہ ڈھیٹ بنا کھڑا رہا۔

باہر چلیں۔۔۔

ہیں ؟اسے اس کی دماغی حالت پہ شک گزرا۔

اس وقت ؟اس کی روشن آنکھوں میں اپنا عکس دیکھتے وہ بھی مسکرا دی۔

ہاں کیوں ابھی کیا ہے۔ صبح ہم واپس چلے جائیں گے۔پھر یہ وقت کبھی واپس نہیں آئے گا۔مدھم سا مسکراتے اس نے کہا۔اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی۔اس کے کندھے پہ جھولتی اونی چادر کو پیچھے سے اس کے سر پہ ڈالتے ایک نظر اس کے مسکراتے چہرے کو دیکھتے وہ اسے لئے باہر کی جانب بڑھا۔ماہ نور اس کے برابر چلنے لگی۔

حویلی سے نکل کر ان کو کارخ بائیں جانب تھا۔جہاں پہ چھت سے دیکھو تو ایک گول سا گنبد نظر آتا۔سب سے گنبد کے قریب بڑا سا شیشم کا درخت تھا۔جہاں بیٹھا بوڑھا سواتی مدھم آواز میں کوئی دھن بجا تا رات کی تاریکی میں پشت پہ اور دائیں جانب آتے سنسان پہاڑی سلسلوں میں ایک عجیب محبوبکن سی ردھم منوار ہا تھا۔ذریت نے وہ آواز لان میں اکمل سے گفتگو کے دوران سُنی تھی۔اور اب وہ اور ماہ نور اسی جانب جا رہے تھے۔

ذریت ایک بات پوچھوں۔ذریت نے اس کے کندھے کے گرد اپنا بازو پھیلا رکھا تھا۔وہ دونوں چلتے خاموش تھے۔جب ماہ نور نے پوچھا۔

ہم۔۔۔اس نے ایک نظر ماہ نور کے نیم اندھیرے میں چمکتے چہرے کو دیکھ کر اجازت دی۔

ذریت نتاشا اب کہاں ہے؟اس کے چہرے پہ ایک نظر ڈال کر سامنے کی جانب دیکھتے اس نے پوچھا تھا۔ماہ نور وہ ہماری زندگی سے نکل چکی ہے۔وہ اب کہیں نہیں ہے۔اس کا ذکر مت کرو۔کہ وہ واپس لوٹ آئے۔رک کر اس کے دونوں ہاتھ پکڑتے اس نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔تو ماہ نور مسکرا دی۔مجھے پتہ ہے۔وہ آپ کو مجھ سے نہیں چھین سکتی۔پر وہ ہے کہاں۔؟

بازمت آنا تم۔۔۔ایک نظر گھور کر پھر سے چلتے اس نے کہا۔تو ماہ نور ہنس کر سر نفی میں ہلا گئی۔

وہ اس وقت جیل میں ہے۔ضیاء کے ساتھ منشیات فروشی میں وہ بھی شامل تھی۔اسے سات سال کی سزا اور تین کروڑ جرمانہ ہوا ہے۔

اور ضیاء؟

وہ ملک سے بھاگ گیا۔ایف آئی اے اس کی تلاش میں ہے۔اور اس کا باقی کا گروہ پکڑا جا رہا ہے۔

بس اب اور سوال نہیں۔اب یہ لوگ ہماری زندگی میں کہیں نہیں ہیں۔سوچپ کر کے۔۔۔چلتی رہو۔۔۔

اور ہاں اسفند نتاشا کا منگیتر رہ چکا ہے۔سو اس کے سامنے احتیاط کرنا۔اس کا کھولتا منہ دیکھ کر فوراً اس کے منہ پہ ہاتھ رکھا۔ماہ نور نے گھورا

اور ہاں۔۔۔چلتے چلتے وہ ایک بار پھر سے رکا۔ماہ نور نے ابرو اُٹھایا۔

کل تم میرے ساتھ گھر جا رہی ہو۔ ظفر نے بدمزہ کھانا کھلا کھلا کر منہ کا ضائقہ خراب کر دیا ہے۔اور دادی جان کے ڈانٹ سن سن کر میں سخت پریشان ہو چکا ہوں۔

ماہ نور اسے سنجیدگی سے دیکھے گئ۔ذریت کو محسوس ہوا جیسے وہ جانا نہ چاہتی ہو۔اس نے اس کے منہ سے ہاتھ ہٹا دیا

ماہ نور مجھے تمہاری ضرورت ہے۔پلیز گھر چلو۔اس کے دونوں ہاتھوں کو نرمی سے دباتے وہ کہہ رہا تھا۔

پہلے مجھے گھٹنوں پہ جھک کر آئی مس یو بولیں۔۔۔

ہیں؟اس کی اگلی بات سن کر ذریت دل بھر کا بدمزہ ہوا۔

یہ کام نہں میرے سے ہوتا۔ناک سے مکھی اُڑائی۔ماہ نور کا منہ بنا۔

یہ کیا بات ہوئی۔

دیکھو۔میرے لئے اپنے جزبات کو اظہار کرنا بہت مشکل ہے۔پلیز ایسے ہی مان جاءو۔

ماہ نور نے جواب میں سر نفی میں ہلایا۔تو وہ چند لمحوں تک اسے دیکھت رہا۔

اگر تم ایسے خوش ہوتی ہو تو۔یہ لو۔۔۔۔وہ اپنے گھوٹنوں پہ جھکا۔

ماہ نور پلیز گھر واپس آجاءو۔ذریت حسن اور اس گھر کے در و دیوار سب تمہیں یاد کر رہے ہیں۔تمہارے بغیر زندگی بہت ویران ہے۔۔۔ہاتھ اس کی جانب پھیلاتے اس نے زندگی میں پہلی بار لہجے کو بہت نرم بناتے کہا۔تو ماہ نور کا دل کیا قربان ہی ہو جائے۔وہ ہنستی چلی گئ۔ذریت اُٹھ کھڑا ہوا۔اور ساتھ ہی اس کے گرد بازو پھیلاتا پھر سے چلنے لگا۔اور ماہ نور متواتر ہنستی آنکھوں میں آئی نمی کو چھپا رہی تھی۔اور ماحول اور آسمان اور ارد گرد کے پہاڑ سب مسکرا رہے تھے۔

ختم شد

For more visit (exponovels.com)